مُستنصر حسین تارڑ
دیوسائی
دُنیا کے بلندترین میدان دیوسائی کے پار

ترتیب

"پھولوں سے بھرا ہوا مقام"

میں دیوسائی کا بھورا ہمالیائی ریچھ ہوں اور میرا نام بگ بوائے ہے..

میں دیوسائی کا ایک پھول ہوں اور جیسے میرے رنگ ان دیکھے ہیں ایسے میرے نام ان گنت ہیں...

میں دیوسائی کا وہ بادل ہوں جس کی شباہتیں طلسم ہیں... جھکتی ہیں تو اس میدان پر بچھ جاتی ہیں..

اور میں خود دیوسائی ہوں، دنیا کا بلند ترین اور وسیع ترین خواب.. جس کے اوپر پہنچنے والوں کا سانس بلندی روکتی ہے..

کیا ایک ریچھ کے لیے.. ایک پھول کے لیے.. ایک بادل کے لیے گھر سے نکل کر در بدر ہونا جائز ہے؟

میں جو دیوسائی کا دیومالائی ریچھ ہوں "دیوسائی کا دیو" کہلاتا ہوں.. ہمالیائی براؤن بیئر کہلاتا ہوں.. مجھے ہمالیہ کا بادشاہ بھی کہا جاتا ہے.. میں دنیا کا سب سے بڑا گوشت خور جانور ہوں.. مچھلیاں کھاتا ہوں، مارموٹ نوش کرتا ہوں، ناشتے پر گھاس بھی کھالیتا ہوں.. میں جو بگ بوائے ہوں، دیوسائی کے تیز ترین دھارے بڑے پانی کے پار رہتا ہوں اور کسی کو اپنی سلطنت کے اندر آنے کی اجازت نہیں دیتا.. میری بینائی

کمزور ہے لیکن میں سونگھ سکتا ہوں.. شہد کی مہک، مچھلی کی موجودگی، مارموٹ کی بُو یا
کسی تارڑ کی آمد کو.. میں سونگھ سکتا ہوں۔ میں صرف چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر، درختوں
اور جھاڑیوں سے عاری گھاس بھرے میدانوں میں ہی زندہ رہ سکتا ہوں.. موسم گرما میں
میں گھاس میں کھیلتا ہوں اور لوٹنیاں لگاتا ہوں اور موسم سرما کا آغاز ہوتا ہے تو میں
دیوسائی سے ذرا نیچے جاکر غاروں میں سو جاتا ہوں.. اور تقریباً چھ ماہ سویا رہتا ہوں..
کچھ نہیں کھاتا اور میری کھال کے اندر چربی کی جو دبیز تہہ ہوتی ہے، وہ آہستہ آہستہ
پگھلتی رہتی ہے اور مجھے زندہ رکھتی ہے.. یہ میری سرمائی نیند ہوتی ہے جس میں میں گم رہتا
ہوں.. تب موسم بہار کا آغاز ہوتا ہے تو میں جاگتا ہوں..غاروں سے باہر آتا
ہوں.. سرمائی نیند کی وجہ سے میں بہت لاغر ہو جاتا ہوں اور آسانی سے شکار ہو جاتا
ہوں.. غاروں سے باہر آتا ہوں تو میری طرح دیوسائی کا میدان بھی جاگ رہا ہوتا ہے
اور میں اس کی ہریاول، پھولوں، مچھلیوں، ندیوں اور مارموٹ کے اندر چلا جاتا
ہوں.. وہ بھی میرے منتظر ہوتے ہیں..

میں دیوسائی کا وہ پھول ہوں جس کی اقسام، رنگ اور شکلیں ابھی دریافت
نہیں ہوئیں.. میں سربلند وجود کے تکبر میں سر نہیں اٹھاتا کہ دنیا مجھے دیکھے بلکہ میں تو
دیوسائی کے ٹیلوں اور ہریاول کی وسعتوں میں نظروں کے سامنے بچھتا چلا جاتا ہوں اور
صرف وہ مجھے دیکھ سکتے ہیں جو جھک کر نیچے دیکھتے ہیں.. اپنے بوٹوں سے مجھے مسلتے نہیں،
پامال نہیں کرتے، روندتے نہیں، جھک کر مجھے دیکھتے ہیں اور شائد دنیا بھر میں جتنے
لوگ جھکے ہوئے ہیں.. کبڑے ہو چکے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ مجھے دیکھنے کے لیے
ایک بار جھکے اور پھر ہمیشہ کے لیے جھکے رہے اور ان کی نظروں میں میرے رنگ اور
دل نشین شباہتیں ہمیشگی کی تصویر ہو گئے.. میں وہ پھول ہوں جو کسی کتاب میں نہیں، کسی
شعر، کسی داستان میں نہیں، کسی تصویر میں نہیں... کیونکہ کتاب، شعر، داستان،

تصویر... ایک سنی سنائی بات ہے.. ایک افواہ ہے.. اور مجھے تو صرف وہ بیان کر سکتا ہے،
تصویر کر سکتا ہے جو دیوسائی تک پہنچتا ہے اور مجھے دیکھنے کے لیے جھکتا ہے.. میرا رنگ اور
طلسم کوئی بیان نہیں کر سکتا، اسی لیے دنیا میرے وجود سے آگاہ نہیں.. اور میں کسی نظر
کے لیے نہیں کھِلتا. صرف اپنے آپ کے لیے.. اپنے اوپر جھکے بادل کے لیے..
بگ بوائے کے لیے.. یا کبھی کبھی کسی کوہ نورد کے لیے.. کسی تارڑ کے لیے کِھلتا ہوں..

میں دیوسائی کا وہ بادل ہوں جس کا دنیا کے کسی خطے کے کسی اور بادل سے
کوئی رشتہ نہیں.. نہ اس کی شکل سے، نہ بناوٹ سے، نہ اس کے رنگ سے.. کوئی واسطہ
نہیں.. میں جدا ہوں.. یکتا ہوں.. اور جس نے کبھی مجھ پر نگاہ کی، اسے یقین ہوا کہ مجھ
میں وہ پوشیدہ ہے جس نے کُن فیکون کہا.. میں شائد بادل نہیں، کچھ اور ہوں.. میں
دیوسائی کو ڈھانپنے والا طلسمی لبادہ ہوں.. میں عام لوگوں کے لیے ایک واہمہ ہوں..
ایک انہونی شکل ہوں.. ایسی شکل، جب ایک مصور سے اس کا واٹر کلر باغی ہو جائے،
اس کے بس میں نہ رہے تو وہ کاغذ پر پھیلتی ہے اور وہ اس پر اپنا برش پھیر کر اسے مٹا دیتا
ہے کہ نہیں بادل ایسے تو نہیں ہو سکتے۔ یہ تو ایک فریب ہے۔ ایک غیر حقیقی عکس
ہے.. اور وہ مصور نہیں جانتا کہ یہ فریب زدہ طلسم ایک ایسی حقیقت ہے جو صرف
دیوسائی پر جھکی ہوئی ہے.. کیونکہ دنیا میں کہیں بھی اتنا بلند میدان نہیں جس پر بادل
جھکے ہوں اور وہ بادل ہوا کے دباؤ اور آکسیجن کی باریک تہہ کی وجہ سے جب ظہور پذیر
ہوتے ہیں تو ان کے چہروں پر فریب کا گمان ہوتا ہے.. وہ ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے
ابھی ان کے اندر سے دیوتاؤں کے رتھ اتریں گے.. آسمانی فرمان اتریں گے.. اسی
لیے دنیا کے کسی اور بادل سے میرا کوئی رشتہ نہیں..

اور میں وہ ہوں.. جس میں ایک ریچھ، ایک پھول اور ایک بادل ہے..

میں دیوسائی ہوں..

میں دنیا کا بلند ترین میدان ہوں..

کم از کم تیرہ ہزار اور زیادہ سے زیادہ ساڑھے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر.. ایک جانب سکردو سے میرے لیے راستے اٹھتے ہیں اور دوسری جانب استور کو اترتے ہیں.. تیسری جانب گلتری کی وادی کو جاتے ہیں.. اور میرے چاروں طرف چوٹیاں ہیں، اٹھارہ ہزار فٹ تک پہنچنے والی.. بُرجی لاء ایسا درّہ ہے.. اور میں ان میں گھرا ہوا ہوں.. میں چھتیس کلو میٹر طویل ہوں اور چوڑائی میں چوبیس کلو میٹر سے تجاوز کرتا ہوں... میرے نشیب و فراز میں گھاس کے میدان ہیں. ٹیلے اور ندیاں ہیں.. پھول ہیں اور رنگ رنگ کے بوٹے اور جھیلیں ہیں... میری گھاس خوشبودار ہے.. اور میری جڑی بوٹیاں اپنے اندر شفا کے معجزے رکھتی ہیں... مجھے بلتی زبان میں "بھیرسا" کہتے ہیں یعنی "پھولوں سے بھرا ہوا مقام".. مجھ میں صرف بھورے ہمالیائی ریچھ ہی نہیں رہتے بلکہ میں گھر ہوں سنہری مارموٹ کا.. تبتی نسل کے بھیڑیئے کا.. تبتی سرخ لومڑیاں بھی مجھ میں گھومتی ہیں، دُم کے بغیر خرگوش بھی میرے باسی ہیں.. ہمالیہ کے آئی بیکس بھی دکھائی دیتے ہیں.. برفانی چیتے بھی ادھر آنکلتے ہیں.. ٹراؤٹ مچھلی بھی ندیوں میں تیرتی ہے اور سنہری عقاب بھی مجھ میں بسیرا کرتا ہے..

یہ سب عجائبات اپنی جگہ.. لیکن.. پھر بھی.. کیا ایک ریچھ، ایک پھول، ایک بادل یا شاید ایک سرخ بھیڑیئے اور ایک سنہری عقاب کے لیے گھر چھوڑنا جائز ٹھہرتا ہے؟..

"مے خانۂ شمال کے رِند سکردو روڈ پر"

سکردو روڈ پر.. دریائے سندھ بہت نیچے گھُپ اندھیرے کے سیاہ لباس میں گُم.. سکردو روڈ پر.. رات میں.. وسوسوں بھرے اندھیروں میں.. ہم تھے.. ہم نابینا طائر تھے.. جو اپنی ویگن کے پنجرے میں بند تھے اور نہیں جانتے تھے کہ کبھی ہم پَر کھول سکیں گے یا نہیں.. ہمیں قید کر کے کہاں لے جایا جا رہا ہے.. ہم نہ دیکھ سکتے تھے کہ رات کی تاریکی ہمیں اندھا کرتی تھی.. گہرائی میں سے ایک ہلکا شور اوپر آتا تھا، یہ بتانے کے لیے کہ بہت نیچے سندھ سائیں بہتا ہے..

ہم سکردو کو سفر کرتے تھے.. اور رات کی تاریکی میں کرتے تھے..

صرف رات نہ تھی جو اپنے سیاہ جال سے ہمیں شکار کرتی تھی بلکہ بارش بھی تھی..

سکردو روڈ.. سیاہ رات اور بارش..

بارش ایک بے رحم بنیاد پرست عقیدے کی طرح ہم پر برستی تھی اور ہمارا نکتۂ نظر سننے کو تیار نہ تھی.. کہ ہم اس بارش.. پہاڑوں سے مقابلہ کرنے کے لیے نہیں

آئے، صرف ایک ریچھ کو دیکھنے، ایک پھول پر جھکنے اور ایک بادل کے طلسم کا نظارہ کرنے کے لیے آئے ہیں.. بارش مسلسل گرتی تھی..

اور وہ آس پاس کی بلند قراقرمی چٹانوں... اور قراقرم کاتر کی زبان میں مفہوم ہی یہی ہے کہ بھُربھُری سیاہ چٹانیں... اور وہ بارش ان چٹانوں میں سرایت کر کے انہیں یوں کھسکاتی، اپنی جگہ سے سرکاتی، غیر متوازن کرتی مسمار کرتی تھی کہ وہ سیمسن کے معبد کی طرح نیچے گرتی چلی جاتی تھیں... صرف اس احتیاط کے ساتھ کہ سکردو روڈ پر سیاہ رات میں سفر کرتی ہماری ویگن گزر جائے... اس کے پنجرے میں بند کوہ نورد بیوقوف نابینا طائر عافیت سے گزر جائیں تب وہ اپنے ہزاروں ٹن وزنی وجود ملبے کے ساتھ نیچے آئیں اور سکردو روڈ کو ملیامیٹ کر کے نیچے دریائے سندھ کے بہاؤ میں گر کر اس کے بہاؤ کو چند لمحوں کے لیے روکیں اور پھر اس کے زور کے آگے ہتھیار ڈال کر اس کے وجود کا ایک حصہ بن کر اپنے وجود کھو دیں اور بہہ جائیں..

اگرچہ ہم اس لمحے ان کی اس احتیاط.. اس مہربانی سے بے خبر تھے.. ان چٹانوں کے ہمارے عقب میں گر کر سکردو روڈ کو ایک ہفتے کے لیے بلاک کر دینے کے بارے میں بے خبر تھے.. اور بے خبری ایک نعمت ہوتی ہے..

اسی بے خبری کی نعمت میں ہم اس موت چکر اور روڈ پر چکّر کھاتے چلے جاتے تھے..

سوال یہ تھا کہ یہ طائر کیوں نابینا ہوئے تھے..

ایسے، جیسے انڈس ڈولفن اندھی ہوتی ہے.. جیسے بلوچستان کی کاریزوں میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں برسوں سے زیر زمین پانیوں میں رہنے والی سفید مچھلی اندھی ہوتی ہے کہ اسے دیکھنے کی حاجت نہیں ہوتی، اس لیے قدرت نے اس کی آنکھیں معدوم کر دیں.. انہیں دیکھنے کی ضرورت نہ تھی.. لیکن ہمیں تو تھی.. تو ہم کیوں نابینا ہو چکے تھے؟

صرف ایک ریچھ کے لیے.. ایک پھول.. ایک بادل کے لیے..

دنیا بھر میں کوئی ایسے طائر بھی ہوں گے جو ایسے غیر منافع بخش کاروبار کے لیے نابینا ہو جائیں.. یقیناً نہیں ہوں گے.. صرف اس لیے کہ.. وہ نہیں جانتے کہ دیوسائی میں ایک ریچھ ہے.. ایک پھول ہے.. ایک بادل ہے..

ان طائروں میں سے ایک... عمر رسیدہ اور حواس باختہ جو طائر تھا، وہ میں تھا.. اور میں وہ رِند تھا.. جو توبہ کر چکا تھا..

اور رِند کی توبہ ہمیشہ مخدوش رہی ہے.. وہ رِند کے رِند رہتے ہیں اور ہاتھ سے جنت نہیں جانے دیتے.. شب کو پیتے ہیں اور صبح کو توبہ کر لیتے ہیں..

لیکن میں نے تو کسی دل کو خوش رکھنے والی آسمانی جنت کے حصول کے لیے توبہ نہیں کی تھی.. بلکہ پاکستانی شمال جو.. فردوس بر روئے زمیں است.. سے توبہ کی تھی..

کیسے اور کب توبہ کی تھی؟

سنولیک کی دیومالائی جھیل تک پہنچ کر.. دنیا کے طویل ترین برفانی راستے بیافو ہسپر کو عبور کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ... اب ختم ہوئی بارشِ سنگ..

میں اگرچہ کبھی بھی مکمل طور پر اپنے حواس میں نہیں رہا لیکن اب بہ قائمی ہوش وحواس فیصلہ کرتا ہوں کہ اپنی عمر کی وجہ سے.. اپنی بیوی اور بچوں کی وجہ سے.. میں مستنصر حسین تارڑ آئندہ کبھی اتنے اوکھے سفر پر نہیں نکلوں گا.. بھائی موت کو کتنی بار جُل دیا جا سکتا ہے.. اجل کو کہاں تک فریب دیا جا سکتا ہے.. عمر کو کہاں تک منّت سماجت کر کے روکا جا سکتا ہے.. چنانچہ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کر لیا اور میں اس وعدے پر قائم رہا کہ میں نے کہا تھا کہ.. پرامس؟ اور پھر خود ہی انگلی اٹھا کر کہا تھا۔ "بالکل پرامس"..

چنانچہ میں وہ رِند تھا جو توبہ کر چکا تھا.. اور مستحکم تھا اپنی توبہ پر.. لیکن.. میرا بدن ٹوٹتا تھا.. نشے کی خواہش مجھے بدحال اور بے حال کرتی تھی..

صرف اس لیے کہ لاہور کے دن گرم ہو رہے تھے..

اس کی شکر دوپہروں میں تارکول کی سڑکیں پگھلنے لگی تھیں..

اور ان شکر دوپہروں میں خیال آتا تھا کہ مے خانۂ شمال کی نازک اندام برفیں ان دنوں تنور میں رکھے مکھن کی طرح پگھل رہی ہوں گی.. چشمے ابلنے لگے ہوں گے.. ندیاں رواں ہو رہی ہوں گی اور رُکی ہوئی آبشاریں گرنے لگی ہوں گی..

ورگوتھ کے جنگل میں سرما کی شدت میں ٹھٹھرتے پرندے اب پَر کھولتے ہوں گے اور اپنی لمبی دُموں سے برف جھاڑ کر اڑان کے لیے پر تولتے ہوں گے..

ٹرنگو ٹاورز کے دامن کی گھاس.. سونج کی آبشار اور تتلیوں کی ڈھول..

وادی رُوپل کے سورنگ.. مانگوگسار کے شکاری جھونپڑے... بیانتھا کے چائے کے باغ اور ریچھ.. جھیل کرومبر پگھل رہی ہو گی اور اس پر خوش گاؤ کے قافلے چلنے سے جھجکتے ہوں گے.. پامیر کی گھاس بلند ہوتی ہو گی..

لاہور کی شکر دوپہروں میں بس یہی ٹھنڈک کی تصویریں ذہن کے کینوس پر خود بخود پینٹ ہوتی جاتی تھیں..

یہ درست اور کس کافر کو انکار ہے کہ ختم ہوئی بارشِ سنگ.. میں نے فیصلہ کر رکھا تھا، وعدہ کر لیا تھا انگلی اٹھا کر.. لیکن اس کے باوجود بدن تو ٹوٹتا تھا.. اس شرابِ شمال کے لیے جس کا میں عادی ہو چکا تھا... یہ ایک.. ٹرمینل بیماری تھی.. ایک ایسی بیماری جو صرف موت پر ہی ختم ہوتی ہے.. اس کی انتہا تک پہنچتی ہے اور راستے میں کہیں نہیں ٹھہرتی.. اس کا کوئی علاج نہیں ہوتا.. یہ بیماریٔ شرابِ شمال تھی جو مجھے لاحق ہو چکی تھی... اِک عشق جو ہم کو لاحق ہے..

میں اگرچہ وہ رِند تھا جو تائب ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود..

یوں تو سفر حیات کا بے حد طویل تھا.. میں مے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا.. تو حیات کے اس نہ سمجھ میں آنے والے سفر پر نکلنے کے لیے ہم تو آمادہ نہ تھے.. ہم سے تو کسی نے دریافت نہ کیا کہ تم اس سفر پر جانے کے لیے راضی بھی ہو یا نہیں..

اور ہم مجبوروں پر ناحق خود مختاری کی تہمت لگا کر زبردستی روانہ کر دیا گیا.. تو پھر ہم اس زبردستی کے سفرِ حیات کو کیسے طے کرتے.. ہم نے اس طویل سفر کا شارٹ کٹ عدم کی طرح تلاش کر لیا.. وہ مے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا اور ہم شرابِ شمال کے مے کدے میں مخمور ہو کر اسے طے کرتے رہے..

اور اس مے کدے میں کیسی کیسی شرابیں تھیں..

درکُوت گلیشیر کی سفید اور دَم روکنے والی شراب..

شاہ گوری کے بدن پر جو میرے بوسوں کے نیل تھے، ان کی نیلی شراب..

کرومبر کے پانیوں کی مہک آور مے جو دُھوم مچاتی تھی اور چھپائے نہیں چھپتی تھی..

کنول جھیل کے ہر پتّے پر براجمان مہاتما بدھ کے نروان کا نشہ..

سنولیک پر رواں کشتیوں کے بادبانوں پر جو عہدِ رفتہ کے انگوروں کے باغ تھے، ان کی کشید..

سندھ ساگر کی گونج کا خمار..

وہ جو شمال کے مے کدے کا ساقی تھا.. بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے.. شائد وہی تھا جو کنارِ رُکنا باد حافظ کے جام لبریز کرتا تھا.. حکیم خیام کے پیالے بھرتا تھا.. کہ ایک جام شراب کا.. ایک خمیری روٹی کا ٹکڑا.. ندی کنارے اور تو.. تو یہی جنت ہے.. تو یہ وہی ساقی تھا جو میرے ارادوں اور توبہ کو شکستہ کرنے کا جتن کرتا تھا... حافظ اور خیام تاب نہ لا سکے تو میں کیا اور میری توبہ کیا..

چنانچہ جب بدن بہت ہی ٹوٹنے لگا.. خمار کی خواہش مجھے بے بس اور بیمار کرنے لگی.. مجھے آزردہ اور لاچار کرنے لگی تو میں نے سوچا اتنی بنیاد پرستی بھی کیا.. تھوڑی سی مفاہمت کر لی جائے.. چلے جاتے ہیں مے کدۂ شمال میں.. لیکن ذرا کم کم پئیں گے.. ایک گھونٹ بھریں گے اور اسے تا دیر حلق میں رہنے دیں گے.. یعنی مکمل

طور پر ہوش نہیں کھوئیں گے..اور اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ..راہ آسان کر لی جائے..

وہاں جائیں جہاں کوئی خدشہ نہ ہو..جان جانے کا امکان نہ ہو..کوئی برفانی بلندی یا گہرائی یا کھائی یا موت کے بلاوے نہ ہوں..کوئی دریا مجھے آغوش میں لینے کے لیے بے قرار نہ ہو..ورگوتھ ایسی ندیاں میرے آزردہ اور تھکے ہوئے بدن کی تمنائی نہ ہوں..کوئی سیاہ پوش وادیٔ سوختر آباد میں مجھے اپنے لبادے میں لپیٹ کر اوپر لے جانے کی آرزو نہ کرے..سیدھا سا راستہ ہو..کوئی پیچ وخم نہ ہو..جیسے جناح باغ میں ہر صبح سیر کرتے ہیں، ویسے یونہی ٹہل آئیں..تو کیا حرج ہے..یوں توبہ تو نہیں ٹوٹتی..

صرف اس لیے میں نے دیوسائی کا انتخاب کیا..

دیوسائی..دنیا کی تنہائی میں سب سے تنہا..سب سے الگ تھلگ..اپنے ایک ریچھ..ایک پھول، ایک بادل میں گم..آسمان کے دروازوں پر ہولے سے دستک دیتا ہوا دیوسائی...اور اس کا سفر کلفتوں اور کٹھنائیوں کا نہ تھا۔دہشت اور موت کا نہ تھا..

وہاں تو ہر کوئی جاتا تھا۔

سکردو سے جیپ پر سوار ہو کر ہر کوئی وہاں جاتا تھا..

تو اس قسم کے معصوم سفر سے توبہ کہاں ٹوٹتی ہے..

رِند کے رِند رہے..

ہم نہایت سہولت سے..ایک جیپ میں سوار دیوسائی کے پار چلے جائیں گے..

مجھے معلوم تھا کہ اس کے وسیع میدان جیپ روڈ ایک مندمل زخم کے نشان کی طرح سبزے اور پھولوں سے الگ دکھائی دیتی ہے..اور مجھے وہ ایک صاف ستھرے چیتے کی کھال پر...کمر کے گرد..ناف کے آس پاس تنے ہوئے پیٹ پر ان سکڑتی بدنما دھاریوں کی طرح لگتی تھی جو سیزرین آپریشن کے ذریعے بچہ نکالنے کے بعد ایک پیٹ پر نمودار ہو کر اس کی خوبصورتی اور تناؤ کو داغدار کر دیتی ہیں..

لیکن ہم نے اس داغ ملامت کی بدنمائی کے باوجود یہ سوچا کہ سفر کو مزید

آسان بنا لیا جائے، جیپ کا کیا پتہ، الٹ جائے، گر جائے..تو اس میدان کو پیدل عبور کیا جائے..تو اب اس میں ٹھوکر کھا کر گرنے کے سوا اور کیا خطرہ ہو سکتا تھا..

اس قسم کے سفر سے توبہ تو ہرگز نہ ٹوٹتی تھی..پھر میں نے سوچا کہ ایک ریچھ، ایک پھول اور ایک بادل تو نان الکحلک شرابیں ہیں... تھوڑا بہت نشہ تو ہونا چاہیے..مے خانۂ شمال میں جا کر تھوڑا سا سرور تو طاری ہونا چاہیے۔چنانچہ میں نے دیوسائی کی اس نان الکحلک شراب میں تھوڑا سا تیز نشہ یوں ملایا کہ اپنے سفر میں بُرجی لاء کی بلند راہبانیت کو بھی شامل کر لیا..

میں اس درّے سے ناواقف تھا..

پھر کسی آفت زدہ کوہ نورد کی کتاب میں ایک حوالہ پڑھا کہ...دیوسائی کے اس درّے کی بلندی سے قراقرم کا سب سے عظیم الشان نظارہ دکھائی دیتا ہے..سینکڑوں کلومیٹر دور..کے ٹو۔مشابرم اور دیگر بے پناہ بلندیوں والی چوٹیاں ایک قطار میں کھڑی نظر آتی ہیں..اور صرف نصیب والے کوہ نورد اس درّے کی ٹاپ پر پہنچ کر انہیں دیکھ سکتے ہیں۔اگر موسم صاف ہو..

میں نے سوچا شاہ گوری اپنا عشق خاص ہے..چلئے وصال نہ سہی ایک محال دوری سے اس کا دیدار ہی سہی..چنانچہ میں نے دیوسائی کے آسان ترین ٹریک میں یہ تھوڑا سا سرور بھی شامل کر لیا..

ہماری کوسٹر..تیز اور تباہ کن بارش کے تھپیڑوں کو بمشکل سہارتی..لڑھکتی ہوئی سکردو روڈ پر بل کھاتی چلی جا رہی تھی..

”دغاباز سکردو فلائٹ“

ابھی میں نابینا طائر تھا جو کوسٹر کے پنجرے میں بند... آنکھیں جھپکتا تو باہر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا..

اور ابھی پچھلی شب اسلام آباد میں... میں ایسا پرندہ تھا جو ایئر فورس کے تیز ترین جیٹ طیاروں سے بھی تخیل میں آگے نکلتا تھا...ڈرامہ سیریل ”شہپر“ کی کامیابی پر مرگلہ کے دامن میں ایک بلند مقام پر ایئر فورس کے سب سے اعلیٰ اور پرشکوہ میس میں ایک شام کی ضیافت تھی جس میں بہت بلند مرتبت بیوروکریٹ، میڈیا کے متکبر زار اور اعلیٰ افسران شامل تھے اور اس سیریل کے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے مجھے جرنیلوں اور ایئر مارشلوں کے سایۂ عاطفت میں جگہ دی گئی تھی..اور جب میں موجودہ ایئر چیف ایئر مارشل قریشی اور جنرل سلیم اللہ کو نظر میں رکھتے ہوئے..نگہ بلند رکھے.. نہایت دانش مندی سے مہمان خصوصی کی حیثیت میں خطاب کر رہا تھا تو ان سب کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ جو مہمان خصوصی ہے اور بلند نگاہوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت متانت سے تقریر کر رہا ہے تو یہ..اتنا بیہودہ آدمی ہے کہ اگلی صبح..صرف ایک ریچھ کے لیے..ایک پھول اور صرف ایک بادل کے لیے یہ سب کچھ تیاگ دے گا اور دربدر ہوگا..

وہ لوگ کیسے جان سکتے تھے کہ میرے ٹیلی ویژن کے سارے روپ..ڈرامہ نگار

اور میزبان..سب روپ دکھاوا اور فریب ہیں..بہروپ ہیں..کیونکہ دراصل وہ لوگ اندھے پرندے تھے جو اسلام آباد کے جدید پنجرے میں بند اپنے آپ کو آزاد اور بینا سمجھتے تھے..اور وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے سامنے جو پرندہ ہے وہ ایک خانہ بدوش ہے اور اس کے خیمے تلے گھاس اُگ چکی ہے اور وہ کوچ کر جانے کو ہے..پرواز کر جانے کو ہے..وہ نہیں جانتے تھے..اگر جان لیتے تو کبھی مجھے مہمانِ خصوصی نہ بناتے..زیادہ سے زیادہ دربان بنا دیتے..

اگلی صبح ایک مرتبہ پھر سکردو فلائٹ دغاباز ہوگئی..”خواتین و حضرات..ہمیں افسوس کے ساتھ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ موسم کی خرابی کے باعث سکردو کی پرواز..“ ہمارے رُک سیک پہلے تو اسلام آباد ایئر پورٹ کے فرش پر اس امید میں کہ ابھی ایک گھنٹے کے اندر ہم نانگا پربت پر سے گزر کر سکردو کی کھنکتی شفاف ہواؤں میں ہوں گے، نہایت نہال ہو رہے تھے..اور جب فلائٹ کی منسوخی کا اعلان ہوا تو نڈھال ہوگئے بلکہ انٹرویو میں فیل ہو جانے والے سجے سجائے امیدواروں کی طرح اپنی اپنی جگہ ڈھے گئے..وہ بے شک ہمارے وہ سکّے تھے جو تریوی کے فوارے میں ہماری آرزوؤں کے سکّے تھے لیکن ان پر مایوسی کا زنگ تہہ در تہہ بیٹھنے لگا..

لیکن یہ سب کچھ تو پارٹ آف دی گیم تھا...کم از کم پچھلے برس والی نہایت اعلیٰ ذلت تو نصیب میں نہیں آئی تھی جب جیٹ سکردو ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے کو تھا اور ہم اپنے جوگرز کے کھلے تسمے باندھتے تھے اور اپنا سامان اٹھا کر گود میں رکھتے تھے اور ایئر ہوسٹس کو خدا حافظ کہتے تھے اور تب اعلان ہوا تھا کہ..موسم کی خرابی اور ہم واپس اسلام آباد جا رہے ہیں..کم از کم ہم اس بار اسلام آباد میں بیٹھے بیٹھے ذلیل و خوار ہوئے تھے..

ہم رکنے والے کہاں تھے..

چنانچہ ایک کوسٹر.. زرِکثیر لٹانے کے بعد.. سکردو تک کی بیس گھنٹے کی آسمانی اور کوہستانی گُھمن گھیریوں کی پر دہشت عذاب مسافت ہمارے سامنے تھی اور ہم اسلام آباد سے نکلتے تھے.. سکردو کے لیے.. بائی روڈ...

اور پہلی شام میں.. ایک مرتبہ پھر بشام..

سندھ ساگر کے کنارے بشام موٹل میں... شیرستان کی رفاقت میں.. اور رات گئے تک شیر دریا کے کنارے..

میں وہی تھا.. اگرچہ ایک اور برس مجھ پر بیت چکا تھا اور میرے بدن کی مٹی پر اس برس کی بارش نے عمر کی لکیروں کے مزید راستے بنائے تھے.. لیکن میں وہی تھا.. شیر دریا کے پانی وہ نہ تھے.. یہ وہ نہ تھے جن کی چادر سے دھاگے ادھڑ کر مجھ تک آتے تھے اور میرے تن بدن میں جو خالی دھاریاں تھیں، ان کو پُر کرتے تھے.. یہ اور پانی تھے.. اس لیے پہلی بار میں اور سندھ ساگر اجنبی رہے..

اور اگلی سویر سفر شروع ہوا.. اور سویرے سویرے شروع ہوا تو ہم نے ایک مرتبہ پھر بر سین موٹل کی بلندی پر.. اس کی دریائے سندھ کی بلندی پر.. تنہائی کی اداسی میں.. ناشتہ کیا.. میں ایک بار پھر اس کے ایک پر آسائش کمرے میں گیا اور وہاں ان آرزوؤں کو تلاش کیا جن کی مجھے آرزو تھی... وہاں جو خاموشی تھی، اس سے کلام کیا.. لیکن جواب نہ ملا.. صرف خاموشی ملی..

جب ہم جنگلوٹ پہنچے تو شام ہونے والی تھی..

یہاں سے گلگت تو دو چار ہاتھ تھا لیکن سکردو کی دِلی ہنوز دور تھی..

ہم دریائے گلگت کے پل کے پار سکردو روڈ پر رواں ہوئے تو تاریکی گہری ہوئی

اور پھر ایسی رات ہوئی کہ ہم نے سندھ ساگر کو اگر دیکھا تو اپنی نابینائی سے دیکھا۔ ہم اپنے کوسٹر کے پنجرے میں بند لڑھکتے چلے جاتے تھے.. اور بارش.. سیاہ اور پُرخوف بارش برستی جاتی تھی..

"بھیگتے سرد خواب کی لپیٹ میں"

گئی رات ہم وادیٔ سکردو کی تاریکی میں داخل ہوئے۔ جھیل کچورا کی قربت میں.. دریائے سندھ کے بے حد وسیع پاٹ کے کناروں پر سفر کرتے جاتے تھے لیکن آسمان سے برسنے والے پانیوں میں کوئی کمی نہ آتی تھی..

سکردو شہر.. ایک بھیگتے سرد خواب کی لپیٹ میں خوابیدہ تھا.. اور اس میں سے ہماری ویگن.. ہماری کوسٹر.. تھکے بدنوں اور پژمردہ رُک سیکوں کو سنبھالے ایک چڑھائی چڑھتی تھی اور سامنے.. کے ٹُو موٹل کے استقبالیئے کے باہر صرف ایک بلب ابھی تک بارش کے باوجود فیوز نہ ہوا تھا.. روشن تھا..

میں سر جھکائے.. شدید سردی میں.. بارش سے پناہ مانگتا بیس گھنٹوں سے زائد سفر کی تھکان سے چور.. ٹوٹا ہوا.. ٹھٹھرتا ہوا اس ایک بلب کی طرف جاتا ہوں۔ دروازہ کھول کر اندر جاتا ہوں اور اندر ابھی تک رات کے اس پہر بھی شیر علی کا دل پر اثر کرنے والا ہینڈسم چہرہ موٹل کے سینکڑوں ووچرز پر جھکا حساب کتاب کر رہا ہے.. وہ سر اٹھاتا ہے تو میں نوٹ کرتا ہوں کہ اس کے بال سفید ہو رہے ہیں.. ڈیشنگ کاؤبوائے پر عمر کی سفیدی چھڑکاؤ کر رہی ہے.. وہ ان بالوں کو سنوارتا ہے اور یکدم مجھے سامنے پا کر ٹھٹک جاتا ہے.. کاؤنٹر سے باہر آ جاتا ہے۔ "آپ نے مجھے اپنی آمد کی اطلاع کیوں نہیں دی تارڑ صاحب.. موٹل تو بالکل فُل ہے.. لبریز ہو چکا ہے.. یہاں اُن چھ جاپانیوں کے

دوست اور رشتے دار آئے ہوئے ہیں جو کے ٹُو کے قریب برفانی طوفان کی تیز ہوا کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئے تھے.. لیکن آپ نے اپنی آمد کی اطلاع کیوں نہیں کی؟"

میں ابھی تک نابینا تھا، تھکن سے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا..

"کوئی گنجائش نہیں؟"

"اگر آپ تنہا ہوتے.. ایک دو ساتھی ہوتے تو میں آپ کے لیے اپنا کمرہ خالی کر دیتا لیکن آپ تو آٹھ ممبر ہیں... بارش نہ ہوتی تو میں آپ کے لیے موٹل کے لان میں خیمے لگوا دیتا.. اب وہ بھی ممکن نہیں ہے.."

"تو پھر کیا ممکن ہے شیر علی؟"

"نیچے.. ہنزہ ٹورسٹ ہاؤس میں صداقت ہو گا.. میں اسے فون کرتا ہوں۔ آج کی رات گزارہ کر لیں، کل آپ کے لیے یہاں کمرے ہوں گے۔"

ہم کے ٹُو موٹل سے نیچے اترتے ہیں..

نیچے ہنزہ ٹورسٹ ہاؤس میں تاریکی اور نیند کا راج ہے..

لیکن صداقت ایک سچے پروفیشنل کی طرح آنکھیں ملتا مگر مسکراتا برآمد ہوتا ہے اور مجھے دیکھ کر مزید ہوشیار اور دوست ہو جاتا ہے لیکن اس کی ہوشیاری اور دوستی میری کچھ مدد نہیں کر سکتی کیونکہ اس کا ہوٹل بھی سراسر فُل ہے..

باہر سرد پانیوں کی بارش تھمتی نہ تھی.. برستی جاتی تھی.. ہوٹل کی ٹین کی چھت پر بندوق کے چھرّوں کی طرح چھید کرنے کی کوشش میں شور کرتی جاتی تھی.. ہمارا ڈرائیور اتنا تھک چکا تھا کہ ہمیں بے شک بارش میں بھیگتے، نمونیا سے فوت ہوتے.. اب اتار کر اپنا کرایہ وصول کر کے رخصت ہو جانا چاہتا تھا.. سکردو پہنچانا اس کی ذمہ داری تھی.. سکردو پہنچ کر ہمیں بارش بھری رات میں کوئی چھت نصیب ہوتی ہے یا نہیں.. یہ اس کی ذمہ داری نہیں تھی..

"کوئی برآمدہ.. کوئی کچن.. کوئی بڑا باتھ روم بھی خالی نہیں؟"

"ذرا ٹھہریئے.." صداقت نے میرا کندھا پکڑ کر کہا۔ "ایک بڑے کمرے میں تین ڈرائیور سو رہے ہیں.. میں انہیں جگا کر درخواست کرتا ہوں کہ ہمارے تارڑ صاحب آئے ہوئے ہیں۔"

اور نامعلوم ڈرائیور.. خدا کے بندے.. میری لاج رکھتے ہیں.. میرے لیے اپنے تکیے اور بستر اٹھائے کمرے کو خالی کر دیتے ہیں اور برآمدے میں سو جاتے ہیں۔

"کچھ کھانے کو مل جائے گا؟"

"بہت کچھ ملے گا صاحب.." صداقت صرف ایک ہوٹل والا نہیں تھا بلکہ ایک مہربان اور دوست شخص تھا۔ "باورچی پنجاب کا ہے.. ابھی سو رہا ہے.. میں اسے پکڑ کر لاتا ہوں۔"

ڈرائیوروں کی عنایت سے مہیا کردہ کمرے کی.. ایک چھت تھی.. غسل خانہ تھا.. اور ہم بارش اور سردی سے مکمل طور پر محفوظ تھے.. اور ہمیں کھانے کو بھی مل گیا تھا.

اگلی صبح ہم کے ٹو موٹل میں شفٹ کر گئے..

"ہیروشیما کی موت"

اور اگلی صبح میں نے ایک ایسا سکردو دیکھا جس کا چہرہ سفید تھا اور اسے پہچاننے میں مجھے دشواری ہو رہی تھی..

کیا سکردو بھی میری طرح عمر رسیدہ ہو رہا ہے اور اس کے بالوں میں چاندی آ رہی ہے.. رات.. جب نیچے وادی میں بارش برستی تھی تو اوپر سکردو کے پہرے داروں.. اس کو گھیرے میں لیے ہوئے بلند پہاڑوں پر شدید برفباری ہو رہی تھی.. وہ سب برف کی سفید رداؤں میں لپٹے ٹھٹھرتے تھے... کے ٹو موٹل کے ڈائننگ روم کے شیشوں میں سے ان کی سفید کرنیں ہماری میزوں تک آتی تھیں اور ہماری گرم کافی کو لمحوں میں سرد کرتی تھیں.. ہمارے فرائیڈ ایگز کی زردی کو سخت کرتی تھیں اور موٹل کے اوپر کھرفوچے قلعے کے گرد سفید بادل تھے.. ان کے ہالے تھے جو اسے ایک حرم جان کر اس کے گرد سفید احرام باندھے طواف کرتے تھے..

اور میں ایک مرتبہ پھر اپنے دل پسند شہر... سکردو میں تھا..

اور سکردو کے بارے میں میں ایک ایسی کہانی سنانا چاہتا ہوں جس پر آپ یقین نہیں کریں گے.. میں ابھی تک خود یقین نہیں کر سکا..

سکردو کے ایک اہم خاندان کے فرد جو مشابرم بس سروس کے مالکان میں

سے ہیں.. لاہور آئے تو شمال کے ساتھ میری وابستگی اور سفرناموں کے حوالے سے میرے گھر تشریف لائے.. اور انہوں نے یہ کہانی سنائی..

راولپنڈی سے طویل مسافت کے بعد.. سکردو روڈ پر سفر کرتی جب ایک بس.. مشابرم سروس کی ایک بس.. جب دریائے سندھ کے اس پل پر پہنچی جس کے پار سکردو کا شہر تھا تو وہاں حسب معمول بس کے مسافروں کی چیکنگ ہوئی۔ ان کے شناختی کارڈ چیک کیے گئے تو مسافروں میں ایک تنہا نوجوان لڑکی بھی تھی جو اپنی شناخت کا ثبوت نہ دے سکی اور اس نے کہا کہ وہ سکردو میں اپنے ماموں سے ملاقات کے لیے آئی ہے.. اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ ماموں سکردو میں کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ بس کے ڈرائیور نے سوچا کہ رات کے اس پہر اس نوجوان لڑکی کو تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا، اس لیے وہ اسے مشابرم سروس کے مالکان کے گھر لے گیا.. انہوں نے اسے ایک بیٹی کی طرح خوش آمدید کہا.. اگلے چند روز اسے سکردو کی سیر کرواتے رہے.. جھیل صدپارہ اور کچورا پر لے گئے.. دیوسائی جانے والا راستہ دکھایا اور حیرت انگیز طور پر وہ ان مقامات سے پہلے سے واقف تھی بلکہ فرمائش کرتی تھی کہ مجھے اب وادیٔ شگر دکھا دیں.. اوپر کھرفوچے قلعے تک لے چلیں.. صدپارہ جھیل کے کنارے وہ کونسا چشمہ ہے جس کے پانیوں میں سونے کی آمیزش ہے.. اس کے میزبانوں نے ایک روز اسے کہا کہ بی بی آپ بہت دنوں سے ہمارے ہاں مقیم ہیں.. آپ کے ماموں کا سراغ نہیں ملتا.. ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ آپ کون ہیں.. ہو سکتا ہے آپ کوئی مجرم یا مخدوش کردار کی حامل کوئی خاتون ہوں، اس لیے یا تو آپ اپنا پتہ بتلائیے.. اپنی شناخت کروائیں ورنہ ہم پولیس کو اطلاع کر دیں گے..

اس خفیہ دھمکی کے زیر اثر اس لڑکی نے کہا کہ میں پشاور کی رہنے والی ہوں اور ہمارا فون نمبر یہ ہے.. اس نمبر پر فون کیا گیا تو ادھر سے جواب آیا کہ ہم نے تو اخباروں میں اشتہار دیئے.. شریکوں کے خلاف رپورٹیں درج کروائیں.. کہ یہ بچی بہت دنوں سے

غائب تھی.. ہم سکردو آ رہے ہیں۔

اگلے روز اس بچی کے دو ماموں اور والدہ صاحبہ سکردو پہنچ گئے.. اور اسے دیکھ کر اس کی والدہ نے کہا... اور میں سکردو کے ایک باسی کا حوالہ دیتا ہوں.. کہ... میں کہتی تھی ناں کہ مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے نہ پڑھا کرو... ہماری عزت خاک میں ملا دی ہے ناں.. لعنت ہو اس تارڑ پر..

میں نے یہ کہانی کسی جذبۂ تفاخر کے طور پر بیان نہیں کی.. شدید شرمندگی کے طور پر سنائی ہے.. اس بی بی نے اپنی والدہ کو الٹی میٹم دیا تھا کہ یا تو مجھے وہاں لے چلو جہاں "کے ٹو کہانی" ہے.. "نانگا پربت" ہے.. یا میں گھر سے بھاگ جاؤں گی....

میں نے آج تک اس بے وقوف لڑکی کو نہیں دیکھا.. نہ اس کے نام سے واقف ہوں.. لیکن میری ایک مؤدبانہ گزارش ہے کہ.. میرے سفرناموں کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا کریں.. یہ.. ایک دیوانے کی بڑ ہوتے ہیں۔ دیوانگی جو کچھ دیکھتی ہے، اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ میری تحریر کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا.. میں اپنے من میں بستیاں آباد کرتا ہوں.. ان کا وجود نہیں ہوتا پھر بھی.. آباد کرتا ہوں.. میرے دل میں کوہ نوردی کا عشق خاص ہے، وہ ایسی آبشاریں تخلیق کرتا ہے جن کا وجود نہیں ہوتا..

وہ ایسی ندیوں کو رواں کرتا ہے جن کا نام نہیں ہوتا..

میرے سفرناموں کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا کریں..

"آپ کب آئے ہو؟" کسی نے کے ٹو موٹل کے ڈائننگ روم میں مجھ سے پوچھا..

"پچھلی رات.. بائی روڈ.. اسلام آباد سے۔"

اور سب نے ہمیں شک کی نظر سے دیکھا "لیکن سکردو روڈ تو کم از کم بیس

مقامات پر ہلاک ہو چکی ہے.. آپ کیسے آئے؟"

"گرتی چٹانوں نے ذرا احتیاط کی.. وہ تب گریں جب ہم گزر گئے.."

کے ٹو موٹل کے ڈائننگ روم میں اُس سویر ایک بین الاقوامی اجتماع تھا...

دنیا بھر کے کوہ نورد تھے... اور جاپانیوں کی ایک کثیر تعداد تھی اور نذیر صابر تھا.. اور وہ مسلسل میز پر سجے کانٹوں کو گھماتا تھا... چھریوں کی دھار پرکھتا تھا اور بے حد دُکھ میں تھا۔ "میرے ساتھ زندگی نے عجیب دھوکہ کیا ہے.... کے ٹو کے قریب ہونے والے اس حادثے میں ہلاک ہونے والے سارے کے سارے جاپانی میرے ذاتی دوست تھے.. اور آپ ہیروشیما کو تو جانتے ہوں گے.."

"ہاں.. میں کبھی ان سے مل نہیں سکا.. قریب سے گزر گیا لیکن ملاقات نہ ہو سکی.. جب میں جھیل کرومبر سے جدا ہو کر وادیٔ بروغل میں اترا تھا تو مجھے بتایا گیا تھا اور میں نے "یاک سرائے" میں بیان بھی کیا ہے کہ ادھر نذیر صابر گروپ کے کچھ جاپانی خیمہ زن ہیں اور ان میں ہیروشیما بھی ہے.. جو پاکستان کا دوست ہے.. ہر چھ ماہ بعد پاکستان آتا ہے اور اس کے شمال کو سجدہ کر کے واپس چلا جاتا ہے.. کیا وہی تھا؟"

"ہاں.. وہی تھا.."

"وہ مر گیا ہے؟"

"ہاں.. لیکن آپ وادیٔ بروغل میں رُکے کیوں نہیں.. ہیروشیما سے ملاقات کیوں نہیں کی؟"

"مجھ پر درّہ درکوت کراس کرنے کا خوف سوار تھا.. میں رائس وائن کی دعوت کے باوجود نہیں رک سکتا تھا.. لیکن یہ حادثہ کیسے ہوا؟"

"پہاڑوں پر حادثے نہیں ہوتے تارڑ صاحب.. بس اجل نازل ہو جاتی ہے،

بلاوا آ جاتا ہے.. یہ لوگ کے ٹو کے پہلو میں ایک گمنام سی چوٹی ہے، اس پر گئے تھے.. اور یہ زیادہ بلند نہیں، زیادہ خطرناک نہیں.. اِسے سر کرنے کے بعد جب یہ جاپانی نیچے بیس کیمپ میں آئے تو بہت تھک چکے تھے.. یہ مقام عام حالات میں ایک نہایت محفوظ اور پرسکون جگہ ہے۔ جیسا کہ اکثر بیس کیمپ ہوا کرتے ہیں.. انہوں نے یہاں شب گزارنے کا فیصلہ کیا۔ جب کہ ان کے پورٹرز ذرا نیچے اتر کر کنکورڈیا میں چلے گئے کہ ادھر نسبتاً کم سردی ہو گی.. اس رات اوپر بلندی پر بیس کیمپ سے بہت دور ایک ایوالانچ آیا، ایک برفانی تودہ گرا اور اس کے گرنے سے جس تیز اور تُند ہوا نے جنم لیا، وہ سفر کرتی نیچے بیس کیمپ تک آئی اور اس کی رفتار ایک سو بیس کلو میٹر فی گھنٹہ سے کہیں زیادہ تھی.. اس ہوا نے جاپانیوں کے خیموں سے ٹکرا کر انہیں ریزہ ریزہ کر دیا اور ان میں جو لوگ خوابیدہ تھے، انہیں اڑا کر آس پاس کی برفوں اور چٹانوں سے جا ٹکرایا... نرم برف میں کریش کرنے والے زخمی ہوئے لیکن چٹانوں سے ٹکرانے والے چھ افراد مر گئے اور وہ سب میرے ذاتی دوست تھے... ہیروشیما بھی ان میں شامل تھا.. زخمی رات بھر وہیں تڑپتے رہے.."

"پورٹروں نے ان کی مدد نہیں کی..."

"نہیں..." نذیر صابر کا ہیئر سٹائل کبھی بھی میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا.. اس کے سر پر ایک براؤن رنگ کا گھونسلا تھا جس میں کوئی بھی پرندہ قیام کر سکتا تھا۔ "نہیں کوئی بھی ان کی مدد کو نہ آیا.. بلتی پورٹر خون دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں.. وہاں کنکورڈیا میں ایک غیر ملکی ٹیم خیمہ زن تھی، اس کے افراد نے ان کی مدد کی.. زخمیوں کو نیچے پہنچایا اور... جو مر گئے تھے... انہیں.. ویسے میں نے ابھی تک ہیروشیما کے خاندان والوں کو اس کی موت کے بارے میں نہیں بتایا.. وہ سب آپ کے سامنے بیٹھے ہیں..."

موٹل کے ڈائننگ روم کے درمیان میں ایک طویل میز کے گرد ہیروشیما

کے بیوی، بچے اور رشتے دار خاموشی سے ناشتہ کر رہے تھے.. ان کے ہمراہ بقیہ ہلاک ہونے والے جاپانیوں کے درجنوں عزیز و اقارب تھے..

"یہ سب لوگ ایک خصوصی طیارے پر جاپان سے سکردو آئے ہیں.. اپنے عزیزوں کے چہرے دیکھنے... انہیں ابھی معلوم نہیں کہ وہ انہیں اب کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔"

"ان کی لاشیں کہاں ہیں؟"

"انہیں.. ان سب کو برف کی ایک گہری دراڑ میں دھکیل دیا گیا تھا.. انہیں سکردو واپس لانا ممکن نہ تھا.. ہیروشیما کو پاکستان سے بے حد محبت تھی.. اس کی بلندیوں اور برف سے عشق تھا، اس کا مدفن یہیں ہونا چاہیے تھا.. اب ایک اور مسئلہ ہے.. یہ لوگ جائے حادثہ تک بھی نہیں جا سکتے.. اس دراڑ تک بھی نہیں پہنچ سکتے جس میں جھانکنے سے انہیں کچھ دکھائی نہیں دے گا لیکن ان کی تسلی ہو سکتی تھی اور وہ اس کے کنارے بیٹھ کر انہیں یاد کر سکتے تھے، ان کے لیے آنسو بہا سکتے تھے.. مسئلہ یہ ہے کہ اسکولے روڈ مکمل طور پر بلاک ہو چکی ہے اور موسم اتنا خراب ہے کہ ہم انہیں ہیلی کاپٹر پر بھی وہاں نہیں پہنچا سکتے.. میں نے انہیں ابھی بتایا نہیں کہ انہیں یہیں سے واپس جاپان جانا پڑے گا.."

"ہیروشیما کو پاکستان سے بہت محبت تھی؟"

"ہاں.. اس نے اپنی پوری زندگی پاکستان کے لیے وقف کر رکھی تھی.. وہ جاپان میں پاکستان کے بارے میں لیکچر دیا کرتا تھا.. ایک مرتبہ جب ہندوستان نے چین کی جانب سے کے ٹو پر ایک مہم بھیجنے کی کوشش کی تو یہ ہیروشیما تھا جس نے احتجاج کیا کہ یہ پہاڑ پاکستان کا ہے اور ہندوستانی اس پر نہیں جا سکتے.. اس کی مہم کے نتیجے میں ہندوستان نے یہ ارادہ ترک کر دیا..."

وہ کم از کم چالیس پچاس کے قریب تھے.. نوجوان۔ بوڑھے.. بچے.. جو اپنے

عزیزوں کا چہرہ دیکھنے کے لیے اتنی دور سے آئے تھے اور ابھی نہیں جانتے تھے کہ وہ نہیں دیکھیں گے.. اور اگر موسم خراب نہ ہوتا اور وہ جائے حادثہ تک پہنچ بھی جاتے تو بھی وہ شکلیں جنہیں آخری بار دیکھنے کے لیے اتنی دور سے آئے تھے، اب وہاں نہیں تھیں، ایک گہری دراڑ میں دفن ہو چکی تھیں..

"اب آپ کیا کریں گے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ انہیں کل صبح وادئ شگر سے ذرا پرے دریائے برالڈو کے کنارے لے جاؤں.. برالڈو آپ جانتے ہیں کہ بالتورو گلیشیر میں سے نکلتا ہے اور بالتورو کنکورڈیا تک پھیلا ہوا ہے اور کنکورڈیا کے پہلو میں کے ٹو کی قربت میں وہ مقام ہے جہاں یہ حادثہ رونما ہوا تھا.. تو ایک طرح سے یہ رابطہ ہے پانیوں کا.. کہ شائد کچھ برف ایسی ہو گی جو اس مقام سے پگھل کر نیچے اس دریا میں شامل ہوئی ہو گی.. جہاں ہیروشیما اور اس کے ساتھی دفن ہیں.. تو میں انہیں برالڈو کے کنارے لے جاؤں گا کہ یہ پانی وہاں سے آرہے ہیں.."

نذیر صابر کی سوگواری کم کرنے کی خاطر میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ "آپ ایورسٹ کو سر کرنے کے لیے گئے تھے.. پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ایک تحفے کے طور پر.. ناکام کیسے ہو گئے؟"

اس نے صرف اتنا کہا۔ "تارڑ صاحب واپسی پر کئی لوگوں نے الزام لگایا کہ میں نے جان بوجھ کر اس مہم کو ناکامی سے دوچار کیا.. میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتا اور نہ تفصیل میں جانا چاہتا ہوں لیکن دنیا میں وہ کونسا ایسا بدبخت کوہ پیما ہو گا جو جان بوجھ کر ایورسٹ پر قدم نہ رکھے.. اب بھی یہ میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں پاکستان کے لیے یہ چوٹی سر کروں۔ اس برس نہ سہی.. اگلے برس سہی.."[1]

---

[1] مجھے خوشی ہے کہ میرا یہ خدشہ درست ثابت نہیں ہوا اور نذیر صابر وہ پہلا پاکستانی ہے جس نے ایورسٹ پر قدم رکھا۔

لیکن مجھے خدشہ ہے کہ اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے گی.. وہ نادرن ایریا
کونسل کا ممبر ہے.. سرکاری کاموں میں مصروف ہو چکا ہے.. اور اس کے برس کوہ پیمائی
کی مشقت کے آگے ہتھیار ڈالنے کو ہیں.. اس کے چہرے پر ایورسٹ کا نہیں اپنے
دوستوں سے بچھڑنے کا ملال تھا..

"مے خانۂ شمال کے دروازے بند ہیں"

پچھلے پہر ہم نے سکردو کے بازار میں زوہ کا گوشت کھایا... پکوڑے کھائے..
منتونوش کیا اور پھر... اپنی کوہ نوردی کے گورو محمد علی چنگیزی کے دفتر کا رخ کیا..

"تارڑ صاحب سکردو روڈ مکمل طور پر بلاک ہے اور اسے کلیئر ہونے میں کئی
دن لگ جائیں گے.. فلائٹس بند ہیں.. موسم خراب ہے.. اور دیوسائی ابھی تک نہ صرف
برف سے ڈھکا ہوا ہے بلکہ وہاں مزید برفباری ہو رہی ہے.. بلکہ یہاں تک کہ جھیل
صدپارہ کو جانے والی روڈ بھی بند ہو گئی ہے.. آپ ابھی اطمینان سے سکردو میں
ٹھہریں.. فی الحال دیوسائی جانے کا ارادہ ترک کر دیں.." چنگیزی نے ساری اچھی اچھی
خبریں یک مشت سنا دیں.. اس کی مسکراہٹ میں اب بھی وہی طلسم تھا جو نہ صرف غیر ملکی
دلوں کو زیر کرتا تھا بلکہ ہمیں بھی گرفتار کرتا تھا..

یہ دیوسائی بھی گویا کوئی عرش مقام تھا جہاں تک پہنچنے کے لیے ولی یا پیغمبر ہونا
پڑتا تھا.. بلکہ عجیب واہیات مقام تھا کہ یہ سامنے سکردو کے اوپر تھا.. صدپارہ جھیل سے
پرے.. اور اس تک پہنچنا اتنا سہل تھا کہ لوگ اپنے بال بچے سمیٹے پکنک کی ٹوکریاں
اٹھائے اوپر جاتے تھے اور وہاں سیر سپاٹا کر کے شام تک سکردو لوٹ آتے تھے.. جیپوں

کی ٹریفک جاری رہتی تھی اور کوہ نورد یونہی ٹہلتے ہوئے وہاں پہنچ جاتے تھے..

لیکن یہ سہولت دوسرے لوگوں کے لیے تھی..دنیا کے ہر شخص کے لیے تھی..بس میرے لیے نہیں تھی..میرے سامنے وہ ہمیشہ انکاری ہو جاتا تھا..

کبھی وہاں جولائی کے وسط تک برف نہیں پگھلتی تھی اور میں فیئری میڈو چلا جاتا تھا..کبھی نانگا پربت کے رُدپل چہرے سے واپسی پر چلم چوکی سے اترتے نیلے پانیوں کے کنارے ان گھوڑوں کا ماتم کرتا تھا جو مجھے اس کے پار لے جانے کے لیے دستیاب نہیں ہوئے تھے اور کبھی اطلاع آتی تھی کہ بڑے پانی کا وہ پُل جو ہر برس برف کے بوجھ سے مسمار ہو جاتا ہے، ابھی تک دوبارہ نہیں بن سکا..

میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ دیوسائی صرف اور صرف میرے لیے دیواریں کھڑی کرتا ہے..

کیا یہ زیادتی نہیں کہ جس برس میں اسے پیدل عبور کرنے کے لیے گھر سے نکلوں، صرف اسی برس اگست کے آخر میں موسم خراب ہو جائیں اور دیوسائی پر برفباری شروع ہو جائے..میں اس تک پہنچنے کے لیے جتنی منصوبہ بندی کرتا تھا، اگر دل جمعی سے شہزادی ڈیانا یا بروک شیلڈ تک پہنچنے کے لیے اتنی سعی کرتا تو میری کامیابی کے امکانات کہیں زیادہ روشن ہوتے..لیکن دیوسائی بھی جانتا تھا کہ اس کا ایک پھول، ایک ریچھ، ایک بادل ان دونوں سے کہیں زیادہ حسین ہے..

"اب سکردو میں کہاں پڑے رہیں گے چنگیزی صاحب..دیوسائی کو دفع کریں..ہم چند روز حاجی مہدی کے باغ میں گزار آتے ہیں..اسکولے کے لیے جیپ کا بندوبست کر دیں۔"

"اسکولے روڈ بند ہے تو جیپ کہاں سے جائے گی تارڑ صاحب.." چنگیزی میری حماقت سے خوش ہو کر کہنے لگا..

"تو پھر..ادھر کیا کریں گے بیٹھ کر..ہوشے چلے جائیں؟..مشابرم کے بیس کیمپ تک ٹریک کر آئیں گے..کیا خیال ہے؟"

"کوئی خیال نہیں..ہوشے روڈ بھی بند ہو چکی ہے..بلکہ شیر علی کا ایک ڈرائیور ادھر جیپ لے کر گیا تھا...وہ گر گیا..ڈرائیور تو بچ گیا لیکن اس کے ہمراہ ہنزہ کا ایک گائڈ تھا، اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی...اسے اٹھا کر سکردو لایا گیا اور یہاں کے ہسپتال میں ایک مقامی ڈاکٹر نے کہا کہ فکر نہ کرو، میں تمہاری ٹانگ کی ہڈی کو سیدھا کر کے جوڑتا ہوں..اور پلستر کرتا ہوں..لیکن گائڈ گھبرایا ہوا تھا، کہنے لگا، نہیں میں گلگت جا کر آرمی ہوسپٹل میں جا کر اپنی ہڈی جڑواؤں گا، ابھی صرف پٹی کر دو..تو جناب وہ گائڈ ادھر سکردو سے گلگت کی ویگن میں سوار ہوا..ذرا دور گئے تو روڈ آگے بلاک ہو گیا..اس نے سوچا فوراً واپس سکردو جاتا ہوں..ویگن واپس ہوئی تو اس دوران ایک اور تودہ گرا اور آگے سکردو جانے والی سڑک بھی بند ہو گئی..اور وہ درمیان میں پھنسا بیٹھا ہے..نہ ادھر جا سکتا ہے نہ ادھر آ سکتا ہے..اس کی ٹانگ پر صرف ایک پٹی ہے اور وہ بے حد تکلیف میں ہے..اور پتہ نہیں اس کی جان بھی بچتی ہے یا نہیں..تو جناب یہ صورت حال ہے.."

"یہ تو صورت بد حال ہے چنگیزی..تو ہم کیا کریں؟"

"تو آپ انتظار کریں سر..زوہ کا گوشت کھائیں..سوکھی ہوئی خوبانیاں کھائیں..لاہور فون کر کے بچوں سے باتیں کریں اور انتظار کریں..اور کیا کر سکتے ہیں۔"

مے خانۂ شمال کے سارے دروازے بند ہو چکے تھے..نہ کوئی آ سکتا تھا، نہ کوئی جا سکتا تھا..اور اس مے خانے میں صرف ہم ہی ہم تھے..اور بے حد پیاسے تھے..صراحیوں کے منہ بند تھے..اور جام خالی تھے..ہم سوائے انتظار کے اور کیا کر سکتے تھے..

"مُردہ کوہ پیماؤں کے بُوٹ"

سکردو بازار کے پہلو میں... ایک گلی کے اندر.. بے شمار مُردہ کوہ پیما تھے..

وہ اپنے بُوٹ، واکنگ سٹکس۔ جرابیں۔ برساتیاں۔ جیکٹس، سلیپنگ بیگ۔ رسّے اور خیمے یہیں چھوڑ گئے تھے.. کیونکہ ان کے پروگرام میں مرنا شامل نہیں تھا، اس لیے ان اشیاء پر انہوں نے اپنے نام نہیں لکھے تھے.. ورنہ ہم.. اس گلی کے اندر کوہ پیمائی کے سیکنڈ ہینڈ بلکہ ڈیڈ ہینڈ سامان کی جو دکانیں تھیں، اسے دیکھ کر جان جاتے کہ اچھا اچھا یہ بوٹوں کا جوڑا تو اس کوہ پیما کا ہے جو براڈ پیک سے اترتے ہوئے ہلاک ہو گیا تھا.. یا یہ اس جاپانی کی جیکٹ ہے جو کے ٹو تک پہنچا تھا اور پھر برف کا شکار ہو گیا تھا.. اور یہ تو اس کوہ نورد کا سلیپنگ بیگ ہے جو ٹرنگو ٹاور سے پھسلا تھا..

اگرچہ یہ ہرگز ضروری نہ تھا کہ ہر آئٹم... بوٹ یا جیکٹ وغیرہ کسی مردہ کوہ پیما کی ہی ہو.. مہم کے ارکان وطن لوٹتے ہوئے بھی اپنا کچھ سامان ہوائی سفر کا بوجھ کم کرنے کے لیے سکردو کے بازار میں فروخت کر جاتے ہیں.. لیکن مجھے یقین ہے کہ بیشتر اشیاء کے مالک اب اس دنیا میں نہیں تھے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جو بوٹ مجھے کے ٹو بیس کیمپ یا سنو لیک تک لے جائیں گے، میں انہیں کبھی فروخت نہیں کروں گا.. جس جیکٹ نے مجھے درہ ہیسپر کی سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر بچایا تھا، اس سے میں کبھی جدا نہیں ہوں گا.. یہ میرے محسن تھے..

تو میرے ساتھی.. سلمان۔ حسن۔ خالد اور انصاری.. ان مردہ کوہ پیماؤں کے نقشِ قدم یعنی بوٹ اپنے پاؤں میں فِٹ کرنے کی کوشش میں تھے..

اس بازار میں علی کی دکان تھی.. جو میرے، سمیر اور سلجوق کے ہمراہ دیوسائی گیا تھا.. ایک صاف ستھرا.. اکہرے بدن کا شخص جو اُن دنوں کنکورڈیا سے کسی غیر ملکی مہم کی ڈاک لے کر سکردو آیا تھا اور دو روز کے لیے چند درہم یا ڈالر کمانے کے لیے ہمارے ساتھ پورٹر کے طور پر دیوسائی ٹاپ تک گیا تھا..

وہ آغاز میں صدپارہ گاؤں کا ایک قصائی تھا جو گاؤں سے بکرے لا کر ان کا گوشت سکردو میں فروخت کرتا تھا.. پھر وہ پورٹر ہو گیا.. جو کہ کسی نہ کسی عمر اور زمانے میں تقریباً ہر بلتی ہو جاتا ہے.. اور اب وہ سیکنڈ ہینڈ اشیاء کا ایک معزز شاپ کیپر تھا..

"صاحب میں پہلے بھی آپ کے ساتھ گیا تھا.. اب بھی جاؤں گا.. دیوسائی کا چپّہ چپّہ جانتا ہوں صاحب..."

یہ بعد کی بات ہے کہ دیوسائی پہنچ کر وہ ہم سے ہر چپّے کے بعد پوچھتا تھا کہ صاحب اب کدھر جانا ہے.. میں تو دس برس سے ادھر نہیں آیا.. لیکن یہ بعد کی بات ہے..

"لیکن اس دوران تمہاری دکانداری کا کیا ہو گا علی؟"

"پروا نہیں صاحب.. ادھر کوئی بھائی بیٹھ جائے گا..."

تمام دوستی اور قدیم دیوسائی رفاقت کے باوجود اس کے بُوٹ بہت مہنگے تھے.. سلیپنگ بیگز کی قیمتیں راتوں کو نیند اڑا دینے والی تھیں تو ان میں کیسے سویا جا سکتا تھا۔ شاید اس لیے کہ علی بنیادی طور پر قصائی تھا اور جو سامنے آئے، اسے حلال کر لینے پر یقین رکھتا تھا..

مُردہ کوہ پیماؤں کے بے شمار بوٹ زبانیں کھولے ان پاؤں کے منتظر تھے جو انہیں ایک مرتبہ پھر انہی بلندیوں پر لے جائیں جن کی کسک ان کے تلووں کو تنگ کرتی تھی..

ایک بُوٹ... کوہ نوردوں کے لیے استعمال ہونے والے ایک بوٹ کی بھی تو کوئی روح ہوتی ہے..

اس کا چمڑا کبھی کسی زندہ جانور کا بدن رہا ہوتا ہے..

اسی لیے اس کی روح ہوتی ہے.. وہ بوٹ محسوس کرتا ہے، سُکھی بھی ہوتا ہے اور دُکھی بھی۔ اس کے تلووں تلے جب دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی شاہ گوری آتی ہے تو وہ فخر کرتا ہے کہ میں نے اسے روندا ہے.. اور جب وہ کسی کوہ پیما کے پاؤں میں بندھا چوغولیزا۔ براڈ پیک۔ گشابرم یا ٹرانگو ٹاورز کے اوپر پہنچتا ہے تو اس بُوٹ کی شخصیت شہر کی سڑکوں پر مارے مارے پھرتے.. دفتروں میں پڑے سُست بوٹوں کی نسبت ایک بلند مقام پر فائز ہوتی ہے..

لیکن جب وہ اس بلندی سے نیچے آتا ہے تو اسے ایک فضول اور بے جان شے سمجھ کر سکردو کے بازار میں فروخت کر دیا جاتا ہے..

اور وہ بُوٹ نوحہ کناں ہوتا ہے اور اس کی زبان کھلی ہوتی ہے اور وہ فریاد کرتا ہے.. چند ایسے فریاد کرنے والے بُوٹوں کو میرے ساتھیوں نے خرید کر اپنے پاؤں میں فِٹ کر لیا اور وہ بوٹ اس آس میں تھے کہ ہم ایک مرتبہ پھر بلندیوں پر ہوں گے اور ہمیں پہننے والے ہم سے نہ تو بے وفائی کریں گے اور نہ مریں گے..

"جاپانیوں کے سندیسے برالڈو میں بہائے جاتے ہیں"

کے ٹُو موٹل کی ایک صبح میں..

دیوسائی پر نگاہ رکھے.. برفوں کے پگھلنے کی آس میں.. چپ چاپ.. گم صم.. ہم سب.. بہت بے آسرا... بہت بے چارے کہ مانجھی رے منزل کہاں ہے تیری.. ہم سب بیٹھے ہیں تو نذیر صابر اپنے جاپانیوں کے ہمراہ موٹل کے ڈائننگ روم میں داخل ہوتا ہے..

"ہم وادیٔ شگر میں برالڈو کے کناروں سے واپس آ رہے ہیں.. میں نے وہاں پہنچ کر ان تک وہ خبر پہنچائی جو میں آپ کو بتا چکا تھا.. کہ ان کے عزیزوں کے چہرے اب کے ٹُو کے راستے میں ایک برفانی دراڑ کے اندر دفن ہو چکے ہیں اور وہ انہیں دیکھ نہیں سکتے.. جاپانی اسی موٹل کے لان سے زینیا کے گرم رنگوں کے پھول لے کر گئے تھے.. ان پھولوں کو انہوں نے اپنے پیاروں کی یاد میں پانیوں کے سپرد کیا.... پھر کچھ آنسو بہائے اور انہیں بھی برالڈو کے پانیوں میں بہایا.. اور پھر کچھ پیغام لکھے اور اپنے عزیزوں کے نام لکھے اور انہیں دریا کے حوالے کیا.."

"پیغام.. کس قسم کے پیغام؟"

"اگرچہ میری بیوی جاپانی ہے لیکن پھر بھی میں ان جاپانیوں کو نہیں سمجھ سکا.. جاپان ایسے جدید ترین معاشرے کے افراد بھی پختہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر ہم

دریائے برالڈو میں اپنے سے جدا ہونے والوں کے نام سندیسے لکھ کر بہائیں گے تو وہ ان تک پہنچیں گے..."

"لیکن برالڈو تو وادیٔ شگر کی قربت میں پہنچ کر دریائے شگر میں بدلتا ہے.. پھر سندھ میں گرتا ہے.. سندھ بالآخر... بشام۔ کالا باغ.. چشمہ.. غازی گھاٹ اور کوٹ مٹھن وغیرہ سے گزر کر... بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے تو اس میں بہائے گئے سندیسے مردہ ہونے والوں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں صابر؟"

"یہ ان کا عقیدہ ہے.."

"اور ان سندیسوں پر کیا لکھا تھا؟"

"یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا.. ایک پرائیویٹ افیئر تھا.." اس نے اپنے گھونسلا نما بھورے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "نہ میں پڑھ سکتا تھا اور نہ میں نے جاننے کی کوشش کی... اور واپسی پر انہوں نے دریائے برالڈو کے پانیوں کو بوتلوں میں بھرا اور کہنے لگے، ان میں بچھڑ جانے والوں کی مہک ہے.. اور آپ دیکھئے کہ یہ سب کے سب کل شب تک بے حد رنجیدہ اور آزردہ تھے اور اب... بے حد پرسکون اور رنج سے آزاد ہیں.."

میں نے ان سب پر ایک نگاہ کی.. اور واقعی وہ اب نارمل ہو چکے تھے.. اپنا رنج والم پانیوں میں بہا آئے تھے اور نارمل ہو چکے تھے..

جیسے ہم بھی.. پاکستان میں.. اپنی عزیز ترین ہستی.. چاہے وہ ماں ہو.. باپ ہو.. یا بیٹا ہو.. اسے دفن کرنے کے بعد ایک صبر کی کیفیت میں چلے جاتے ہیں.. اطمینان کا سانس لے کر مجبوراً زندگی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

"سنولیک پر خیمے میں لاش"

پچھلے پہر ہم کھرفوچے کی ناممکن بلندی پر گئے..

اس قلعے کے آثار میں چند لمحے گزارے جو بلتستان کی تاریخ میں ایک اہم کردار ہے.. نیچے شیر دریا سندھ بہتا تھا اور اس کی کوئی سرگوشی اس بلندی تک نہ پہنچتی تھی.. اور سکردو شہر کے اوپر بادل تھے جو ایک زائر کی طرح سفید احرام باندھے اس کا طواف کرتے تھے.. اور چوٹیوں پر برف تھی اور بہت تھی..

اس شام.. کے ٹو موٹل میں یوسف آیا..

اسے سکردو میں ہماری موجودگی کی خبر مل گئی تھی.. اور وہ عباس کے ہمراہ... اپنے اُس سُسر کے ہمراہ جو سکردو چوک میں جوتے گانٹھتا تھا اور سنولیک ٹریک کے دوران سب سے زیادہ ہمدرد.. اپنے ناتواں داماد یوسف سے کہیں زیادہ ہمدرد شخص ثابت ہوا تھا... کے ٹو موٹل میں.. ہمارے کمرے میں آیا تھا۔

اگرچہ یوسف نے سنولیک اور بیافو ہسپر ٹریک کے دوران ہمیں بہت خجل خوار کیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہماری مہم جوئی کی تاریخ کا ایک کردار بن چکا تھا..

مجھے دیکھ کر وہ بہت جذباتی ہو گیا۔ "صاحب آپ ہم سے ابھی تک ناراض تو نہیں؟"

"یوسف.. تم ہمیں دنیا کے طویل ترین برفانی وجود کے پار لے کر گئے تھے.. یہ الگ بات کہ اس میں تمہارا کوئی کمال نہ تھا۔ اگر ہم تمہارے بغیر بھی چلے جاتے تو یقیناً زیادہ سہولت اور کم خرچے سے پار چلے جاتے.. اور تم بھی ہمارے سہارے ہی پار اترے ورنہ شیفون کی بلندی پر تم میرا سہارا نہ لیتے تو خرچ ہو جاتے.. اور اس کے باوجود ہم سب اس دنیا کے مشکل ترین ٹریک کے پار گئے تھے.."

"صاحب، میں آپ لوگوں کو بہت یاد کرتا ہوں.." یوسف نے حسب عادت ایک لمبا سوٹا لگا کر اپنے سگریٹ کو ادھ موا کر دیا..

"ہم بھی تمہیں یاد کرتے ہیں.. یوسف.." سلمان نے ذرا لچک کر سنولیک ٹریک کا منظر نامہ پیش کرنے کی کوشش کی اور ہنسنے لگا۔ "یوسف ہمارے علاوہ بھی کسی اور کو سنولیک کی طرف لے کر گئے ہو کہ نہیں؟"

"ہاں صاحب.. لے کر گیا تھا.." یوسف اگرچہ پہلے بھی ناتوانی کی آخری حدوں پر تھا لیکن اب اس حد سے بھی گزر چکا تھا اور نہایت دگرگوں حالت میں تھا۔ "صاحب.. آپ معلوم نہیں یقین کرتے ہیں کہ نہیں.. لیکن اس برس.. دو مہینے پہلے.. میں ایک مہم لے کر ادھر گیا تھا.. میں نے انہیں بتایا کہ میں تارڑ صاحب کو لے کر گیا تھا لیکن وہ گورا نامراد آپ کو نہیں جانتا تھا تو انہیں لے کر سنولیک پر پہنچا ہے تو پورا لیک میں سینکڑوں دراڑ کا۔ حرامی دراڑ کا منہ کھلا ہے.."

"سنولیک پر جب ہم پہنچے تھے تو وہ ایک فٹ بال گراؤنڈ کی طرح ہموار تھی.. ایک برف کا میدان تھا.. ایک بھی دراڑ نہ تھی.. جہاں ہم نے شکرانے کے نفل ادا کیے تھے۔"

"ہاں صاحب.. جب آپ لوگ کے ساتھ گیا تھا تو سنولیک پر جو برف تھی.. ہموار میدان تھا.. لیکن اس برس صاحب ادھر دھوپ بہت تیز تھی.. گرمی بہت تھی.. اور ادھر ہر جگہ دراڑیں اور کھائیاں تھیں.. میں تین گوریوں کو اور تین گوروں کو لے کر ادھر گیا.. تو سب سے آگے جو گورا تھا، اسے میں نے کہا کہ صاحب آرام سے

چلو... دراڑ آتا ہے تو اسے حساب سے پار کرو.. صاحب اس گورے کا حساب کمزور تھا.. دراڑ میں گر گیا.."

"سنولیک پر ایک گورا دراڑ میں گر گیا؟" خالد نے یکدم چونک کر کہا..

"ہاں صاحب.. ادھر آپ بے خوف چلتا تھا، میدان کے موافق.. ادھر گورا گر گیا.."

"کیسے گر گیا؟"

کے ٹو موٹل کے کمرہ نمبر دس میں.. سنولیک کا بھوت.. اگرچہ ناتواں بھوت یوسف تھا... "صاحب ایسا ہوا کہ ادھر تو سینکڑوں کریوس تھا.. اور انہیں جیسے آپ پار کرتا تھا ویسے گورا پار کرتا تھا.. چھلانگ لگا کر دوسری طرف جاتا تھا.. تو ایک بار جو چھلانگ لگایا ہے تو دوسری طرف اس کا بوٹ تھوڑا پھسلا ہے تو وہ کریوس کے اندر گر گیا.. ابھی نظر آتا ہے، ابھی گورا حرامی غائب ہو جاتا ہے.."

"گورا حرامی بالکل غائب ہو جاتا ہے.." سلمان نے لرزتے ہوئے کہا..

"ہاں صاحب.. وہ گرا تو اس کے ساتھیوں نے فوراً رسّہ لگا کر نیچے کریوس میں اترا.. اسے باندھ کر اوپر لایا.. پر صاحب گرنے سے اسے چوٹ لگا۔ ہڈی پسلی چور ہوا اور پھر برف میں بہت ٹھنڈا ہوا تو اوپر لایا.. تو کچھ سانس آیا اور پھر نہیں آیا اور وہ مردہ ہو گیا۔ اب وہ سنولیک پر مردہ ہو جاتا ہے گورا حرامی تو اس کی لاش کا کیا کرے گا.. اٹھا کر واپس اسکولے نہیں آسکتا.. ادھر ہیلی کوپٹر بھی نہیں آتا.. تو ہم نے اسے ادھر چھوڑ دیا۔"

"کیسے چھوڑ دیا یوسف.." سلمان کے تنومند بدن میں تشویش کی ایک چربی بھری لہر دوڑ گئی.. وہ سنولیک کے پار جا چکا تھا لیکن اب ہراساں ہو رہا تھا کہ میں کیسے اس کے پار گیا..

"صاحب.. ہم نے یہ کیا.. کہ سنولیک پر ایک ٹینٹ لگایا.. اس کے اندر

گورے کی لاش کو ایک سلیپنگ بیگ میں رکھا اور زِپ کو ڈاؤن کیا.. اسے ادھر چھوڑا.. سات دن میں سکردو واپس پہنچا.. سات دن میں ہیلی کا بندوبست کیا، اس کے گورا ساتھیوں نے.. اور پھر اس کی لاش کو اٹھا کر ادھر لایا..“

ہر شخص، موت کو.. کسی اور شخص کی موت سمجھتا ہے..

وہ سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ ایک آخری حقیقت ہے کہ.. بالآخر کہیں نہ کہیں.. وہ ہمیشہ کے لیے سرد ہو گا.. تالو میں زردی کے رنگ لیے.. پھٹکری سے بھی کہیں بڑھ کر زرد ہو گا..

اور میں نے اس لمحے خیال کیا کہ جب ہم سنولیک کی عظیم وسعت پر بے خطر چلتے جاتے تھے .. تو وہاں اس کی منجمد کائنات کے پھیلاؤ کے درمیان اگر مجھے ایک تنہا... نیلا، پیلا.. یا سرخ رنگ کا ایک خیمہ ایستادہ دکھائی دیتا.. اس کی بے پناہ سفید دنیا میں کوئی ایک رنگ کا پرندہ.. ایک خیمہ دکھائی دے جاتا تو میں یقیناً نہایت اشتیاق سے اس کی جانب بڑھتا اور قریب پہنچ کر اس کی زِپ کھول کر کہتا۔ ”اندر کوئی ہے؟“

اور جب اندر سے کوئی جواب نہ آتا..

تو میں کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد یقیناً اس کے اندر جھانکتا.. اور اندر ایک سلیپنگ بیگ میں ایک منجمد اکڑی ہوئی لاش ہوتی.. تو میرا ردِّعمل کیا ہوتا..

میرا خیال ہے.. میں حواس کھو بیٹھتا..

اس برف سفید جھیل پر.. جہاں میں نے بادبانی کشتیوں کو سرکتے دیکھا تھا وہاں... ایک خیمے کے اندر اگر میں ایک اکڑی ہوئی کسی کوہ نورد کی لاش دیکھ لیتا تو حواس کھو بیٹھتا..

لیکن.. ہمیں.. سکردو موٹل کی آسائش میں.. اس خیال نے بے حد طمانیت دی کہ جہاں اس بے چہرہ گورے کی لاش تھی، وہاں سے ہم زندہ سلامت گزر گئے تھے۔ ہماری کشتی کسی بھنور میں ڈوبے بغیر پار چلی گئی تھی۔

ایک انسان کتنا کمینہ، کتنا خود غرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی عافیت پر ڈفلیاں بجاتا ہے اور کسی دوسرے کی موت پر بظاہر رنجیدہ ہوتا ہے لیکن اندر سے بے حد خوش ہوتا ہے کہ شکر ہے.. یہ میں نہ تھا۔

چنگیزی نے مجھے بتایا تھا۔ سنولیک پر اس حادثے کے بعد یوسف کئی روز تک بخار میں پھنکتا رہا تھا.. سو نہیں سکا تھا کیونکہ وہ خواب دیکھتا تھا کہ وہ گورا دراڑ میں سے باہر آتا تھا اور یوسف کے سامنے کھڑے ہو کر انگریزی گانے گاتا تھا اور یوسف صرف اس لیے اپ سیٹ نہیں ہوتا تھا کہ اسے انگریزی گانے سمجھ نہیں آتے تھے بلکہ اس لیے ہراساں ہوتا تھا کہ کہیں زندگی بھر اس گورے کی روح اس کا پیچھا نہ کرے.. اور اگر وہ روح گٹار تھامے زندگی بھر انگریزی گانے گاتی تو بیچارے یوسف کا کیا ہو گا.. سوائے سوہانِ روح کے اور کیا ہو گا..

یوسف چلا گیا..

لیکن اس رات جب میں نے سونے کی کوشش کی تو میرے کمرہ نمبر دس میں نہ کوئی پھول تھا.. نہ کوئی ریچھ اور نہ کوئی بادل تھا۔

صرف سنولیک کی سفید عریاں سفید وسعت میں بھڑکیلے سرخ رنگ کا ایک خیمہ نصب تھا.. جیسے لامتناعی سمندروں میں ایک چھوٹی سی.. ماچس کی ایک تیلی جتنی سرخ بادبان والی ایک کشتی..

خیمے کی زپ ڈاؤن تھی۔

اور میں قریب جا کر پوچھتا تھا کہ اندر کوئی ہے؟

اور اندر سے کوئی جواب نہ آتا تھا..

”دیوسائی کی برفیں پگھلتی نہ تھیں“

اور ہم انتظار کرتے رہے..

سکردو میں باہر سے جو چھوٹی سی پگڈنڈی بھی اترتی تھی، وہ بھی بارشوں کی وجہ سے بلاک ہو چکی تھی..

دیوسائی برف میں دفن تھا.. صرف ایک کڑاکے کی دھوپ اسے پگھلا سکتی تھی.. لیکن بارش رکتی نہ تھی، بادل چھٹتے نہ تھے..

ہم چنگیزی کے مشورے کے مطابق انتظار کرتے رہے.. زوہ کا گوشت کھاتے رہے.. خشک خوبانیاں بمشکل حلق سے اتارتے رہے.. پی سی او سے لاہور بیگم کو فون کرتے رہے کہ ہم ابھی تک سکردو میں بیٹھے ہیں اور کتنی پر لطف بات ہے کہ تم میری گوشمالی کرنے کے لیے بھی سکردو تک نہیں پہنچ سکتیں کیونکہ تمام راستے بند ہیں..

اور ہم موٹل کے ڈائننگ روم میں چار ناشتے منگوا کر آٹھ افراد شیئر کرتے رہے اور انتظار کرتے رہے.. اس انتظار میں عارف اسلم سے رابطہ ہو گیا..

عارف... شنگریلا چین آف ہوٹلز کا باس ہے اور میں اسے ایک عرصے سے جانتا ہوں..

”آپ اُدھر بیٹھے کیا کر رہے ہیں.. ادھر شنگریلا آ جائیں..“

چنانچہ اس شب میں مین میڈ ہیون آن ارتھ... شنگریلا میں تھا..

”میرے مارخور فوت ہو گئے ہیں۔“ عارف بے حد رنجیدہ تھا اور کف افسوس ملتا تھا۔ ”ان کے بغیر زندگی بے حد اداس اور ویران ہو گئی ہے۔“

”مزید مارخور مہیا نہیں ہو سکتے...؟“

”پلے پلائے مارخور درکار نہیں.. اب کہاں سے ان کے بچے حاصل کریں، انہیں فیڈر سے دودھ پلائیں اور بڑے کریں.. میں نے سوچا ہے اس ہوٹل بزنس میں اب زیادہ کشش نہیں، میں اب آلو اُگانا چاہتا ہوں، زعفران کاشت کرنے کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔“

سیب کے درختوں تلے گھاس پر ان سیبوں کے ڈھیر تھے جو پچھلی رات کی بارش اور تیز ہوا سے اپنی ڈالیوں سے جدا ہوئے تھے..

عارف نے ایک نائب کو طلب کیا۔ ”گھاس پر گرے ہوئے سیب بُرے لگتے ہیں.. انہیں اٹھالو۔“

”نہیں یہ سیب یہاں اچھے لگتے ہیں..“ میں نے درخواست گزاری۔ ”سیب کے درخت تلے یہ نیم سرخ اور سفید پھل گھاس پر پڑے بھلے لگتے ہیں.. اور درخت کو معنویت دیتے ہیں.. پلیز انہیں یہیں رہنے دو۔“

”درخت کو معنویت دیتے ہیں؟“ عارف ذرا حیران ہوا۔ ”ٹھیک ہے.. انہیں یہیں رہنے دو.. اور سنو۔“ وہ اپنے نائب سے پھر مخاطب ہوا۔ ”ہم ان سیبوں کا کیا کرتے ہیں؟“

”صاحب انہیں گھوڑوں کو کھلا دیتے ہیں.. گھوڑا لوگ انہیں پسند کرتے ہیں۔“

”ایک گھوڑے کو اور کیا چاہیے..“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”اگرچہ میں گھوڑا نہیں ہوں لیکن اس کے باوجود کچورا جھیل کے ان سیبوں کو کچر کچر جگالی کرتے ہوئے کھانا اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔“

عارف کے ذاتی کمرے میں ایک میز پر نہ صرف کچورا کے سیب سجے تھے.. بلکہ آڑو بھی تھے، اور سٹرابری کی رس بھری رعنائی بھی تھی۔ لیکن میری مرغوب چیریاں نہ تھیں جن کا موسم گزر چکا تھا..

کچورا جھیل کے عین وسط میں ایک واٹر جیٹ... پانی کا ایک تیز دھارا بلند ہوتا تھا، آسمان کو چھونے کی نیت سے اٹھتا تھا اور راستے میں دم توڑ کر جھیل میں گر جاتا تھا.. ایک سفید آبشار جھیل جنیوا کے کناروں سے بھی اٹھتی تھی.. مدتوں پہلے شائد کسی اور جنم میں جب میں پہلی بار سوئٹزرلینڈ گیا تھا، جنیوا کے اوپر ایک پہاڑی پر خیمہ لگایا تھا تو کیمپنگ کے کیفے کے کھلے صحن میں بیٹھے ہوئے بھی وہ بلند فوارہ رات کے وقت نظر آتا تھا.. کیفے سے پرے ایک جنگل کے کناروں سے جھانکنے پر بھی وہ جھیل میں سے بلند ہوتا دکھائی دیتا تھا اور دور سے ہم تک پہنچنے والی موسیقی کی ایک دُھن پر کان لگائے روتھ کہتی تھی، تمہیں والز کے سٹیپس بھی نہیں آتے.. بہت آسان ہیں.. ایک دو تین اور.. بس گھوم جاؤ.. شائد کسی اور جنم میں یہ ہوا تھا..

اور یہ اِس جنم کی بات ہے جب میں مے خانۂ شمال کی تُند شرابوں کا رسیا ہوا تھا... شاہ گوری اور جھیل کرومبر کے عشقِ خاص میں مبتلا ہوا تھا.. ایسے کہ اس کے برفیلے ہونٹ میری عمر کی دراڑوں کو بھرتے تھے اور اس کے پانی میرے پژمردہ بدن کو نئی زندگی دیتے تھے.. وہ ایک پھول کہاں ہے.. ایک ریچھ اور ایک بادل کہاں ہے جن کے لیے میں یہاں آیا تھا..

دیوسائی کی برفیں پگھلتی کیوں نہیں..

"اور.. دیوسائی کی برفیں پگھل رہی ہیں"

"دیوسائی کی برفیں پگھل رہی ہیں.." ایک دور کی آواز نے کہا..

اور وہ آواز قریب آ گئی...

اور اس نے پھر کہا۔ "دھوپ نکل آئی ہے.. دیوسائی پر برف پگھلنے لگی ہے.."

چنانچہ غدر برپا ہو گیا..

اور یہ غدر کیا ہوتا ہے..

اسلام آباد میں ایک نہایت پسندیدہ بُک سٹور ہے... مسٹر بکس.. اور اس کے کاؤنٹر کے پیچھے ایک نہایت بے چین طبیعت اور خوش شکل نوجوان ہے۔ کبھی سندھی ٹوپی میں، کبھی سنہری عینک لگائے.. آج باریش تو کل صفاچٹ.. لیکن ہمیشہ مسکراتا ہوا اور اس کا نام یوسف ہے.. میں اسے اپنا بھائی کہتا ہوں اور وہ مجھے برادر یوسف کہتا ہے.. تو جب کبھی وہ کسی حسن کا کسی دل نشین کا تذکرہ کرنا چاہے اور اس کی توصیف کے لیے اسے لفظ نہ ملیں تو کہتا ہے.. بس تارڑ صاحب.. وہ خاتون تو.. بس غدر ہے..

اور اس غدر میں ہر شے سے بغاوت ہی بغاوت ہوتی ہے.. بدن کے نشیب و فراز سے بھی اور حسن کی دل کشی سے بھی..

میری کسی کتاب کی تعریف کرے گا تو بھی کہے گا کہ واہ... کیا کتاب لکھی ہے، بس غدر ہے.. اور زندگی سے رنجیدہ ہو گا تو اداس ہو کر یہی کہے گا.. تارڑ صاحب.. یہ

زندگی بھی تو... بس غدر ہے..

چنانچہ.. جب کسی دور کی آواز نے اطلاع دی کہ دیوسائی کی برفیں پگھل رہی ہیں تو کے ٹو موٹل کے کمرہ نمبر دس میں اسی قسم کا غدر برپا ہو گیا..

پورٹر.. گائڈ.. باورچی.. ہر شکل اور ہر نوعیت کے بلتی چہرے اور سامان کے انبار... خوراک کی خصوصی ذمہ داری سلمان کے سپرد تھی اور وہ ہمارے بجٹ کا نصف حصہ اپنی مرغوب لذّتوں کے حصول پر خرچ کر چکا تھا.. اور میں ذرا غصے میں تھا.. اب سوپ کے پیکٹ، پنیر، مچھلی کے ٹن.. قورمہ اور بریانی کے ڈبے.. کریکرز۔ ٹافیاں، بسکٹ۔ پنجاب آٹا نمبر ون اور گارڈ چاول کے تھیلے تو ہو گئے لیکن... "یہ کیا ہے؟"

"سر یہ دیسی گھی ہے صرف ایک کلو.. ذرا پراٹھے پکائیں گے تو ان کی مہک سے دیوسائی کے ریچھ بھی پاگل ہو جائیں گے.."

"اور یہ..."

"یہ تو تھوڑی سی دیسی شکر ہے سر... گرم گرم سویّوں پر ڈالیں گے اور یہ پگھلے گی تو سر جی سواد آ جائے گا.."

گویا سویّاں بھی تھیں..

"اور یہ کیا ہے سلمان؟"

"یہ تو پِی نٹ بٹر ہے سر جی.. سنا ہے بلندی پر پِی نٹ بٹر کے سینڈوچ بہت مقوی اور کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔"

"اور یہ پوٹلی..."

"سر یہ تو... سُوجی ہے تھوڑی سی.. دیسی گھی کے ساتھ جب سُوجی کا حلوہ تیار ہو گا تو اس کی خوشبو سے..."

"دیوسائی کے ریچھ پاگل ہو جائیں گے؟"

"بالکل سر..."

"سلمان ہم دیوسائی کے ریچھوں کو پاگل کرنے کے لیے گھر سے نکلے ہیں... اتنی فضول خرچی..." میں ذرا تاؤ میں آ گیا.. اس نے خوراک کی خریداری میں نہایت غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا تھا.. اگرچہ مجھے شک تھا کہ خالد ندیم بھی اس سازش میں ملوّث تھا..

"سر جی آپ ذرا اپنی خوراکوں کے بارے میں بھی تو غور کیجیے.. پنیر کے ڈبّے.. اور یہ بدبودار مچھلی...... وغیرہ کے تو آپ ہی شوقین ہیں.. ٹریک کے دوران کوئی اور تو ان بدمزہ چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتا اور جب ٹریک کا اختتام ہوتا ہے تو باقی ماندہ ڈبّے آپ ہی تو گھر لے جاتے ہیں.. اور ہماری سویّوں اور تھوڑے سے دیسی گھی پر اعتراض ہے..."

اگرچہ وہ بدتمیزی کر رہا تھا لیکن میرے پاس کوئی مناسب دفاع نہ تھا... وہ سچ کہہ رہا تھا.. میں نے فوراً یہ نازک موضوع بدل کر گرج کر کہا۔ "اور... بہر حال... اب یہ حسن صاحب کہاں ہیں؟"

"سر، حسن صاحب ذرا شہر گئے ہیں۔ پی سی او تک.. اپنی بیگم کو فون کرنے..."

"لیکن انہوں نے تو ابھی تین گھنٹے پہلے لاہور بات کی تھی۔ اپنی بیگم کے ساتھ.. خاصی تفصیل کے ساتھ.."

"جانے لگے تو میں نے بھی یہی کہا تھا تو وہ کہنے لگے، سلمان تین چار گھنٹے بہت طویل وقفہ ہے۔ میری بیگم کو اگر وقفے وقفے سے میری خیریت کی اطلاع نہ پہنچے تو وہ خصوصی ہیلی کاپٹر کرائے پر حاصل کر کے سکردو پہنچ جائیں گی۔"

حسن، پہلی بار ہمارے ساتھ آئے تھے۔ ایک بینکر تھے، نہایت نفیس، صاف ستھرے، بھولے بھالے... سفید بالوں کے باوجود ایک معصوم سکول بوائے کی چارم رکھتے تھے.. نیکر خریدتے ہوئے بھی اس وسوسے میں مبتلا ہو جاتے کہ پتہ نہیں بیگم کو یہ رنگ پسند بھی ہے یا نہیں.. یعنی اپنی نیکر خریدتے ہوئے..

"اور انصاری کہاں ہے؟"

"سر وہ غسل خانے میں.. گا رہا ہے۔"

"مجھے پہلے سے شک تھا۔"

انصاری کے بارے میں مجھے پہلے سے شک اس لیے تھا کہ اس کی حسِ مزاح ایک ایسے اعلیٰ درجے کی تھی جس درجے تک صرف "خاندانی" لوگ ہی پہنچتے ہیں.. اور یہ رتبۂ بلند صرف ورثے میں ہی ملتا ہے..

"جی تو کون کون کتنا سامان اٹھائے گا.."

میں نے سب پر نظر ڈالی.. یہ طے کر لینا اس لئے ضروری تھا تاکہ پورٹروں کی تعداد کا تعین کیا جا سکے.. پچھلے ٹریکس میں مہم کا دیگر سامان پورٹر اٹھاتے تھے اور ممبر اپنا ذاتی سامان اپنی اپنی پشت پر بوجھ کر کے چلتے تھے.. سوائے میرے... میں صرف ٹوٹل پورا کرنے کی غرض سے ایک چھوٹا سا رُک سیک اٹھاتا تھا اور وہ بھی سفر کے دوران نظر بچا کے کسی پورٹر کے حوالے کر دیتا تھا..

"میں تو جناب عالی کچھ نہیں اٹھاؤں گا.. میں اس پوزیشن میں ہی نہیں ہوں.." میاں صاحب عینک درست کرتے ہوئے بولے.. اور وہ درست کہتے تھے.. وہ پوزیشن میں اس لیے نہیں تھے کہ ان کے پاؤں کسی بیماری کی وجہ سے کچھ عرصہ پیشتر اتنے سُوج گئے تھے کہ وہ آسانی سے چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ پہاڑوں کے پاگل پن میں ہمارے ساتھ چلے آئے تھے۔

"آپ نے یہاں آنے سے پہلے اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کیا تھا......؟"

"میں جناب تارڑ صاحب ڈاکٹر کے پاس مشورہ کرنے چلا جاتا ناں تو اس نامہ نیم نے کہنا تھا کہ مت جاؤ.. اس لیے میں گیا ہی نہیں۔"

چنانچہ پورٹروں کے اٹھانے والا سامان کچھ زیادہ ہو گیا اور علی احتجاج کر رہا تھا کہ صاحب سات پورٹر تو کم ہیں..

عباس... سنو لیک ٹریک میں ایک ہمدرد ساتھی ثابت ہوا تھا.. وہ اس وقت کمرے میں بیٹھا ہر ایک کے بوٹوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا تاکہ انہیں گانٹھ سکے اور مسلسل اپنی بڑی ہوئی وحشی داڑھی کھجا رہا تھا..

"عباس تم فوراً جا کر شیو کروا کے آؤ.."

"اچھا صاحب.." وہ کمرے سے نکل گیا..

"صاحب.." علی میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ "یہ جو عباس ہے، یہ تو موچی ہے اور صدپارہ کا رہنے والا نہیں.. اسے ساتھ نہ لے جاؤ.. ایک اور پورٹر ہے بہت اچھا.."

"نہیں.." سلمان نے سختی سے کہا۔ "عباس ہمارا دوست ہے.. وہ ہمارے ساتھ جائے گا.. اگر ہمارے بوٹ ٹوٹ گئے تو کون مرمت کرے گا، تم"

"ہم تو بکرا حلال کر سکتا ہے صاحب، بوٹ تو موچی لوگ بناتا ہے۔" علی نے کھسیانے ہو کر کہا..

"تو پھر...."

میں کمرے سے باہر آ گیا..

وادیٔ سکردو کے ایک گھاؤ میں بہت سے بادل ہجوم کرتے تھے اور ان کے اندر کہیں جھیل صدپارہ تھی، دیوسائی تھا... ایک پھول تھا، ایک ریچھ تھا، ایک بادل تھا!

”جھیل صدپارہ اس بار بھی مختلف تھی“

کسی بھی ایک جھیل کو زندگی میں کتنی بار دیکھا جا سکتا ہے؟

جب کسی اونچائی پر پہنچ کر اس کی پہلی جھلک دکھائی دیتی ہے تو آپ کے لیے وہ مانوس جھلک ہوتی ہے.. آپ پہلے سے جانتے ہیں کہ ڈھلتی دوپہر میں جو پانی پھیلاؤ میں ہوں گے، ان میں شفافی اور نیلاہٹ کی ایک عجیب شیشہ گری ہو گی.. اس کے کناروں پر جو ہوٹل ہے، وہاں سیاح جھیل سے لاتعلق فرنچ فرائز اور تلی ہوئی ٹراؤٹ کے منتظر ہوں گے.. تو وہ جھیل کتنی بار دیکھی جا سکتی ہے..

جھیل صدپارہ کو میں نے کئی بار دیکھا تھا..

جیسے میں نے شالیمار باغ اور کامران کی بارہ دری کو کئی بار دیکھا تھا.. لیکن کوئی ایک عمارت چاہے وہ شالیمار ہی کیوں نہ ہو، سنگ و خشت میں قید اور جامد ہوتی ہے لیکن ایک جھیل کی بناوٹ میں جتنے پانی ہوتے ہیں، وہ حرکت میں رہتے ہیں اور ان کی شباہت موسموں اور اس میں اچھلنے والی مچھلیوں کے دائروں سے بدلتی رہتی ہے..

اسی لیے ہر جھیل.. ہر بار مختلف ہوتی ہے..

جھیل صدپارہ اس بار بھی مختلف تھی..

میں نے آج تک کسی بھی ایسے ٹریک کا آغاز نہیں کیا تھا جس کے پہلے روز تنہائی اور دور افتادگی نہ ہو.. لیکن آج ہم ایک شہر میں چلے جا رہے تھے، بجلی کے کھمبوں، تیز رفتار جیپوں اور پر آسائش گھروں کی رفاقت آس پاس تھی اور ہم کچھ کچھ بے وقوف سے محسوس کر رہے تھے کہ یہ کس قسم کی ٹریکنگ ہے..

آج ہم سلمان اینڈ کمپنی کو پورٹروں کے بوجھ کے مسائل حل کرنے کے لیے موٹل میں چھوڑ آئے تھے اور خود راہ فرار اختیار کرتے ہوئے میں اور میاں صاحب اس پکّی تارکول کی سڑک پر چلتے جا رہے تھے جو صدپارہ کو جاتی تھی.. بقیہ ٹیم نے بعد میں چلنا تھا..

ہم چلتے جا رہے تھے..

تب ہمارے پہلو میں ایک پیلی ٹیکسی رکی۔ ”صاحب اوپر جائے گا؟“

”کہاں تک جائے گا؟“

”جہاں تک سڑک جاتی ہے...“

”صدپارہ جھیل نہیں جائے گا؟“

”صدپارہ تو ٹیکسی نہیں جاتی، جیپ جاتی ہے اور وہ بھی نہیں جاتی، آگے روڈ بلاک ہے..“

”تو کدھر لے جائے گا؟“

”بولا تو ہے جہاں تک روڈ جاتا ہے..“

”کتنے پیسے؟“

"بیس روپے...."

اور ہم قطعی طور پر بغیر شرمندگی کے اس ٹیکسی میں براجمان ہو گئے.. اگرچہ ٹریک کے پہلے دن ٹیکسی میں سوار ہو کر ٹریک کرنا ایک ٹریکر کے لیے باقاعدہ ڈوب مرنے کا مقام تھا..

ٹیکسی ہمیں سکردو شہر کے آخر میں جہاں ایک سکول تھا، وہاں تک لے گئی..

اور اس کے آگے جھیل کو جانے والا کچا راستہ تھا جس سے ہم بخوبی واقف تھے..

ہم پھر سے چلنے لگے..

"تارڑ صاحب... کسی کو یہ نہیں بتانا کہ ہم نے نصف راستہ ٹیکسی میں طے کیا تھا، خواہ مخواہ نموشی ہو جائے گی.." میاں صاحب نے مشورہ دیا..

"یہ نموشی کیا ہوتی ہے؟"

"یہ جب ہو جاتی ہے تب پتہ چلتا ہے کہ کیا ہوتی ہے.."

صدپارہ روڈ پر گری ہوئی چٹانوں کو صاف کیا جا رہا تھا.... اور روڈ ٹریفک کے لیے کھول دی گئی تھی..

اور ایک مرتبہ پھر جب جھیل صدپارہ نظر کے سامنے آئی تو ایک ایسی تصویر نظر آئی جو کسی کیمرے کے بس کی بات نہیں تھی.. کسی بھی مصور کے کسب کمال سے باہر تھی.. اسے لمحۂ موجود میں دیکھنا گویا لمحۂ ہمیشگی میں دیکھنا تھا..

وہ ایسے رنگوں میں رنگی جاتی تھی جو خواجہ فرید کی روہی میں بھی کبھی نمودار نہ ہوتے ہوں گے.. وارث شاہ کی ہیر کے سراپے میں... سیبوں کی صورت، رواں پھلیوں کی شکل میں، پیکنگ کی تتلی کی شباہت میں بھی نظر نہ آئے ہوں گے..

جو رنگ ہمیں نظر آئے..

سکوت.. گہرا نیلگوں سکوت.. مچھلیوں کے اچھلنے سے دائرے جنم لیتے تھے اور اس کے پانیوں کی شفافی میں ہمیں کائی زدہ پتھر دور تک اترتے دکھائی دیتے تھے..

ہم بہت دیر تک اس کے کناروں پر بیٹھے جھیل کی تہہ کو گھورتے رہے..

تہہ میں کیا ہو گا؟

ایک بھید بھری.. مہک سے بھری خاموشی..

اپنے ساتھیوں کا انتظار کرتے رہے..

شام ہونے لگی... جھیل پر آئے ہوئے لوگ سکردو لوٹنے لگے..

پھر میری ٹیم کے ممبر آہستہ آہستہ، درماندہ، تھکے ہوئے ہم تک پہنچنے لگے..

ہم دونوں ترو تازہ تھے.. ہم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ ہماری ترو تازگی ٹیکسی رائڈ کی وجہ سے تھی اور وہ پیدل آئے تھے.. بتا دیتے تو نموشی ہو جاتی..

پورٹر بھی سامان سمیت پہنچ گئے.. اب ہمیں آگے جانا تھا.. دیوسائی کے راستے میں کہیں رات کرنی تھی..

صدپارہ... ڈھلتی شام میں.. ایک ایسی جھیل تھی جسے ہم پہلی بار دیکھ رہے تھے..

پہلی محبت کی طرح.. پہلے بوسے کی طرح... وہ گیلی اور نیلگوں تھی..

”جگنو کی روشنی تھی کاشانۂ صدپارہ میں“

”ابے یہ صدپارہ کیمپنگ کی رات میں آئے ڈھیروں ٹمٹماتے ہوئے دیئے کس نے چھوڑ دیئے انصاری..“ سلمان کی آواز آئی۔

”ابے آنکھیں چیک کروا.. دیئے نہیں موم بتیاں جلے ہیں عقل کے اندھے..“ یہ انصاری تھا۔

”اماں میں اندھا ہوتا تو مجھے دیئے دکھائی دیتے؟“

”ساون کے اندھے کو ہر طرف دیئے ہی نظر آتے ہیں اور تجھے تو لوگ بعد میں گھر چھوڑنے بھی جاتے ہیں گھامڑ...“

لگتا تھا کہ سلمان اور انصاری دیوسائی کے ٹریک پر نہیں آئے، کسی شادی میں جگتیں کرنے کے لیے آئے ہیں..

”سلمان..“ میں نے اپنے خیمے میں سے پکارا..

”حاضر جناب سر...“

”ابے ایک تو تم ٹیم کے خرچے پہ دیسی گھی اور پی نٹ بٹر فضول میں خرید لائے ہو اور اب بکواس کرتے ہو.“ میں نے بھی اسی انداز میں سرزنش کی۔

”سر جی آپ ذرا اپنے پھوکوّے خیمے میں سے باہر جھانک کر تو دیکھیں، آپ کی سالگرہ کی خوشی میں ایڈوانس چراغاں ہو رہا ہے..“

اور باہر.. کوہ نوردی کی پہلی شب میں... جھیل صدپارہ بہت پیچھے رہ گئی تھی اور ہم دیوسائی کے دامن میں تھے اور وادیٔ صدپارہ کے نالے کی قربت میں خیمہ زن تھے اور اس میں جو اندھیارا پھیلا تھا، اس میں بے شمار جگنو ٹمٹما رہے تھے..

یعنی جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں..

بلکہ کاشانۂ صدپارہ میں..

وہاں جگنو تھے.. ڈھیروں کے حساب سے۔

جگنو اگرچہ گرم حبس بھری راتوں کا پرندہ ہے اور میں اسے کیڑا نہیں کہہ سکتا.. لیکن یہ کیسا معجزہ تھا کہ وہ صدپارہ وادی کی ٹھنڈک بھری شب میں بھی اسی شدت سے ٹمٹماتا تھا جس شدّت سے لاہور شہر کی نہر کے کنارے، درختوں اور جھاڑیوں میں الجھتا ستارے بھرتا تھا..

یہ روشن پلکیں جھپکتی آنکھیں تھیں جو ہمارے خیموں کے آس پاس اور جھاڑیوں میں آہستگی سے جلتی بجھتی اور بجھتی جاتی تھیں، بلند ہوتی تھیں.. گرتی تھیں... ہوا کے دوش پہ پلکیں جھپکتی روشن آنکھیں تیرتی تھیں، تلاش کرتی تھیں.. شائد یہ جگنو بھی کسی کو ٹھہر کے دیکھنا چاہتے تھے.. وہ شکل نظر نہیں آتی تھی تو دھیرے دھیرے اٹھتے جاتے تھے..

ایک تاج محل بیان کیا جا سکتا ہے لیکن ایک جگنو بیان نہیں کیا جا سکتا.. اسے ایک نظم، ایک سوڈو رومینٹک گیت میں استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی آنکھیں مارتی، ظاہر اور اوجھل ہونے کے وقفوں اور فلائٹ کو بیان نہیں کیا جا سکتا..

اسے تو دیکھنا، یقین کرنا ہے..

اور صدپارہ وادی کی شب میں اپنے خیموں پر مدھم لالٹینوں کی صورت ڈولتے اور حرکت کرتے دیکھنا بھی.. یقین کرنا نہیں.. ایسی لالٹین جو نظر نہ آنے والے بونے اٹھائے ہماری خیمہ گاہ میں منڈلاتے تھے..

جگنو کی روشنی تھی کاشانۂ چمن میں...

صدپارہ جھیل سے ہمارے ٹریک کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا.. اور ہم شام ڈھلے وادی کے آغاز تک پہنچے تھے.. سامنے ایک مدھم سروں والی چوڑی ندی تھی اور ہم پار جانے کی بجائے مقامی گندم کے پھول بھرے کھیتوں کے پہلو میں جو ہموار گھاس تھی اور ہماری منتظر تھی وہیں ہم ٹھہر گئے تھے اور خیمہ بستی آباد کر لی تھی..

دیوسائی کو باقاعدہ اٹھنے والی روڈ ایک خشک پہاڑ میں کٹی ہوئی الگ نظر آتی تھی اور ندی کے پار بلند ہو کر ایک موڑ پر اوجھل ہو جاتی تھی۔:

میں خیمے کا پردہ اٹھائے مدھم لالٹینوں کے قافلوں کو تاریکی میں ابھرتے.. بولتے.. چپ ہوتے.. جلتے.. بجھتے اور ڈولتے دیکھ رہا تھا..

"سر جی آپ بولتے نہیں.." سلمان اپنے خیمے کے پردے میں سے سر نکالے دانت نکال رہا تھا۔ "کم از کم میرا تھینک یُو تو کریں... میں خبر نہ کرتا تو آپ نے اپنے کچھوے خیمے میں اونگھتے رہنا تھا.. میں آپ کو اس چراغوں سے بھری شب میں لے آیا ہوں.. اگرچہ ناصر کاظمی نے تو کہا تھا کہ..

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ، اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں..

لیکن سر جی.. تو یہ وادی... بے چراغ نہیں.. شہر کی طرح۔"

سلمان کے سر کے برابر میں اے انصاری کا سر برآمد ہوا اور اس نے اسے دھپ لگا کر کہا۔ "ابے وہ جو شاعر نے شبِ فراق سے کہا تھا ناں کہ تجھے گھر ہی لے چلیں تو یقیناً اسے نہیں کسی اور کو کہا تھا.. شبِ فراق کو گھر لے جا کر ناصر کاظمی نے کیا کرنا تھا اس کے ساتھ۔"

"ابے چل ہٹ.. تو ملتان کا جولاہا تجھے کیا پتہ شاعری کس چڑیا کا نام ہے.."

"اور تو لاہور کا چربی بھرا سانڈھ تو کیا جانے ہم ملتان والے اولیاء ہوتے ہیں۔"

"آہم..." میں نے کھانس کر انصاری کو وارننگ دی۔ "ہم بھی لاہور کے ہوا کرتے ہیں۔"

"سوری سر.." انصاری خیمے میں روپوش ہو گیا..

سلمان نے ٹریک کی منصوبہ بندی کے دوران کہا تھا.. سر جی اس بار میں آپ کے لیے دو بہترین تحفے لایا ہوں.. ان میں سے ایک تحفہ انصاری تھا اور دوسرے حسن صاحب تھے..

حسن صاحب جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، نہایت دھیمے، کم گو اور بھولے سے لوگ تھے.. اور کم از کم میں بہت رشک کرتا تھا کہ وہ ہر وقت اپنی بیگم کی یاد میں لوٹ پوٹ ہوتے رہتے تھے اور آفٹر شیو لگاتے ہوئے بھی کہتے تھے۔ "بیگم نے کہا تھا صرف ایک بار آفٹر شیو لگانا ہے۔ اس طرح مہک دیر تک آتی ہے"..یا.. "بیگم نے کہا تھا کہ کھیتوں میں جاتے ہوئے لوٹے کا وزن زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ پہلے ہی بہت نازک ہیں.."

آئندہ دنوں میں ہم سب کی.. یعنی جن جن کی بیگمیں تھیں، وہ سب کی سب بیک گراؤنڈ میں چلی گئیں اور صرف حسن صاحب کی بیگم پردۂ سیمیں پر جلوہ افروز رہیں.... بلکہ ہم نے "بیگم" کا لفظ ہی ترک کر دیا اور اپنی بیگموں کو بیوی یا منّے کی اماں وغیرہ کہنے لگے.. اگر غلطی سے "بیگم" کا لفظ منہ سے نکل جاتا تو فوراً توبہ تائب ہوتے کہ یہ کیا گستاخی ہو گئی ہے۔ حسن صاحب کی بیگم کا نام لے رہے ہیں... چنانچہ مجھے بہت رشک آتا تھا بلکہ ایک بار جب چھوٹے دیوسائی کی ایک اندھیری شب میں کسی نے پہلے عشق کا سوال کیا.. تو کچھ نے انکار کر دیا.. کچھ نے چھپایا اور حسن صاحب نے بڑی معصومیت سے اقرار کیا کہ بس جی جو پہلا عشق تھا، اب وہی میری بیگم ہیں.. اور ان کے سوا آج تک کسی اور کا خیال نہیں آیا.. اور تب بھی میں نے بہت رشک کیا کہ انہیں کسی

اور کا خیال نہیں آیا اور ایک ہمارا بیہودہ خیال ہے کہ بھٹکتا ہی رہتا ہے..

اور جو تحفہ انصاری تھا.. عمدہ موسیقی کا رسیا.. جوانی کے خوش نما اور تحلیل ہو جانے والے جنوں کی حدت میں سلگتا نوجوان... جو اگر کیمیکل انجینئر نہ بھی ہوتا تو اپنی جگت بازی سے گھر کا خرچ آسان سے چلا سکتا تھا۔

چنانچہ.. جگنو کی روشنی تھی..

خواہش کے تریوی فوارے میں چار خیمے... اور ان کے اندر دیوسائی کو پیدل عبور کرنے کی خواہش میں گم کوہ نورد... کچھ سکے...

اور ان میں.. جو سکہ سب سے قدیم تھا.. جس کے زمانے گزر چکے تھے اور سب سے زیادہ زنگ آلود تھا.. وہ میں تھا۔

مجھ پر تہہ در تہہ زنگ تھا..

کوئی ایک زنگ تھا..

ایک زنگ پچھتاوے کا تھا.. جب میں پی آئی اے کے ایم ڈی کی دعوت پر لاہور سے کراچی گیا تھا اور ایک شب مڈوے ہوٹل کے کمرے میں نعیم بخاری، منو بھائی، نعیم طاہر اور طارق عزیز کے ہمراہ ان کی عمدہ رفاقت.. قہقہوں اور سرخوشی کے کسی خاص لمحے میں گم تھا.. اس لمحے لاہور میں میری ماں کو میرا بیٹا سلجوق کار میں ڈالے ایک ہسپتال کی تلاش میں پوری قوت سے ایکسلریٹر دباتا تھا کہ انہیں.. دل کا کوئی عارضہ نہ تھا، خدشہ نہ تھا.. لیکن میں اس لمحے موجود نہ ہوا تو انہیں ایک بڑا ہارٹ اٹیک ہو گیا اور ان کے پھیپھڑے خون سے بھر گئے اور وہ کار کی پچھلی نشست پر میرے چھوٹے بھائی زبیر کی آغوش میں ہمیشگی کے اندر وہاں تک چلی گئیں جہاں سے واپسی نہیں ہوتی.. سلجوق نے سنا کہ وہ اب قرار میں ہیں، خراٹے لے رہی ہیں اور پھر شائد سو گئی ہیں کہ پچھلی نشست خاموش تھی... اور میں.. اس لمحے کراچی میں تھا اور عمدہ رفاقت کی سرخوشی میں تھا.. زنگ کی ایک تہہ یہ بھی ہے.. میں لاہور واپس آرہا تھا تو

ایئر ہوسٹس نے مجھے بہت خاموش پا کر متعدد بار پوچھا کہ سر.. آپ ٹھیک تو ہیں... اور میں نے صرف اتنا کہا کہ ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں.. آئی ایم سوری.. دراصل ایک عزیز فوت ہو گیا ہے اور وہ کہنے لگی۔ "سر.. کیا کوئی نزدیکی عزیز تھا؟"... میں اسے کیا جواب دیتا کہ کتنا نزدیکی عزیز تھا..

اب مجھے گھر سے نکلتے ہوئے گیٹ میں سے جھانکتے ہوئے دور تک جاتے.. جہاں تک میں نظر آتا تھا.. وہاں تک جاتے کوئی نہیں دیکھتا.. اور نہ کوئی میرے نئے لباس کو دیکھ کر مجھے مبارکباد دیتا ہے.. بس یہ تھوڑی سی کمی آ گئی ہے ماں کے بغیر...

ہم سکردو روڈ پر... بھیگتی چٹانوں کو راستے پر گراتی رات میں جب سفر کرتے تھے تو انصاری نے ٹیپ ریکارڈر پر شاہ حسین کی کافی "مائے نی میں کنوں آکھاں.. درد وچھوڑے دا ایہہ حال نیں.." آن کر دی تو میں نے ایک بول سن کر کہا۔ "اسے بند کر دو پلیز... جن کی مائیں مر چکی ہوں ان کے لیے یہ کافی نہایت مضر ثابت ہوتی ہے۔"

میں ویگن کے اندھیرے میں انصاری کے امڈتے ہوئے آنسو نہ دیکھ پایا.. کیونکہ اس کی ماں کا بھی حال ہی میں انتقال ہوا تھا..

زنگ تہہ در تہہ تھا.. اتنا تھا کہ مجھ پر ایک کھوٹے سکے کا گمان ہوتا تھا..

اور میں تھا بھی ایک کھوٹا سکہ جو... ادب اور ٹیلی ویژن کے بازار میں چل گیا تھا..

شائد مجھ میں شہرت اور مقبولیت نے ایک خاص قسم کی کمینگی اور رعونت کو جنم دیا.. جس کی وجہ سے نہ مجھ سے میری بہنیں خوش تھیں اور نہ میری بیوی بچے.. اگرچہ میں نے اپنے تئیں دل و جان سے بہت کوشش کی کہ میں ایک مناسب بھائی، خاوند یا باپ بن سکوں.. میں نے بہت کوشش کی لیکن میں بری طرح ناکام ہوا.. لیکن جیسے میں اپنی موت کی اٹل حقیقت سے آگاہ ہوں۔ ایسے یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر مجھ میں کمینگی اور رعونت ہے تو شہرت اور مقبولیت اس کا ہرگز سبب نہیں.. میں ہوں ہی ایسا.. مجھے ایسا ہی بنایا گیا تھا.. اور یہ ایک بہانہ ہیں مجھے مطعون کرنے کے لیے.. یہ ہر دو لعنت میرے

نصیب میں نہ ہوتیں تو مجھے یقیناً قبول کر لیا جاتا..

چنانچہ اس حیاتی میں.. مجھ سے نہ اپنے خوش ہوئے اور نہ بیگانے.. اور مجھ پر اتنے زنگ تہہ در تہہ چڑھے کہ میں کھوٹا سکّہ ہو گیا.. خواہش کے تریوی فوارے میں پڑا ایک زنگ آلود کھوٹا سکّہ..

لیکن کبھی کبھار کوئی ایک لمحہ آتا تھا.. جب اس سکّے کا زنگ کہیں کہیں سے اتر جاتا تھا.. اور اس کے نیچے جو تانبہ یا سونا تھا، وہ جھلک دیتا تھا.. دکھائی دینے لگتا تھا.. میں نواں نکور تو نہ ہوتا تھا لیکن ایک مدھم کھنک کا شائبہ ہونے لگتا تھا..

اس لمحے میں.. جب وادیٔ صدپارہ کی گھنی تاریک رات میں جگنو اترتے تھے، جلتے بجھتے تھے تو ان کی ٹھنڈی لو... زنگ کی تہیں اتارتی تھی.. جیسے نیل پانی میں گھلتا ہے.. واٹر کلر تصویر بارش میں بھیگ جائے تو اس کے رنگ بہہ جاتے ہیں... ایسے یہ زنگ تھوڑے اترتے تھے۔

گئی رات میں.. جب صبح قریب ہو رہی تھی.. صدپارہ کی وادی میں یکدم ایک آندھی صفت تیز اور خیموں کو پھڑپھڑانے والی ہوا کا شور برپا ہو گیا.. اور یہ تند ہوائیں دیوسائی سے اتر رہی تھیں.. اور ان کے زور سے ہماری خیمہ گاہ میں ٹھہرے ہوئے جگنوؤں کے قافلے بے اختیار ہو کر منتشر ہو گئے.. صرف تاریکی اور تیز ہوا کا شور گونج میں تھا..

لیکن.. میرا زنگ کہیں کہیں سے اتر گیا تھا..

شائبہ ہونے لگا تھا کہ میں اتنا کھوٹا بھی نہیں ہوں..

کچھ کھرا بھی ہوں..

وادیٔ صدپارہ کی اس شب میں پلکیں جھپکتی روشن آنکھوں کی مدھم لالٹینوں نے مجھے کچھ کھرا کر دیا ہے..

کھوٹے سے کھرا ہونے کے لیے صرف ایک جگنو، ایک لالٹین ہی کافی ہے..

"ہم ایک بھورے عقاب اور رنگین بھنورے سے ملتے ہیں"

ایک بھورے رنگ کا شاندار پرندہ اپنے پَر پھیلائے.. جیسے کلوپیٹرا ہاتھ پھیلائے اپنا لبادہ پھیلاتی ہے، دیوسائی سے اترنے والے تیز دھار نالے کی گھاٹی میں.. ہم سے نیچے.. اتنی آہستہ روی سے اڑان میں تھا جیسے وہ تقریباً سکوت میں ہو.. ایک تصویر ہو جو ٹھہر ٹھہر کر حرکت میں آتی ہو..

"جیپ روکو.." آزمنڈ نے ہاتھ سے اشارہ کیا..

جیپ رک گئی.. دیوسائی کو بلند ہوتی روڈ پر رک گئی.. ہم باہر آ گئے..

"یہ بھورے رنگ کا نایاب عقاب ہے جو دیوسائی سے نیچے آیا ہے۔"

بھورا شاندار پروں اور شان والا عقاب تا دیر گھاٹی میں پرواز کرتا رہا اور پھر نالے کے پار پَر سمیٹ کر ایک چٹان پر اترا اور گردن گھمانے لگا.. اس کی قربت میں ایک اور پرندہ بیٹھا تھا جو اس کا ہم شکل تھا..

"یہ اس کی مادہ ہے.." آزمنڈ ایک عجیب ہیجان میں تھا اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ "تارڑ صاحب یہ عقاب بہت کم نظر آتا ہے.. اسے جی بھر کے دیکھ لیں.."

ہم دیوسائی ٹاپ کے قریب آ چکے تھے اور اسی راستے پر تھے جس پر چند برس

پیشتر میں نے.. سلجوق اور سمیر اور میجر عباسی کے ہمراہ پیدل سفر کیا تھا.. تب یہاں گلیشیئر تھے.. بلند گھاٹیوں پر زرد پھولوں کے ڈنٹھل تھے جو ہوا کے زور سے جھکتے تھے.. لیکن اب وہ گھاٹیاں خالی تھیں..

لیکن تب.. یہ بھورا عقاب نہ تھا.. اور اب تھا..

آج سویرے ہم نے.. صبح سویرے ہم نے.. صدپارہ نالے کے کنارے اپنے خیمے سمیٹے.. اور جب ہم خیمے سمیٹتے تھے تو دن کی روشنی میں شائبہ بھی نہ ہوتا تھا کہ یہاں جگنوؤں کے قافلے اترے تھے.. ہم نے دیوسائی روڈ پر اپنا سفر شروع کیا.. پورٹر آگے نکل گئے اور ہم ہانپتے ہوئے.. ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق.. اپنی ہمت کے حساب سے.. سر جھکائے آگے پیچھے.. مناظر پر لعنت بھیجتا آہستہ آہستہ چلتا جا رہا تھا.. اگرچہ کوئی دشواری کوئی خطرناکی نہ تھی لیکن پہلا دن تھا.. سانسوں کو مشقت کی عادت نہ تھی.. اس لیے ہم ہانپتے چلتے تھے.. خالد ندیم جو عام حالات میں ایک اونٹ کی طرح مٹکتا ہوا چلتا جاتا ہے.. آہستہ آہستہ بہت پیچھے رہ گیا تھا.. اس کے پاؤں جواب دے رہے تھے.. ان میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور وہ لنگڑاتا ہوا بمشکل قدم اٹھاتا تھا۔

میاں صاحب بھی قدرے بے ربط تھے اور پیچھے رہ گئے تھے..

دیوسائی روڈ پر جگہ جگہ مزدور ان پتھروں کو اٹھا رہے تھے جنہوں نے کئی دنوں سے جیپوں کا راستہ روک رکھا تھا۔

ہم وادیٔ صدپارہ میں چل رہے تھے..

سیاح اور کوہ نورد دیوسائی پر پہنچنے کے لیے اس وادی پر نظر نہیں کرتے تھے اور بس گزر جاتے تھے.. جیپوں پر سوار گزر جاتے تھے..

لیکن ہم اس راستے پر پیدل چل رہے تھے، اس لیے دھیرے دھیرے اس وادی کے حسن کا انکشاف ہم پر ہوتا تھا۔ سورج مکھی کی زردی اور کھیتوں کی بے پناہ ہریاول

اور طرح طرح کے پھولوں کے رنگوں میں رنگے متعدد گاؤں نظر آتے تھے.. جو دیوسائی نالے کے پار.. پار ابھرنے اور بلند ہونے والی برفانی چوٹیوں کے سائے میں آباد تھے.. بلند مقام گاؤں.. جیسے مل پن۔ پلولو۔ بڑا گاؤں۔ میر کو.. اور ڈاری جیسے گاؤں جو نالے کے پار چٹانوں کی آغوش میں نظر نواز ہوتے تھے.. دیوسائی روڈ سے نیچے راستے جاتے تھے..

کسی گاؤں کے ایک کسان نے دیوسائی روڈ پر رینگتے چند کوہ نوردوں کو اپنے کھیت یا گھر سے دیکھا اور شہتوت کی ایک مخروطی ٹوکری میں اپنے باغ کی خوبانیاں.. کچی پکی.. بھر کر... ہم تک لے آیا.. یہ خوبانیاں اگرچہ رس بھری اور زرد سورج تو نہ تھیں.. ان کا موسم گزر چکا تھا.. ان میں شگر کی خوبانیوں والی خوبی نہ تھی لیکن.. ان میں بلندی کو سہہ جانے والی قوت کے اجزاء تو تھے..

ایک موڑ آیا.. نالے پر وہ پل نظر آیا.. جہاں تک میں، سمیر اور سلجوق جیپ میں سوار ہو کر آئے تھے اور اسے پار کر کے اپنے ٹریک کا آغاز کیا تھا کہ ان دنوں دیوسائی روڈ ان دنوں کی طرح بلاک نہیں تھی۔

ہم تھکے ہوئے.. دھوپ کی تیزی سے پریشان، پُل پر سے گزر کر پار گئے.. اور دوپہر کے کھانے کے لیے رک گئے۔

پُل کے پار ہم ڈھیر ہو گئے..

اور تب میں نے ملاحظہ کیا کہ سب سے پیچھے رہ جانے والے میاں صاحب اور خالد ندیم ایک کارگو جیپ میں مزے سے ٹھنسے چلے آ رہے ہیں..

"سوری جناب عالی.." میاں صاحب نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ کس نامہ نیم نے کہا ہے کہ دیوسائی پیدل ہی جانا ہے.."

"کسی نامہ نیم نے نہیں کہا.. میاں صاحب آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں.."

"ناراض تو آپ لگتے ہیں کہ آپ پیدل آئے ہو اور ہم جیپ میں سوار ہو کر پہنچ گئے ہیں.. آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں جی، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"نہیں، اگر کوئی اعتراض ہے تو ابھی بتا دیں.. بعد میں خوامخواہ نموشی ہو جائے گی۔"

میاں صاحب بادشاہ آدمی تھے.. پہاڑ گزر جائے پرواہ نہیں کرتے تھے اور کبھی ایک مچھر ان کے خیمے میں گھس جائے تو باہر آ جاتے تھے اور عینک اتار کر کہتے تھے۔

"نہ.. میرے ٹینٹ میں مچھر کس نامہ نیم نے بھیجا ہے۔ ویسے کہہ دو ہم واپس چلے جاتے ہیں.. مچھر کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔"

چنانچہ سب لوگ اپنی ہنسی روکتے ہوئے خاموش رہے کہ نہیں میاں صاحب ہمیں کوئی اعتراض نہیں.. اور دل ہی دل میں خواہش کرتے رہے کہ کاش ہم بھی اتنے نصیب والے ہوں کہ کوئی جیپ نیچے سے آئے اور ہم اس میں سوار ہو کر ٹاپ پر پہنچ جائیں کیونکہ ہم سب خاصے خلاص ہو چکے تھے، لاچار اور نڈھال ہو چکے تھے اور میں جانتا تھا کہ دیوسائی کی اصل چڑھائی تو اب پُل کے پار ہو کر شروع ہو گی اور بلندی بڑھتی جائے گی اور سانس گھٹتا جائے گا..

اور وہ جیپ آ گئی..

میں اسے ہاتھ کے اشارے سے روکنے کو تھا کہ وہ خود ہی رک گئی..

میں نے اندر جھانکا۔ "کیا آپ ہمیں.. یا کم از کم مجھے دیوسائی ٹاپ تک لے جا سکتے ہیں؟"

ڈرائیور کے برابر میں براجمان صاحب کے دانت نمایاں ہو گئے۔ "تارڑ صاحب مجھے سکردو میں ہی خبر ہو گئی تھی کہ آج آپ دیوسائی کے راستے پر ہیں اور میں آپ ہی کو تلاش کر رہا تھا.. آ جائیں!"

"میرے ساتھی بھی آ جائیں؟"

"پچھلے حصے میں آپ کے جتنے ساتھی سما سکتے ہیں، سما جائیں۔"

چنانچہ پچھلے حصے میں بیشتر ساتھی سمٹ سمٹ کے سما گئے..

جیپ میں سوار ہو کر از حد راحت ہوئی اور ہم نے ان بے وقوف کوہ نوردوں کی عقل پہ ماتم کیا جو جیپ کی سہولت کے باوجود پیدل چلتے تھے.. اگرچہ ہم خود اکثر اوقات ایسے ہی بے وقوفوں میں شمار ہوتے تھے..

جیپ نے پہلا گیئر لگایا اور ایک ناتواں بھینسے کی طرح غاں غاں ڈکراتی ہوئی دیوسائی کی چڑھائی چڑھنے لگی..

"اور آپ مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے؟" میں نے صاحبِ جیپ سے سوشل ہونا شروع کیا..

"اگر آپ "نکلے تری تلاش میں" ہو سکتے ہیں تو ہم بھی آپ کی تلاش میں ہو سکتے ہیں.. میرا نام آزمنڈ سلمان ہے اور ہم دیوسائی کے بڑے پانی کے کنارے جنگلی حیات کے بچاؤ کی خاطر ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں... خاص طور پر ریچھوں کو بچانا چاہتے ہیں.."

"سر جی مجھے بھی بچا لیجئے.." جیپ کے پچھلے حصّے سے یہ سلمان کی پکار تھی..

"اس برس آپ کا کیا پروگرام ہے؟" آزمنڈ نے پوچھا.. اور مشکل سے پوچھا کہ جیپ کے دھچکوں میں کسی کو کچھ بھی پوچھنا بہت مشکل تھا..

"میں اس سے پیشتر ایک رات دیوسائی پر بسر کر چکا ہوں.. اس بار خواہش ہے کہ اسے پیدل عبور کیا جائے.. دیوسائی کے پار ہو کر منی مرگ جایا جائے جو عمران خان نے شدید طور پر ریکمنڈ کیا ہے اور اس کے بعد اسی راستے سے واپس..."

"جس قسم کے ٹریکس کے آپ شوقین ہیں، ان کی نسبت یہ ٹریک آسان نہیں ہے..؟"

"نہیں.. میں نے دیوسائی میں تھوڑا سا بُرجی لا ڈال کر اسے متشرع کر لیا ہے۔"

اور اس متشرّع کر لینے کا پس منظر کچھ یوں ہے.. کہ درویش سرمد کے پار جب خلق خدا جمع ہونے لگی تو اورنگزیب عالمگیر فکر مند ہوا کیونکہ شہنشاہ درویشوں کی مقبولیت سے ہمیشہ خائف رہے ہیں.. چنانچہ اس نے اپنے قاضی القضات کو حکم دیا کہ جاؤ اور جا کر پتہ کرو.. سنا ہے یہ شخص بے لباس بیٹھتا ہے اور ہر وقت بھنگ گھوٹتا رہتا ہے اور اسے سرزنش کرو.. قاضی صاحب ہمیشہ کی طرح دربار کے حمایتی تھے۔ بڑی شان و شوکت سے درویش کے ڈیرے پر تشریف لے گئے اور اسے انہی حالات میں پایا.. اور حسب حکم سرمد کو سرزنش کی کہ تم ننگے بیٹھے ہوئے ہو اور بھنگ گھوٹ رہے ہو اور تمہیں شرع کا کچھ خیال نہیں.. سرمد نے کہا، تمہیں بھی تو شرع کا کچھ خیال نہیں.. قاضی صاحب نے نہایت تکبّر سے کہا کہ میں تو شرع کا پابند ہوں.. اس پر سرمد نے انگلی اٹھا کر اس کے لباس شاہانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، تم نے ریشم کے لبادے زیب تن کر رکھے ہیں جو خلاف شرع ہے.. قاضی صاحب نے فوراً کہا، لیکن میں نے ان میں سُوت کے تار بُنوا کر انہیں متشرّع کر لیا ہے.. تو سرمد بولا، اور میں بھی اس بھنگ میں سیاہ مرچیں شامل کر کے اسے متشرّع کرتا ہوں..“

چنانچہ میں نے بھی دیوسائی کی آسانی میں تھوڑا سا برجی لاء شامل کر کے اپنے ٹریک کو متشرّع کر لیا تھا..

آزمنڈ.. متشرّع تک تو نہ پہنچ سکا.. اور قابل فہم طور پر لیکن برجی لاء تک پہنچ گیا.. برجی لاء ہی کیوں؟

”میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اس درّے کی چوٹی سے پہاڑوں کی عظمت کا ایک ایسا پرشکوہ منظر دکھائی دیتا ہے جو پوری دنیا میں یکتا اور بے مثال ہے.. اس لیے برجی لاء...“

”صرف ایک منظر کے لیے آپ برجی لاء تک جانا چاہتے ہیں؟“

”ہاں.. یہ تو پورا ایک منظر ہے اور میں تو صرف ایک جھیل کے لیے کئی کشٹ کاٹ سکتا ہوں..“

”آپ بڑے عجیب و غریب شخص ہیں..“ آزمنڈ کے دانت پھر نمایاں ہوئے..

”ہر شخص کہیں نہ کہیں عجیب و غریب ہو جاتا ہے.. مثلاً آپ کا مقصدِ حیات جنگلی حیات کو دیکھنا اور اسے بچانا ہے.. کیا آپ کسی ایک نایاب نسل کی لومڑی یا پرندے کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگاتے ہوئے دشوار پہاڑی سلسلوں کے اندر نہیں چلے جاتے.. صرف ایک لومڑی کو.. صرف دیکھنے کے لیے.. تو ایک منظر ایک لومڑی سے تو بہتر ہوتا ہے..“

آزمنڈ کے دانت مزید نمایاں ہو کر ایک بے حد چوڑی مسکراہٹ میں پھیل گئے۔ ”اس پر بحث ہو سکتی ہے.. ایک نایاب لومڑی کو دیکھنا ایک منظر کو دیکھنے کی نسبت کہیں زیادہ ہیجان خیز ہے.. پچھلے برس ہم لوگ بیافو گلیشیر کے متوازی پناما گلیشیر کی برفیلی اور خطرناک وادیوں میں گئے تھے، صرف کسی ایک ریچھ یا بھیڑیئے کو دیکھنے کے لیے۔“

یکدم جیپ کے انجن کا شور آوازوں پر حاوی ہو گیا.. وہ انجن، احتجاج کرتا، اپنی بُوتھی چڑھائی کی وجہ سے آسمان کی جانب کئے، ایک چاندنی شب میں بھونکتے ہوئے بھیڑیئے کی طرح اپنی تھوتھنی آسمان کی جانب کئے.. زور لگاتا.. اوپر چڑھتا تھا.. تب میں نے ایک بھورے رنگ کے شاندار پرندے کو پَر پھیلائے دیوسائی نالے کی گھاٹی میں آہستگی سے حرکت کرتے ہوئے پرواز میں محو دیکھا تھا اور آزمنڈ نے کہا تھا۔ ”جیپ روکو..“

بھورا شاندار پروں اور شان والا عقاب تا دیر گھاٹی میں پرواز کرتا رہا تھا اور پھر نالے کے پار پر سمیٹ کر ایک چٹان پر اتر کر گردن گھمانے لگا تھا.. اور اس کی قربت میں ایک اور پرندہ بیٹھا تھا جو اس کا ہم شکل تھا..

اور آزمنڈ نے ایک عجیب ہیجان خیز حالت اور سرخ چہرے کے ساتھ کہا تھا۔

”یہ اس کی مادہ ہے.. یہ عقاب بہت کم نظر آتا ہے.. اسے جی بھر کے دیکھ لیں۔“

وہ دونوں بھورے پرندے.. اپنی چٹان سے.. ہماری نظروں کے سامنے

اٹھے.. پَروں سے پَر ملائے، ایک خوبصورت سمفنی کی طرح ردھم میں آئے اور پرواز
کرتے ہوئے دیوسائی پر اوجھل ہوگئے۔

"چلو..." آزمنڈ نے ڈرائیور سے کہا..

چند لمحوں میں مجھے دیوسائی کی روڈ کے کنارے ایک پتھریلی دیوار نظر آئی
جسے میں نے پہچان لیا کیونکہ اس کے پار دیوسائی کے میدان تھے اور اس دیوار کی قربت
میں پہنچ کر سلجوق نے مڑ کر مجھے کہا تھا "ابّو.. دیوسائی"

اگرچہ اس آخری چڑھائی کے دوران میں بھی بہت بے بس اور لاچار ہوا تھا
لیکن جیپ کی حالت مجھ سے کہیں زیادہ خراب اور بے بس ہو رہی تھی اور ہونکتی ہوئی
رکنے کو تھی یا پیچھے لڑھکنے کو تھی..

"بہتر یہ ہے کہ ہم اتر جائیں.." آزمنڈ نے کہا..

جیپ رکی..

ہم اتر گئے..

اترے.. جیپ سے نیچے قدم رکھا تو میں لڑکھڑایا..

میں نے اپنے آپ کو قائم رکھنے کی کوشش کی لیکن... ہر شے متحرک تھی اور گھومتی
تھی.. میں ایک ایسے شرابی کی طرح تھا جو مے خانے کے آسودہ اور گرم ماحول میں سے
نکل کر یکدم باہر خنک ہوا میں پہلا سانس لیتا ہے تو اس پر خمار حاوی ہو جاتا ہے اور وہ اپنا
توازن قائم نہیں رکھ سکتا اور یوں جھومتا ہے کہ کوئی بھی جھوماہٹ اسے ڈھیر کر سکتی ہے..

پچھلی دیوسائی کی یاترا پر ہم نے پُل کے پار ہو کر ٹاپ تک پیدل سفر کیا تھا۔
اس لیے ہمارے وجود دھیرے دھیرے آکسیجن سے خالی ہوتی بلندی کے عادی ہو گئے
تھے اور اب میں ایک اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر لمحوں میں یہاں پہنچ گیا تھا اور کھٹولے سے
نیچے اتر گیا تھا.. آزمنڈ مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا لیکن مجھے صرف اس کے لب ہلتے دکھائی

دیتے تھے۔ آواز سنائی نہیں دے رہی تھی.. لیکن میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا.. جیسے
مے خانے سے یکدم نکلنے والا.. جھومتا شرابی جب اپنے سامنے ایک پولیس کے سپاہی کو
دیکھتا ہے تو اپنے حواس مجتمع کر کے سیدھا چلنے لگتا ہے..

جیپ آگے چلی گئی.. ہم اس کے پیچھے چلنے لگے..

"تارڑ صاحب.."

"جی.."

"ذرا دیکھیں.." آزمنڈ نے اپنا بازو آگے کر دیا..

اور اس پر.. آزمنڈ کی شرٹ کی نصف آستین سے ذرا نیچے اس کے ننگے بازو پر
ایک عجیب رنگوں کا بھنورا براجمان تھا.. وہ اپنے بازو کو اتنی احتیاط سے اٹھا کر میرے سامنے
کرتا تھا جیسے اس پر کرسٹل کا کوئی نازک گلدان رکھا ہو جو اس کی ذرا سی حرکت سے، تھوڑی
سی غفلت سے گر جائے گا اور چکنا چور ہو جائے گا.. وہ اتنی احتیاط سے اپنا بازو اٹھاتا تھا..

میرے بازو پر اگر کوئی اس قسم کی شے بیٹھتی تو میں اس کی طرف دیکھے بغیر
اسے فوراً جھٹک دیتا.. خوفزدہ ہو کر مسل دیتا.. لیکن آزمنڈ جنگلی حیات کا آدمی تھا.. اس
کا نگہبان تھا اور اس کے لیے یہ بہت بڑا انعام تھا کہ دیوسائی کا ایک عجب بھنورا اس کے
بازو پر آرام کر رہا تھا..

اور اس نایاب ان دیکھے بھنورے کے سو رنگ تھے..

کوئی ایک رنگ نہ تھا جو کسی کتاب، کسی تصویر میں آیا ہو..

وہ بھنورا ایسا تھا جسے کسی بھی پھول پر فدا ہونے کی ضرورت نہ تھی، اسے
صرف اپنی چھب دکھلانے کی دیر تھی اور دنیا بھر کے پھول اس کے حسن پر نثار، اس پر
نچھاور ہو سکتے تھے.. مجھے حیرت تھی کہ ننگے بازو پر بیٹھے ہوئے بھنورے کی رینگتی ٹانگیں
یا بازو آزمنڈ کو الجھن اور بے چینی میں نہیں ڈالتے..

وہ بازو اٹھائے اسے ایک محبوب کی طرح دیکھتا رہا.. اور پھر وہ اڑ گیا..

"ایک اُجڑے ہوئے دیوسائی پر اور پورٹر بغاوت"

ہم آہستہ آہستہ چلتے گئے۔

اور اس پتھریلی دیوار کے پرے ہوئے..

اور تب دیوسائی کا منظر کھلا..

اس کے ٹیلے.. اس کی وسعت اور اس کی تنہائی سامنے آئی..

مجھے کچھ مایوسی ہوئی..

یہ وہ دیوسائی نہ تھا جس کے لیے میں آیا تھا..

وہاں نہ ایک پھول تھا.. نہ ایک ریچھ تھا.. اور نہ ایک بادل تھا..

پہلے وہاں بارش نہ ہوئی.. ہر جانب دیوسائی میں ہر جانب دھول اٹھنے لگی.. جو گل بوٹے تھے، وہ مرجھا گئے.. دھوپ کی شدت سے جل گئے.. پھر بارشیں اور برفیں شروع ہو گئیں.. جو کچھ بچ گیا تھا، وہ برف کے بوجھ تلے آیا اور فنا ہو گیا.. اور اب اس پر خزاں اتری ہوئی تھی..

جہاں تک نظر جاتی تھی وہاں تک.. نہ کوئی درخت تھا.. نہ کوئی جھاڑی.. اور وہ تو بہار میں بھی نہیں ہوتے.. لیکن کوئی ایک پھول نہ تھا.. کوئی خوش نظر بُوٹا نہ تھا.. کوئی شوخ پتّہ نہ تھا.. اگر نہیں تھا تو پتّہ پتّہ بُوٹا بُوٹا کیسے ہمارا حال جان سکتا تھا.. وہاں صرف تانبے کے رنگ کی ایک وسعت تھی.. ایک بھوری بے پناہ وسعت.. جیسے دیوسائی کا

سکّہ بھی زنگ آلود ہو چکا ہو.. میری طرح کھوٹا ہو چکا ہو.. لیکن صد پارہ کی ٹمٹماتی متحرک لالٹین شب میں میرا کچھ زنگ اترا تھا.. میں کھوٹے سے کھرا ہو گیا تھا.. اور یہاں پہنچا ہوں تو یہ دیوسائی کھوٹا ہو رہا ہے.. میں ہوا کھرا.. تو وہ کھرا کھوٹا ہو گیا.. میں ہوا کافر.. تو وہ کافر مسلماں ہو گیا..

ہم ذرا اور اوپر ہوئے.. دیوسائی مزید کھلا تو میں نے دیکھا کہ اس زنگ آلود سکّے کے افق پر جو پہاڑ تھے، وہ برفوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور دور ایک بادل تھا..

اور دیوسائی کی بھوری وسعت کے سینے میں کھدی ہوئی.. خوبصورت بھورے پیٹ پر سیزیرین آپریشن کی ایک بدنما لکیر بل کھاتی تھی.. ایک جیپ روڈ تھی، ایک مردہ اژدھے کی طرح لیٹی نظروں سے اوجھل ہوتی تھی..

یہ جیپ روڈ دیوسائی کے شاہکار سینے میں اس طرح کھدی ہوئی تھی جیسے مائیکل انجلو نے اپنے شاہکار مجسّمے "پائیتا" میں حضرت مریم کے سینے پر "اسے فلارنس کے بونیتو مائیکل انجلو نے بنایا" کھود دیا تھا اور اس کی الوہی خوبصورتی کو برباد کر دیا تھا..

ہم اوپر پہنچ گئے..

"ویلکم ٹو دیوسائی ٹاپ ہوٹل"

چند پتھروں میں جکڑا ہوا ایک سائن بورڈ.. اور اس کے پہلو میں ایک بوسیدہ سفید خیمہ..

ہمارا سامان اتر گیا اور ہم بھی اتر گئے..

میں نے آزمنڈ کی جیپ لفٹ کا شکریہ ادا کیا اور وہ "ڈونٹ منشن اِٹ" کہہ کر ہاتھ ہلا کر بڑے پانی کی جانب چلا گیا..

اب میں تھا اور دیوسائی تھا..

دیوسائی اے دیوسائی..

ہوا بہت تیز تھی..

اور ہم سب لوگ بلندی کے باعث قدرے بے اختیار اور بے وقوف ہوتے تھے اور بہت ہی بھوکے ہوتے تھے..

بھوکے اس لیے کہ ہم صدپارہ کے پار اگرچہ لنچ کے لیے رکے تھے لیکن جیپوں کے سہارے ملے تو بھوک کو بھول گئے.. ندیدے اور تھکے ہوئے بچوں کی طرح ان میں سوار ہو گئے.. چنانچہ واجبی ناشتے کے بعد اب تک ہم تقریباً روزہ دار تھے اور ہمارے معدے بھوک سے کُوکتے تھے.. لنچ کے لیے بنائے گئے پراٹھے ہمارے پاس تھے اور ان پراٹھوں کے ساتھ نوش کرنے کے لیے انڈے "دیوسائی ٹاپ ہوٹل" کے اکلوتے مالک علی مدد کے پاس تھے... شائد!

علی مدد سفید خیمے میں ہوٹل کے پروپرائٹر کی حیثیت سے ایک بلتی بدھ کی طرح شانت بیٹھا بزنس کا منتظر تھا..

مجھے شک ہوا کہ میں اسے پہلے سے جانتا ہوں... اسے میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا.. لیکن کہاں؟

"علی مدد.. یار میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے.. کہاں دیکھا ہے؟"

"صاحب ہم آپ کا پورٹر ہے.. سکردو سے یہاں تک آپ کا سامان بوجھ کر کے لایا ہے.."

"تو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"آپ پیچھے رہ گیا.. ہم آگے آ گیا.. ادھر سامان اتارا.. ہوٹل کھولا اور بیٹھ گیا.. ہم ادھر جنرل منیجر ہے صاحب.. کیا خدمت کرے.."

"انڈہ ہے؟"

"ہے.."

"کتنے کا ہے؟"

"دس روپے.."

"اتنا مہنگا..."

"دیوسائی ٹاپ پر تو کوئی مرغی انڈہ دینے کے لیے نہیں آتا صاحب.. نیچے سکردو سے لاتا ہے.. ٹوٹ جاتا ہے.. خراب ہوتا ہے.. ابھی آپ کے سامان کے ساتھ لایا ہے۔"

"کتنا لایا ہے؟"

"ابھی کیا پتہ.. ابھی چیک کرے گا کہ کتنا ادھر پہنچا ہے اور کتنا ٹوٹا ہے.."

"جتنا بھی ہے ان سب انڈہ لوگ کا سالن بنا دو علی مدد.."

"ذرا پیاز کا تڑکا لگا کے علی مدد.." خالد ندیم نے ایک بھوکے فقیر کی طرح التجا کی۔ "اور تڑکے کے لیے دیسی گھی ہم دیں گے.. اگر سبز مرچ اور ٹماٹر بھی ہوں تو یار ہم تمہارے مرید ہو جائیں گے.. ادرک تو نہیں ہو گا تمہارے پاس؟"

"کیا بولتا ہے صاحب.." علی مدد پریشان ہو گیا..

"علی مدد.. تم اس صاحب کی بات پر دھیان مت دو.. بس انڈہ بناؤ۔"

ایک انڈا پراٹھا لنچ کے بعد مجھے نہیں.. دیگر ممبران کو چائے کی طلب ہوئی..

"علی مدد.. تمہاری مدد چائے کے ایک کپ کے لیے.. کتنے کا؟"

"دس روپے.."

"علی مدد.. یار تم ہمارے پورٹر ہو.. کچھ تو رعایت کرو۔"

"صاحب.. آپ مہمان ہے بے شک کوئی پیسہ نہ دیں.. لیکن.. جیسے ادھر مرغی انڈہ دینے نہیں آتا، ایسے بھینس یا گائے دودھ دینے نہیں آتا.... ہم چائے کا پتی نیچے سکردو سے لاتا ہے.. سٹوو لاتا ہے.. اسے جلانے کے لیے تیل لاتا ہے.. اور پھر ادھر دیوسائی کی چراگاہ میں.. جسے ہم لوگ "بہک" بولتا ہے.."

"ہم بھی.. دریائے چناب کے کنارے.. اپنی چراگاہ کو "بہک" بولتا ہے.."

"تو ادھر کوئی چار سو مویشی رہتا ہے.. زدہ اور یاک... تو وہاں جا کر ان کا خالص اور گاڑھا دودھ لاتا ہے.. پھر چائے کا ایک پیالی بناتا ہے.. ادھر دیوسائی ٹاپ پر ایک دن میں کتنا لوگ آتا ہے.. کبھی آتا ہے اور کبھی نہیں آتا تو دس روپے ایک پیالی کا زیادہ تو نہیں.."

علی مدد.. اس مقام پر.. اس دنیا کے بلند ترین میدان میں.. اگر چائے کی ایک پیالی کے دس روپے مانگتا تھا تو کچھ زیادہ نہیں، کچھ کم ہی مانگتا تھا..

ہم نے چونکہ صد پارہ کیمپنگ سے دیوسائی تک کا بیشتر سفر جیپوں کے سہارے طے کر لیا تھا، اس لیے ہمارے کچھ پورٹر ابھی راستے میں تھے.. وہ ٹاپ تک نہیں پہنچے تھے..

دھوپ بہت تیز تھی.. پورٹر پہنچ جاتے تو ہم فیصلہ کرتے کہ اب کیا کرنا ہے..

فی الحال ہم نے انتظار کرنا تھا..

ہم اس انتظار کے لیے.. تیز دھوپ سے بچنے کے لیے.. علی مدد کے ٹینٹ ہوٹل میں سے نکل کر ذرا فاصلے پر ایستادہ ایک اور خیمے میں چلے گئے جس میں شب بسری کی خواہش کرتے مسافروں کے لیے فرش پر گدے بچھے تھے اور تہہ در تہہ رضائیاں سٹور تھیں.. اور باہر کی تیز دھوپ اور شوکتی تیز ہوا سے فرار تھا.. اندر.. اس خیمے کے اندر ایک ٹھنڈک بھرا اگرچہ بلندی کی بے چینی سے بھرا ایک گہرا اور چھاؤں سے بھرا سکون تھا..

تہہ در تہہ جو رضائیاں تھیں ان پر جو پرنٹ تھے اور ان کے برابر میں جو چند سرہانے تھے، ان پر جو کشیدہ کاری تھی، وہ اونچائیوں پر چلنے والی اس ہوا کی تنہائی سے وجود میں آتی ہے جو ان کو چھوئی ہوتی ہے... اور ان میں آپ کا بدن لپٹے یا آرام کرے تو سراسر ایک الگ کیفیت اور موسم میں ہوتا ہے... اس موسم سے یکسر جدا جو پنجاب کے سرما میں کٹیلی سردی کے ساتھ آپ کے ساتھ لپٹتا ہے.. دونوں جگہ سرد ہوا ہے لیکن یہاں جو الگ ہوا ہے اس میں سانس لیتے ہوئے فوراً یہ کھلتا ہے کہ آپ وہاں ہیں.. کسی

ایسے مقام پر ہیں جس کا تذکرہ قدیم کتابوں اور سفر کہانیوں میں ملتا ہے.. کہیں تبت یا لداخ میں ایسی ہوا ہوگی... اور ایسی ہوا ہوگی کیونکہ یہ علاقہ بھی تو لدّاخ کے نواح میں ہے، تبت خورد کہلاتا تھا.. کچھ یہی احساس آپ کو پسّو کے پرانے گھروں میں بھی ہوتا ہے.. ایک سرد اور تاریخی تنہائی کا دور افتادہ احساس کہ اس گھر کی چھت میں جو روشندان کھلتا ہے اور اس میں سے جو دھوپ کمرے کی تاریکی میں اترتی ہے اور اس دھوپ میں ذرّے آہستگی سے اٹھتے ہیں.. کچّے فرش پر دیوسائی کے اس خیمے میں چھینٹ والی رضائیاں ہیں، نمدے اور سرہانے ہیں اور خوبانیوں کا ایک تھال ہے..

دیوسائی کے اس خیمے میں یُرت خیموں کی گولائی کی وہ کیفیت ہے جو صحرائے گوبی یا کاشغر کے راستے میں جنت جھیل اور گھاس کے میدانوں میں نصب گھڑسواروں اور گڈریوں کے خیموں میں ہوتی ہوگی..

دھوپ ڈھلی.. باہر دیوسائی کے میدانوں میں ڈھلی..

شام کی قربت ہوئی تو خیمے کی عافیت اور وہ رضائیاں بھی ناکافی ہوئیں اور ہم بڑھتی سردی میں بے آرام ہونے لگے..

ہمارے پورٹر... سب کے سب اوپر آ چکے تھے..

اور ان سب میں سے غریب عباس کی کمر پر سب سے زیادہ بوجھ تھا.. کیونکہ وہ واحد پورٹر تھا جو صدپارہ گاؤں کا نہ تھا.. ہماری پسند کا تھا.. اس لیے اسے سزا کے طور پر ایک گدھے کی طرح لاد دیا گیا تھا.. لیکن گڈ اولڈ عباس... سنولیک کا ساتھی.. طویل برفانی مسافتوں میں ہمارا ساتھ دینے والا عباس، اُف نہ کرتا تھا..

ہم نے شب بسری کے لیے دیوسائی ٹاپ ہوٹل سے ذرا پرے.. ہوا سے بچاؤ والے ایک نشیب کا چناؤ کیا.. ہمارے خیمے دیوسائی کی خالی ڈھلوانوں میں ابھرنے لگے.. اور وہ وہاں سجتے نہ تھے، معیوب اور بے تکے لگتے تھے.. کیونکہ پورے دیوسائی میں،

بھوری خزاں رسیدہ نیم سنہری گھاس پر کہیں بھی.. کوئی ایک جھاڑی، کوئی ایک درخت، کوئی ایک پودا یا بُوٹا ایسا نہ تھا جو بلند ہوتا ہو... لیکن ہمارے خیمے بلند ہوتے تھے اور دیوسائی کی لینڈ سکیپ کے قدرتی توازن میں خلل ڈالتے تھے..

خزاں تک پہنچی ہوئی گھاس سے پرے... ذرا اونچائی پر برف ہی برف تھی..

دیوسائی میں جو چوٹیاں اٹھتی ہیں، وہ ہمیشہ پستہ قد اور ٹھگنی سی دکھائی دیتی ہیں اور ان پر برف کی چادر دیکھ کر لگتا ہے جیسے ایک لڑکی وقت سے پہلے جوان ہو گئی ہو اور اپنے غیر مناسب بدن کو چھپانے کی کوشش میں ہو.. اس کے بدن پر وہی ابھار اور بناوٹ ہو جو ایک خاص عمر میں ہی چھب دکھلاتے ہیں اور اب غیر قدرتی لگ رہے ہوں.. اس کا جواز بے حد سادہ ہے.. جس چوٹی کی بنیاد ہی چودہ ہزار فٹ سے شروع ہو، وہ آخر کتنی بلندی تک جا سکتی ہے..

اس شام کھانے کے بعد پورٹرز نے حسب روایت بغاوت کر دی..

علی... جسے میں پچھلے سفر کے نوسٹلجیا میں.. دیوسائی کی فرقت کے مرض میں مبتلا ہونے کے باعث.. سکردو بازار میں اس کی دکان سے اٹھا کر گائڈ کے طور پر ساتھ لے آیا تھا.. دوست اور قدیمی دوست جان کر ساتھ لایا تھا.. چنگیزی کے فراہم کردہ تجربہ کار گائڈ شمشیر کو چھوڑ کر ساتھ لایا تھا۔ اب وہی علم بغاوت بلند کئے طبل جنگ بجا رہا تھا.. "صاحب بوجھ بہت ہے.. پورٹر لوگ کہتا ہے کہ اے سردار.. اور میں پورٹر کا سردار ہوں تو وہ کہتا ہے کہ ہم اتنا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔"

"لیکن علی.. یہ پورٹر لوگ یہاں تک بوجھ لے آئے ہیں.. سکردو میں جتنے پورٹر تم نے کہے تھے، اتنے ہم نے ہائر کر لیے تھے.. تو اب کیا ہوا ہے؟"

"بس صاحب.. کیا کرے.. دو تین پورٹر اور درکار ہے.. بہت ضروری ہے؟ صاحب.. مزید پورٹر نہیں لے گا تو یہ لوگ بوجھ چھوڑ کر چلا جائے گا.. مجبوری ہے۔"

اور یہ دو تین فالتو پورٹر ہمارے کیمپ کے گرد منڈلاتے ہوئے دیکھے جا سکتے تھے.. کیونکہ علی نے ان سے کہا تھا کہ وہ عین وقت دیوسائی ٹاپ پر پہنچیں جب صاحب لوگ رات کا کھانا کھا کر لاپروا ہو جائیں، اگلی صبح کے سفر کی منصوبہ بندی کر رہے ہوں تب آپ آؤ اور کیمپ کے گرد منڈلاؤ تو میں تمہیں بھرتی کر لوں گا..

دو تین مزید پورٹروں کا آسان نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ہمارے بجٹ میں یکمشت چھ سات ہزار روپے کا مزید خسارہ.. اور یہ ایک ایسا بجٹ تھا جو پاکستان کے بجٹ کی طرح روزِ اوّل سے ہی خسارے میں چلا آ رہا تھا.. ہم اگر چاہتے تو بھی یہ خسارہ برداشت کرنا ممکن نہ تھا..

"اگر ہم مزید پورٹر ہائر نہیں کرتے تو پھر کیا ہو گا علی؟"

ٹیم ممبران مکمل طور پر دہشت میں آ چکے تھے.. ہم اتنی دور سے آئے تھے.. سکردو روڈ کے شکنجے میں سے نکل کے آئے تھے.. موسم کے سرد فریب سے نکل کے، دیوسائی کی برفوں کو دھوپ سے پگھلانے کے بعد یہاں تک آئے تھے اور یکدم آئندہ سفر کے امکانات تاریک ہونے لگے تھے.. اس تاریکی میں ایک پھول... ایک ریچھ.. ایک بادل.. گم ہونے لگے..

"پھر تو مجبوری ہے صاحب.. یہ لوگ اتنا بوجھ نہیں اٹھائے گا.. یہ کل صبح واپس چلا جائے گا سامان چھوڑ کر.. تو آپ کیا کرے گا.. ادھر پڑا رہے گا.. برف آ گیا تو کیا کرے گا... ادھر سے پورٹر تو نہیں ملتا.. نیچے بھی نہیں جا سکے گا.. تو کیا کرے گا.." علی طوطے کی آنکھ ہو گیا تھا..

"کیا کریں؟" میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا جو ہم دونوں کے گرد چُپ شاموں کی طرح اداس بیٹھے تھے..

وہ چپ بیٹھے رہے.. وہ کیا بتاتے کہ کیا کریں.. ایک فلمی ڈائیلاگ کی رُو سے ان کے ارمانوں کا جنازہ جا رہا تھا.. تمناؤں کی بستی میں اندھیرا ہی اندھیرا اور غم کی ہوا سے

دل کے چراغ بجھ گئے تھے..

علی نے ہمیں چُپ پایا تو شیر ہو گیا۔ ”صاحب ہم تو آرام سے سکردو میں دکانداری کرتا تھا، بوٹ اور جیکٹ بیچتا تھا.. آپ نے بولا کہ ہمیں دیوسائی لے جاؤ تو ہم اپنا نقصان کر کے دوستی کے لیے آپ کے ساتھ اوپر آ گیا۔“ اگرچہ اس نے خود بولا تھا کہ صاحب ہم آپ کو دیوسائی لے جائے گا۔ ”آپ کے لیے آ گیا.. مجھے کیا ضرورت تھی پورٹر کا سردار بننے کی.. صرف آپ کے لیے آیا.. تو اب آپ میری بات نہیں مانے گا تو پورٹر سامان چھوڑ کر چلا جائے گا.. مجبوری ہے صاحب...“

میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔ ”ٹھیک ہے علی...“

منڈلاتے ہوئے پورٹر میرا جھکا ہوا سر دیکھ کر قریب آ گئے اور علی.. اور یہ بھی ایک اور علی مدد تھا.. اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ طمانیت آ گئی۔ ”تو ان تین پورٹر کو ہم ہائر کرے صاحب؟ یہ ٹھیک ہے؟“

”نہیں.. یہ ٹھیک نہیں. ٹھیک یہ ہے کہ آپ سب لوگ کل صبح دو پڑاؤ کا مزدوری ہم سے وصول کرو اور سب کے سب... جیسا کہ تم چاہتے ہو.. ہمیں چھوڑ کر نیچے چلے جاؤ.. یہ ٹھیک ہے۔“

علی مدد سکتے میں آ گیا۔ ”ادھر پورٹر کے بغیر آپ دیوسائی کیسے کراس کرے گا؟.. اوپر برجی لاء تک کیسے جائے گا..“

”ہم جائے گا ہی نہیں علی مدد.. ہم ادھر دیوسائی ٹاپ پر اگلے سات روز کے لیے کیمپ کرے گا... دوسرے علی مدد کے ہوٹل سے دیسی انڈوں کا سالن کھائے گا، چائے پئے گا.. کہیں نہیں جائے گا.. بس ادھر سیر کرے گا.. اور پھر کسی جیپ میں سوار ہو کر نیچے سکردو واپس چلا جائے گا.. ہم یہ کرے گا۔“

”دیوسائی کراس نہیں کرے گا؟“

”نہیں...“

”تو پھر مجبوری ہے.. ہم سب آپ کو چھوڑ کر نیچے چلا جائے گا۔“

”چلے جاؤ..“

علی مدد پہلے سکتے میں تھا، اب سناٹے میں بھی آ گیا..

ہم سے پرے کسی پورٹر نے آگ جلا رکھی تھی اور وہ کوئی بلتی گیت گا رہا تھا..

اور میں نے اس رات میں پہلی بار اوپر دیکھا.. آسمان کی جانب نگاہ کی.. اوپر ایک سائبان تھا، دیوسائی کی رات پر تنا ہوا.. ایک تاریک سائبان جس میں جگہ جگہ.. لاکھوں جگہ چھید تھے جن میں سے روشنی ٹمٹماتی.. آنکھیں مارتی تھی..

”آپ بے شک ابھی چلے جاؤ علی مدد.. اپنے پورٹروں کو بھی ساتھ لے جاؤ۔“

”آپ...“ وہ سناٹے میں سے باہر آ کر بولا۔ ”آپ ادھر کیا کرے گا صاحب؟“

”تم نے آسمان کی طرف نہیں دیکھا.. دیکھو...“

”کیا دیکھو...“ اس نے اوپر دیکھا اور اسے کچھ نظر نہ آیا..

”دیوسائی کے آسمان پر اتنے ستارے ہیں کہ ہم اپنی ساری حیاتی انہیں شمار کرتے رہیں تو وہ شمار میں نہ آئیں.. تو میں نے... ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے سات روز یہیں پڑے رہیں اور ستارے گنتے رہیں.. ذرا ان کا حساب کریں۔“

”ستارہ لوگ گنے گا؟“

”ہاں.. گنے گا.. ایک.. دو.. تین.. چار..“

جب میں ستارہ لوگ شمار کرتا بیس تک پہنچا تو اس نے ٹوپی اتار کر کچھ دیر اپنے چند بالوں میں شدید کھجلی کی۔ ”میں ذرا ان پورٹر لوگ سے پھر بات کرتا ہوں..“

وہ پورٹر لوگ سے بات کرنے گیا تو گُڈ اولڈ عباس جو کسی خیمے کی اوٹ میں ہماری گفتگو سن رہا تھا، ذرا شرمندہ سا میرے پاس آیا۔ ”صاحب میں نے تو سب پورٹر کو بول دیا ہے کہ آپ بے شک چلے جاؤ لیکن عباس ادھر صاحب کے ساتھ رہے گا.. چاہے مر جائے..“

علی مدد فوراً ہی واپس آگیا۔ ”صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کو ادھر چھوڑ کر چلا جائے.. آپ کے ساتھ تو ہمارا پرانا دوستی ہے.. ہم تو کئی سال پہلے آپ کے بچّہ لوگ.. سلجوق صاحب اور سُمیر صاحب کے ساتھ اوپر آیا تھا..اور صاحب یاد ہے کہ سُمیر صاحب پر بلندی کا اثر ہو گیا تھا تو میں نے پرانا زنگ آلود ٹین صاف کر کے.. گوبر کا آگ جلا کر اور ٹین میں دودھ گرم کر کے اسے پلایا تھا.. تو صاحب ہم آج آپ کا ساتھ کیسے چھوڑے گا.. پورٹر لوگ بے وقوف ہے سر.. میں نے ان کو سمجھا دیا ہے کہ یہ صاحب ہمارا مہربان ہے.. اس کے ساتھ ضرور جانا ہے.. بے شک بوجھ زیادہ ہے.. لیکن دوستی ہے تو جانا ہے۔“

”تھینک یو علی مدد... شکریہ.. تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔“

کیمپ کا پورا ماحول جو ابھی سناٹے اور ناخوشی میں چپ تھا.. یکدم پانسا پلٹ گیا.. پورٹر ایک کنستر پر تھاپ دیتے ہوئے بلتی لوک گیت الاپنے لگے.. خیموں سے پاپ سانگ اور غزلیں ابھرنے لگیں اور آسمان قریب آگیا..

اس دوستانہ ماحول میں علی بھی بہت فرینڈلی ہو گیا۔ ”اور صاحب.. کل کدھر جائے گا.. دیوسائی کو پار کرنا ہے تو پہلے شتونگ جائے گا..؟“

”نہیں.. پہلے درّہ برجی کی ٹاپ پر جائے گا..“

”وہاں کیا کرے گا صاحب.. واپس سکردو کے اوپر جا کر کیا کرے گا؟“

”ادھر سے نظارہ کرے گا.. قراقرم کے اونچے پہاڑوں کا نظارہ کرے گا۔“

”مشکل ہے صاحب..“

”کیوں؟“

”ادھر تو ہم آج تک نہیں گیا..“

”آج تک آپ کدھر گیا ہے؟“

”سچ بولتا ہے صاحب.. ہم تو ادھر دیوسائی پر بھی کئی سال کے بعد آیا ہے..“

”تو ادھر کا راستہ نہیں جانتا؟“

”نہیں صاحب..“

”تو گائڈ کے طور پر ساتھ کیوں آگیا؟“

”دوستی کے لیے.. لیکن صاحب.. دیوسائی بدلتا تو نہیں.. وہی رہتا ہے.. ہم آپ کو پار لے کر جائے گا.. انشاءاللہ.. اب ہم سوتا ہے۔“

جب پورٹر اور علی مدد اپنے خیموں میں جا چکے.. رات گہری ہو گئی.. بلتی گیت تھم گئے.. الاؤ بجھ گیا... تو اس دیوسائی کی رات میں آسمان نیچے آگیا..

نہیں.. آسمان نیچے نہیں آیا.. بلکہ ہم جو تیرہ چودہ ہزار فٹ پر سر بلند ہو چکے تھے، اس کے قریب آگئے۔

ایسے آسمانی گنبد کی قربت میں.. اس نیم سیاہ گنبد میں جو چھید تھے جن میں سے ٹمٹماتی روشنیاں نیچے آتی تھیں.. میں نے ایسی روشنیوں کو کبھی اتنی دل آزاریا دل پسند قربت میں نہ دیکھا تھا۔

ایک زمانہ پہلے..

جب دیہات میں کچّے کوٹھے ہوا کرتے تھے.. ان پر گرمیوں کی راتوں میں نواری چارپائیاں بچھتی تھیں... عشقے دا اک پلنگ نواڑی.. اور ان پر سفید دُودھیا چادریں اور نویں نکور کھیس بچھائے جاتے تھے جن کے تانے بانے میں سے کپاس کی کنواری مہک اٹھتی تھی اور ان چارپائیوں پر جو آسمان جھکتا تھا، اس میں بھی لاکھوں چھیدوں میں سے وہ ان گنت جگنو جھلکتے تھے جو بامِ فلک سے اتر کر ایک چارپائی پر لیٹے کسی تارڑ کی آنکھوں میں اترتے تھے..

یہ ایک زمانہ پہلے کی باتیں ہیں..

لیکن اب کئی برسوں سے میرے حصّے کا آسمان مختصر ہو چکا ہے۔

شہر کی روشنیاں.. پلازوں.. شاہراہوں.. مارکیٹوں اور شاندار گھروں کو منوّر کرتی اوپر اٹھتی تھیں اور آسمان کو گھیرے میں لے کر ستاروں کو ماند کر دیتی تھیں..

انہیں گل کر دیتی تھیں..

بجھا دیتی تھیں.. وہ نظر نہیں آتے تھے..

اور بہت زمانوں کے بعد.. آج.. دیوسائی کی رات میں وہ ستارے جل اٹھے تھے، نظر آنے لگے تھے.. آسمانی گنبد جھک کر میری پلکوں کو چھونے آ رہا تھا.. اتنا قریب تھا..

ایک ایک ستارہ الگ الگ تھا.. اس کی حیثیت.. اس کی نمائش جدا تھی.. اور ان سب کو گنا جا سکتا تھا۔

لیکن ان سب کو شمار کرنے کے لیے حیاتی کے جتنے دن درکار تھے، وہ میرے پاس نہ تھے..

؎ اُٹھ فریدا سُتیا ہُن داڑھی آیا بُور
اگّا نیڑے آ گیا تے پچھّا رہ گیا دور

میری داڑھی بھی فرید کی تھی.. اس میں سفیدی آ چکی تھی اور میرا آغاز بھی پیچھے رہ گیا تھا اور انجام بہت نزدیک آ گیا تھا۔

میرے پاس اتنے شب و روز باقی نہ تھے کہ میں دیوسائی کے سب ستاروں کو شمار کر سکتا..

اور یہ سب ستارے.. سارے کے سارے.. دیوسائی کے آسمان کے.. جو میرا گھیراؤ کرتے تھے.. وہ صرف میرے آس پاس اور اوپر ہی پلکیں نہ جھپکتے تھے بلکہ دیوسائی کی گھاٹیوں اور اونچے نیچے ٹیلوں میں بھی بکھرے ہوئے تھے.. اور ان میں سے دو ستارے ایسے تھے جو مجھ سے نیچے کہیں نشیب میں تھے اور لگتا تھا کہ کسی جھونپڑے کے چراغ ہیں جو جھلملاتے ہیں..

اور حیرت در حیرت کہ میں نے دیوسائی کے سارے کے سارے تاروں کو

مسلسل نظر میں رکھا لیکن ان میں سے ایک بھی ٹوٹ کر نہ گرا..

اگر گرتا تو میں اسے.. اس گرتے ستارے کو دعا کی طرح بلند ہوتے ہاتھوں میں وصول کرتا اور اسے سنبھال لیتا..

ان دنوں کے لیے.. جب حیات تاریک ہو جاتی ہے۔ کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ انسان کی آخری تنہائی اسے قبر کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کے سندیسے دیتی ہے.. آپ کھرے ہوتے ہیں اور کھوٹے ہونے لگتے ہیں.. ان دنوں کے لیے..

لیکن اس گنبد مینائی میں سے.. اس شب کوئی ایک ستارہ بھی ٹوٹ کر نہ گرا..

دیوسائی اے دیوسائی!

”دیوسائی کی خزاں رسیدہ گھاس اور ژالہ باری“

وادئ کالاش کی طرح...

یہ دنیا.. نہیں یہ دیوسائی بھی ایک سٹیج ہے جس پر ہم اپنے اپنے کردار ادا کرنے کے لیے آگئے تھے..

کیا ایک بادل مزید قریب ہو سکتا ہے؟

کیا ایک پھول اگرچہ مرجھایا ہوا اور خزاں رنگوں میں رنگا مزید مہک آور ہو سکتا ہے..

ہاں ایسا ہو سکتا ہے.. اگر آپ دیوسائی ٹاپ ہوٹل اور ہماری پچھلی شب کی خیمہ گاہ سے دائیں ہاتھ پر جو ٹیلے نظر آتے تھے، ان پر میری طرح گامزن ہوں.. سر جھکائے کسی ٹیلے پر بلند ہوں تو وہ بادل مزید قریب آسکتا ہے، آپ پر جھکتا چلا جاتا ہے اور اس کی نمی آپ کے گالوں پر دستک دیتی ہے..

میرے سامنے پہلے روز کی صبح سفر میں دیوسائی کا منظر کھلتا ہے...

پہاڑوں پر تازہ برف کی سفیدی کہیں کہیں اس منظر کو ڈھانپتی ہے لیکن دیوسائی کی خزاں رسیدہ گھاس بھی تو اس برف میں سے کہیں کہیں عریاں ہوتی ہے.. اس کی نیلگوں اور بھوری بناوٹ چھپتی نہیں.. جیسے ایک آفت خاتون اپنے تن کو اگرچہ

ایک سفید چادر سے ڈھانپتی ہے مگر کہیں کہیں وہ چادر بناوٹ کی مجبوری سے بدن سے کھسکتی ہے اور وہ کچھ دکھائی دیتا ہے جو پوشیدہ رہنا چاہیے..

اور میرے سامنے ایک پگڈنڈی ہے.. جس کے دونوں جانب گھنی گھاس میں ابھی تک چند پھول خزاں کی موجودگی سے انکار کرتے ہیں اور وہ بہار کے الوداعی مرجھائے ہوئے بوسے ہیں.. اور ان کے گرد برف کے وہ آثار ہیں جو تیز دھوپ کے باوجود ابھی تک نہیں پگھلے.. نرم اور سفید برف کے ان جزیروں میں سے سرخ جھاڑیاں اور خشک گھاس جھانکتے ہیں اور ظاہر ہوتے ہیں..

چنانچہ دیوسائی کی اس بلند سٹیج پر... بادل پینٹ کئے ہوئے لگتے تھے اور وہ بہت نیچے آچکے تھے.. ایک پگڈنڈی کے گرد براؤن گھاس اور مرتے ہوئے پھولوں کے گرد برف اگرچہ سفید ہے لیکن ماتم کرتی ہے۔ گھاس اور مرجھاتے پھولوں سے شکوہ کرتی ہے کہ تم نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا.. میری آمد سے بہت پہلے صرف اس لیے کہ بارشیں کم ہوئیں اور دیوسائی پر دھول اڑتی تھی، تم سوکھ کیوں گئے.. اس سے پیشتر جب میں گرتی تھی تو ایسے کھلکھلاتے پھولوں پر گرتی تھی جو اپنے رنگ دہراتے نہیں تھے.. ایسی مہک پر گرتی تھی جو اتنی گھنی ہوتی تھی کہ اس میں سے سرسراہٹ کے شائبے ایک سمفنی کی طرح اٹھتے تھے اور ہر شے کو عطر بیز کر دیتے تھے اور تم سب مجھ سے دب جاتے تھے۔ میرے بوجھ سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ تمہارا لچکیلا بدن دکھائی نہیں دیتا تھا اور صرف تمہاری سرسراہٹ سے پتہ چلتا تھا کہ میرے نیچے تم ہو..

بوجھ میں اگر محبت نہ ہو تو وہ بے شک ایک تنکے کا ہو... برداشت نہیں ہوتا۔

اگر اس میں عشق کی ذرّہ بھر حرارت ہو.. بے شک کاشانۂ چمن کے ایک جگنو کی بے نام حدت ہو تو... بے شک قراقرم کا سارا بوجھ ہو... محسوس ہی نہیں ہوتا..

اور میرے بوجھ میں تمہارے لیے محبت تھی.. لیکن جب میں گری... میں آئی تو تم مرجھا چکے تھے.. اس بلند سٹیج پر.. بادلوں کی سفید اور سرمئی جادوگری تلے... اس

پگڈنڈی پر جس پر میں ٹریک کی پہلی صبح چلتا جا رہا تھا... آس پاس وہ برف تھی جو ابھی
پگھلی نہ تھی.. پھول تھے، گھاس تھی.. جو آئندہ موسموں کے خواب میں گم ہو چکے تھے۔

ہم سب اس سٹیج میں چلتے جاتے تھے..

اور ہم ایسے اداکار تھے جن کے مکالمے اُس نیلو نیل نالے نے تحریر کیے تھے
جو تانگیل وادی میں سے اتر کر سندھ کی سرمئی چادر میں گھلتا ہے.. نانگا پربت کی
ٹھنڈک دار شام میں ترشنگ کی پگوڈا نما کھیت نے رقم کیے تھے۔ شاہ گوری کے بدن پر جو
نیل ہیں، یہ ان سے وجود میں آئے تھے.. یا شائد ور گوتھ جنگل کے کسی پرندے نے
اپنی لمبی دم کرومبر جھیل میں ڈبو کر یہ مکالمے ہماری حیاتی کی تختی پر لکھے تھے..
سنو لیک میں رواں کشتیوں کے بادبانوں پر یہ حرف تھے..

اور ہمیں یہ مکالمے از بر تھے.. ہم بُرے اداکار تھے لیکن ہمیں ڈائیلاگ یاد
تھے.. ہم انہیں ادا کرتے ہوئے اس سفر کی پہلی سویر میں برجی لاء کی جانب بڑھتے تھے
جب ٹپ ٹپ یخ آلود پانیوں کی بارش کے چند قطرے گرے... وہ برف پر گرے تو اس
میں جگہ جگہ چھید کئے.. گھاس اور مرجھائے ہوئے پھولوں پر گرے تو بے آواز اور گمنام
ہوئے.. اور پھر اگلے لمحے وہ اولوں میں بدل گئے.. چھوٹے چھوٹے اولے جو ہماری
گردنوں پر برس کر کمر تک ٹھنڈک کی لکیر بناتے تھے.. میری اونی ٹوپی پر سے پھسل کر
میرے ہاتھوں پر گرتے تھے..

"درّہ بُرجی لاء کے راستے میں شام"

اگرچہ ہم تعداد میں کل سات کوہ نورد تھے لیکن برجی لاء کی طرف بڑھتے ہم
صرف چار تھے..

حسن، میاں صاحب اور خالد ندیم کو دیوسائی کی بلندی نے زیر کر لیا تھا..
دیوسائی ٹاپ نے ان کے پھیپھڑوں میں سے آکسیجن کھینچ کر انہیں اپنا ماتحت بنا لیا تھا..

وہ آج صبح بخار اور سر درد میں مبتلا اپنے خیموں میں سے سرخ آنکھوں اور
اترے ہوئے چہروں کے ساتھ مجھے تکتے تھے اور کہتے تھے۔ "آپ جہاں جانا چاہتے ہیں،
چلے جائیں.. لیکن ہم لاچار ہو گئے ہیں.. بلندی ہمیں ایک کہنہ مشق پہلوان کی طرح
چاروں شانے چت کر چکی ہے... ہم سے چلا نہیں جاتا.. یہ درّہ... برجی لاء پتہ نہیں
کتنی بلندی پر ہے، کہاں ہے.. آپ چلے جائیں۔"

چنانچہ میں نے خورد و نوش کا سامان نصف کیا... پورٹر آدھے کئے اور ان سے
کہا۔ "ٹھیک ہے، ہم جاتے ہیں.. آپ لوگ اطمینان سے یہاں آرام کیجئے.. اور جب
طبیعت بہتر ہو.. آپ کا من چاہے.. دیوسائی روڈ پر مزے سے چلئے یا جیپ سواری کیجئے
اور آگے شتونگ کی کیمپنگ سائٹ تک پہنچ جائیے.. ہم برجی لاء کو جاتے ہیں.. رات
وہاں بسر کریں گے اور کل شام تک انشاء اللہ آپ کے پاس شتونگ میں پہنچ جائیں
گے.. آپ وہاں ریلیکس کریں اور ہمارا انتظار کریں.. اگر خدانخواستہ حالات بہتر نہیں

ہوتے، کسی ایک کی بھی طبیعت نہیں سنبھلتی تو بے شک نیچے سکردو میں اتر جائیں اور
کے ٹو موٹل میں آرام کریں.... ہم چند روز میں واپس آجائیں گے۔"

میاں صاحب کے کھنچے ہوئے، تنے ہوئے چہرے پر مایوسی تھی.. وہ بہت اَن تھک
کوہ نورد تھے.. ہم سے کہیں بہتر.. لیکن ان کے پاؤں نے انہیں بے بس کر دیا تھا..

خالد ندیم.. جو ایک اونٹ کی طرح لمبی مسافتیں پانی کے بغیر بھی سہار سکتا
تھا.. وہ بھی بلندی کی بے چینی میں مبتلا تھا..

اور حسن صاحب.. پہلی بار آئے تھے اور انہیں گھبراہٹ ہو رہی تھی یا شاید
وہ اس لیے اَن فٹ ہو گئے تھے کہ پچھلے ایک روز سے وہ بیگم کو فون نہیں کر سکے تھے..

چنانچہ سات کوہ نوردوں میں سے صرف چار عازمِ برجی لاء تھے... ہمارے
قدموں تلے ایک پگڈنڈی تھی اور آس پاس برف کے جزیرے تھے، گھاس اور مرجھائے
ہوئے پھولوں کی خلیجیں تھیں اور ہم پر اولے اس طرح گرتے تھے جیسے کسی سوہنی
لاہورن کے صحن میں کنکروں کے گرد لپٹے عاشقوں کے رقعے گرتے ہیں..

پہلے وہ ایک رومان پرور اشتیاق تھے، پھر وہ برفیلے آزار ہوئے اور ہم سر
جھکائے ان کی چھرّے دار بارش کو برداشت کرتے سر جھکائے چلتے رہے..

ایک کائی زدہ، نرم گھاس والا علاقہ آیا جس میں پانیوں نے گھات لگا رکھی
تھی.. دلدل تھی اور اس پر گھاس کے کیڑے معلق تھے..

اس کے بعد یکدم اترائی شروع ہو گئی..

نیچے بہت نیچے ایک وادی وسیع ہوتی نظر آئی.. اس کے درمیان میں ایک
ندی کا بہاؤ تھا اور اس کے پانی اگرچہ شدید نیلے تھے لیکن وہاں وہاں سفید ہوتے تھے
جہاں انہیں پتھر روکتے تھے..

ژالہ باری کے تسلسل میں کمی آنے لگی.. کم کم ہوئی اور پھر ختم ہو گئی..

لیکن ابھی اس ندی اور ہمارے درمیان سینکڑوں پتھریلی رکاوٹیں تھیں..
بڑے بڑے پتھر راستہ روکتے تھے اور مسلسل اترائی تھی.. اور ہم اترتے تھے تو اس رنج کی
گرفت میں اترتے تھے کہ ہمارے تین ساتھی ہمارا ساتھ نہیں دے سکے اور بلندی نے
انہیں ڈھیر کر دیا ہے..

لیکن اس میں ہمارا کوئی دوش نہ تھا.. دیوسائی کی سٹیج پر کھیلے جانے والے
ڈرامے کی سکرپٹ میں روزِ ازل سے لکھا تھا کہ یہ تین کردار دیوسائی پر پہنچ کر بقیہ اداکاروں
سے الگ ہو کر عارضی طور پر باہر ہو جائیں گے.. اور صرف چار اداکار ہوں گے جن پر سپاٹ
لائٹ پڑے گی اور وہ اس کی روشنی میں برجی لاء کی جانب سفر کرتے دکھائی دیں گے..

اگرچہ ہم چاروں کو اپنے مکالمے ازبر تھے لیکن ہم تھک چکے تھے اور رُک
رُک کر انہیں ادا کرتے تھے..

بلندی پر سے جو وادی ہمیں دکھائی دے رہی تھی اور اس کے بیچوں بیچ جو ندی
چمکتی تھی، ایک پکچر پوسٹ کارڈ لگتی تھی.. ایک ایسی تصویر لگتی تھی جو ہوتی نہیں پر
مصور کا تخیل اسے کینوس پر اتار لیتا ہے..

ایک ایسی وادی کو ہم سامنے دیکھتے تھے..

جب ہم اس کی آغوش میں اترے.. وادی کی گھاس اور تانبے کے سٹّے دار
پھولوں کی سطح پر آئے تو وہ ندی ایک ایسا فریب تھی جس میں شاعری اور خواب تیرتے
تھے.. ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا تھا.. ندی او ندی... ندیا کے پار... ندی تم نے
جھوٹ بولا تھا..

ہم اس کے کناروں پر چل رہے تھے جب ہم نے سراسر برف میں ملفوف
پہاڑوں کے نیچے ایک سرسبز ڈھلوان کے سائے میں.. سرخ رنگ کے مرجھائے ہوئے
پھولوں اور گھنی گھاس میں سے اٹھتا... دھواں دیکھا..

یہ دھواں اس وادی کی کٹیلی کٹار سرد ہواؤں میں ایک نامعلوم دھند کی طرح

اٹھتا تھا.. ایک نا آسودہ خواہش، ایک سلگتی ہوئی تمنا کی طرح.. شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے.. ایسا دھواں اٹھتا تھا..

ہمارے پورٹر ہم سے بہت آگے نکل چکے تھے اور اب وہ اس پکچر پوسٹ کارڈ ندی کے کنارے... سردی اور بادلوں میں بجھے بجھے سے سورج.. جو ایک ماہ نا تمام کی طرح تھا.. اس کی لَو میں.. ہمارے پورٹر دوپہر کا کھانا تیار کر رہے تھے.. اس لیے دھواں اٹھتا تھا۔ ہم خاصی دیر بعد اس دھوئیں کے قریب ہوئے اور اپنے رک سیک کندھوں سے اتار کر گھاس میں لیٹ گئے..

دائیں ہاتھ پر درّہ علی ملک کی چڑھائیاں تھیں جو بلند برف زار تک جاتی تھیں..

برف سے مسحور بلندیوں کے دامن میں.. ہم تھے..

یہ ایک اور مقام تھا جس میں ٹھہر جانے کو جی چاہتا تھا.. اس وادی کی درمیانی میں، عمر بھر کے لیے رک جانے کو جی چاہتا تھا..

ایک ہموار سطح کا سبز اور خزاں رسیدہ گھاس کا میدان جس میں ندی ایک سفید شریان کی طرح خاموشی سے اسے کاٹتی بہتی جاتی تھی.. اور یہ ندی وہاں تک جاتی تھی جہاں دیوسائی کی وہ برف آلود ڈھلوانیں تھیں جن کے دامن میں کہیں شتونگ کی کیمپنگ سائٹ تھی اور ہمیں برجی لاء سے واپس ہو کر اسی راستے سے کل شام تک وہاں پہنچنا تھا.. اس آس میں کہ ہمارے ساتھی صحت یاب ہو کر دیوسائی ٹاپ سے وہاں تک کا سفر کر چکے ہوں گے..

"برجی لاء کدھر ہے علی مدد؟" کوئی تھا جو گھاس میں لیٹا بولا تھا اور ہم سب کے لیے بولا تھا..

"بس قریب ہے سر.." اس نے اطمینان سے کہا۔ "ہم اس ندی کے ساتھ ساتھ چلتا جائے گا.. اور پھر ادھر سے.. جہاں سبزہ بہت ہے اور جھاڑیاں بہت ہیں اور گھنی ہیں، ہم ندی کو چھوڑ کر اوپر جائیں گے.. پھر بہت اچھا والا ایک جھیل آئے گا

جدھر ہم کیمپ کرے گا... اور کل صبح سویرے اٹھ کر درّے کے ٹاپ پر جا کر نظارہ کرے گا اور ادھر سے اتر کر اسی راستے سے واپس ہو گا اور شتونگ پہنچ جائے گا.."

"شتونگ کتنے بجے واپس پہنچ جائے گا؟"

"کل دوپہر کا کھانا ادھر کھائے گا.. دور نہیں۔"

"اور علی.. یہاں سے برجی لاء نزدیک ہے؟"

"بالکل نزدیک ہے۔" اس نے ہمیں مکمل یقین دہانی کروائی.. اور ہم انتہائی آسودہ اور آزاد محسوس کرنے لگے... اور ادھر نگاہ کی جدھر سبزہ بہت تھا اور ڈھلوان پر جھاڑیوں کی بہتات تھی اور ان پر گھنے بادل روشنی کو مدھم کرتے تھے تو وہیں کہیں بلندی پر برجی لاء تھا.. وہ جھیل تھی جس کے کنارے ہم نے اترنا تھا اور شب گزارنی تھی۔

کھانے کے بعد ہمارا جی نہ چاہا کہ اس مقام کو چھوڑ کر چلے جائیں.. یہاں کھلی وادی اور بہتی ہوئی ندی کے حسن اور دلکشی کی ایسی زنجیریں تھیں جو ہمارے وجود کو باندھتی تھیں.. ندی کنارے دور تک خزاں کی ڈسی ہوئی گھاس کی دبیز تہہ تھی اور اس میں کہیں کہیں نیلے پھول سر اٹھاتے تھے، پانیوں پر جھکتے تھے.. یہ نیلاہٹ کے وہ کرشمے تھے جو ابھی تک برقرار تھے، صرف اس لیے کہ بلندی کی وجہ سے ان پر خزاں ابھی حاوی نہیں ہو سکی تھی..

ہم نے اپنے اپنے رک سیک بے دلی سے کندھوں پر بوجھ کیے.. پورٹروں نے چولہے بجھا دیئے اور ہم برجی لاء کی بلندی سے صرف ایک منظر دیکھنے کی ہوس میں پھر سے چلنے لگے.. اور جب تا دیر چلنے کے بعد ڈھلوان پر بہت سبزہ دکھائی دیا اور گھنی جھاڑیاں نظر آئیں تو ہم نے ندی کنارے کو ترک کیا اور بلندی کے راستوں پر ہولے ہولے قدم دھرنے لگے.. ان راستوں میں بھی جو گُل بوٹے تھے، ان پر بھی خزاں ابھی اثرانداز نہیں ہو سکی تھی.. سکردو کے رہنے والوں کا کہنا تھا کہ دیوسائی کا یہ حصہ ان کا من

پسند تھا اور اسے وہ ایک چمن کا نام دیتے تھے.. اور یہ حقیقت ہے کہ پھولوں کے موسم میں یہاں واقعی غدر برپا ہوتا ہوگا.. ہریاول اور رنگوں کا باغ بہاراں جوبن پر ہوتا ہوگا..

اوپر سے کچھ نالے اتر رہے تھے..

بڑے بڑے پتھر تھے جن کے گرد چکر لگا کر راستے پر جانا پڑتا تھا..

ہم ہانپتے تھے اور بمشکل قدم اٹھاتے تھے.. مرجھاہٹ کی زد میں آئے ہوئے کچھ گُل بوٹے ایسے آئے کہ ہم نے ٹھہر کے انہیں دیکھا.. ایسے پھول جو تبسّم کر چکے تھے اور اب خزاں کی گود میں جا رہے تھے..

ملک لاء کی وادی اور اس کی ندی جہاں ہم نے ایک مختصر پڑاؤ کیا تھا، کہیں نیچے رہ گئی تھی اور پھر ایک گھاس بھری اوٹ میں ہوئی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی.. ہم سمجھے کہ یہ آخری بلندی ہے.. اوپر پہنچیں گے تو برجی لاء کی جھیل سامنے آجائے گی.. لیکن اوپر پہنچے تو ایک اور بلند دیوار سامنے آجاتی..

"جھیل کدھر ہے علی؟"

"ابھی نزدیک ہے صاحب..."

ہمارے قدموں میں گھاس سفید ہونے لگی... یہاں برف ابھی تک نہیں پگھلی تھی.. آس پاس جتنی بلندیاں تھیں ان پر بھی سوائے برف کے اور کچھ نہ تھا.. ہمارے بوٹ نرم برف میں دھنستے تھے اور ہم بمشکل چلتے تھے اور سانس کم آتا تھا اور ہمارے سامنے پورے دیوسائی پر شام اتر رہی تھی کیونکہ ہم میدانوں سے بلند ہو کر اس کے گرد کے پہاڑوں کی چوٹیوں کی سطح تک آچکے تھے.. ہم ان پہاڑوں کے روبرو تھے اور میدان نیچے ایک نیم دھندلکے میں ہمارے قدموں تلے بچھے ہوئے تھے.. اور جن پہاڑوں کے ہم روبرو تھے، وہ گویا ایسی دلہنیں تھیں جو شادی کے سفید لباس میں ڈھکی ساکت کھڑی تھیں، منجمد حالت میں ہمیں تکتی تھیں..

شام ہوتی جاتی تھی اور ہم میں سکت بھی کم ہوتی جاتی تھی..

"شہر میونخ میں - دیوسائی میں برف گرتی تھی"

"جھیل کتنی دور ہے علی؟"

"ابھی نزدیک ہے صاحب۔" اس نے یہی کہا۔

پر جھیل کبھی نزدیک بھی ہوتی ہے..

اگر وہ نزدیک ہوتی تو ایک جوہڑ ہوتی...

جھیل کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ وہ کبھی نزدیک نہیں ہوتی..

اس کے لیے سفر کرنا پڑتا ہے..

ہم ملک لاء کی وادی اور اس کی ندی سے ایسے بلند ہوئے کہ کھو گئے...

یہ دیوسائی کی شباہت والے علاقے نہ تھے.. ہم کہیں بلند پہاڑوں اور برفوں کے اندر بھٹک گئے تھے.. شاید میرے ساتھی دل ہی دل میں مجھے کوس رہے تھے کہ ہم دیوسائی کے میدانوں کو چھوڑ کر.. ادھر کیوں چلے آئے ہیں.. کسی نامعلوم سے درّے سے صرف ایک منظر دیکھنے کے لیے ادھر کیوں آگئے ہیں اور شام ہو رہی ہے اور.. ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، کدھر اور کیوں جا رہے ہیں۔ ہم نہ صرف بُری طرح تھک چکے تھے بلکہ نڈھال ہو چکے تھے.. اور بلند ہوتے چلے جاتے تھے.. اور جب ہم شائد دیوسائی کا گھیراؤ کرنے والے پہاڑوں کی بلند ترین سطح پر پہنچے اور ہم نے آس

پاس نظر کی تو یکدم رک گئے... دائیں جانب ایک وسیع وادی کے پار، برفانی بلندیوں میں
گھری ہوئی دو جھیلیں، دھند اور شام کی سیاہی میں کبھی دکھائی دیتی تھیں اور کبھی ایک
وہم، ایک خیال ہو جاتی تھیں.. مجھے ان کے وجود کا علم نہ تھا.. میں نے انہیں دیوسائی
کے کسی نقشے پر نہ دیکھا تھا.. یہ ایک دھندلایا ہوا سحر انگیز منظر تھا.. شام کے سرد سکوت
میں ایک طویل فاصلے پر وہ اپنی یکتائی کی تنہائی میں تھیں... یہ دیوسائی کے شاہانہ لبادے
میں سوت کے وہ تار تھے جو اسے متشرع کرتے تھے.. ہمیں ان تک جانا چاہیے تھا لیکن..
ہمیں جہاں جانا تھا، وہ جھیل کہیں دکھائی نہ دیتی تھی..

اور یہیں پر جب ہم سر شام ان دور کی جھیلوں کو حیرت سے تکتے تھے، برف کا
پہلا گالا گرا..

ہم نے اوپر دیکھا.. ایک مٹیالی سی دھند کا غبار تھا... ہوا نہیں تھی.. اور پھر
ایک تسلسل کا آغاز ہوا.. شام کو سفید رات میں بدلنے والی برف باری کا بہاؤ اترنے لگا..
دور کی وہ دو جھیلیں برفباری کے پردے میں پنہاں ہو گئیں..

یہ حیرت کے گیلے اور ٹھنڈے لمس کی شام تھی... جو ہم پر اترتی تھی۔

شام کی سیاہی کو یہ برفباری ایک موہوم مگر ڈراؤنی سفیدی میں بدلتی تھی..

برف کے گالے آہستگی سے اترتے تھے.. رخساروں پر گر کر انہیں سن کرتے
تھے.. ہانپتے ہوئے گرم سانسوں کو سفید ٹھہراؤ میں بدلتے تھے..

ہم چلتے جاتے تھے.. ایک سفید آسمانوں سے اترتے ہوئے آسیب میں نابینا
چلتے جاتے تھے..

"جھیل کہاں ہے؟"

"قریب ہے..."

"قریب ہے تو نظر کیوں نہیں آتی؟"

"برف گرتی ہے صاحب تو نظر کیسے آئے.. ویسے قریب ہے۔"

ہمارے قدموں میں اگرچہ اب سفیدی ہی سفیدی تھی لیکن کہیں کہیں ایک
نیلا پھول باغی ہو کر اس میں سے جھانکتا تھا اور اس کی نیلاہٹ شوخ اور دم بخود کر دینے
والی ہوتی تھی۔ کہیں گھاس اب بھی گرنے والی برف کو اپنی بھوری حدت سے پگھلاتی
تھی اور اس کے تنکے ظاہر ہوتے تھے۔

برفباری میں مزید شدت آ گئی اور وہ ہماری پلکوں پر گر کر انہیں بھی بوجھل
کرنے لگی.. ہم اس کی سفید قید میں تھے، اس کے اسیر تھے، اسے برداشت کرتے ہوئے
چلتے گئے.. ہم پل بھر کے لیے ٹھہر کر سانس بھی درست نہیں کر سکتے تھے کیونکہ
ٹھہرنے سے اس کا بوجھ بڑھتا تھا اور وہ نتھنوں کے آگے ہوا کو روکتی تھی..

اگرچہ ہم ایک معصوم اور زندگی کے لیے بے خطر آسان ٹریک پر آئے
تھے.. یہاں ہم جانتے تھے کہ قدموں کے نیچے کوئی خفیہ دراڑیں نہیں.. کوئی گلیشیر، کوئی
گہری کھائیاں نہیں.. جان لیوا گیلریاں اور پُر وحشت دریا نہیں لیکن بُرجی لاء کی جانب
جب ہم چلتے تھے تو ہر قدم برف میں دھنستا ہوا نیچے جاتا تھا... اور نیچے وہ پتھر تھے جو
برفباری کے باعث روپوش ہو چکے تھے اور ان کے درمیان میں اگر قدم گہرا ہوتا تھا تو
ٹانگیں چھل سکتی تھیں، ٹخنے زخمی ہو سکتے تھے.. کسی بڑے پتھر پر پاؤں ترچھا ہو کر ہمیں
معذور کر سکتا تھا..

اور شام ہو گئی تھی اور جھیل دکھائی نہ دیتی تھی..

ہمارے منصوبوں میں کہیں بھی کوئی ایڈونچر... کوئی دلیری کوئی مہم جویانہ
روح نہ تھی.. صرف دیوسائی کے میدانوں میں ایک بے پروا واک تھی، ایک غم اور
تھکاوٹ سے ناآشنا ٹریک تھا جو ہمارے منصوبوں میں تھا لیکن ہم نے خواہ مخواہ برجی لاء
کا پنگا لے لیا تھا..

دیوسائی ٹریک میں بُرجی لاء ڈال کر ہم اسے متشرع نہ کرتے تو ہماری مسلمانی
کونسی خطرے میں پڑ جاتی... آخری عمر میں مسلمان ہوں گے تو اسی طرح ٹھوکریں

کھاتے، برف میں دھنستے خجل خوار ہوتے خاک مسلماں ہوں گے..

کیا یہ ضروری تھا کہ آج سے ستّر برس پیشتر اگر ایک انگریز سیاح برجی لاء پر پہنچ کر اس ایک منظر کی توصیف کرتا ہے تو ہم بھی اس کی نقّالی میں اپنے آپ کو آزار میں ڈالیں.. برف کے ایک طوفان کو سہتے جائیں... اس عذاب میں راستہ گم کردیں اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں..

برفباری اتنی شدت اختیار کرگئی کہ ہرسو ایک سفید اندھیرا چھا گیا..

ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ اگلا قدم جو ہم برف کے ماتھے پر دھرتے ہیں تو یہ کتنی گہرائی میں جا کر رکے گا.. یا کسی پتھر سے ٹکرائے گا.. یا دو پتھروں کے درمیان اترے گا اور ٹانگ کو خون آلود کردے گا.. ٹخنے تو چھل چکے تھے..

شام مزید گہری ہوگئی..

ہم مزید تھک گئے..

اور کہیں ہمارے سامنے سیاہ پتھر ابھرتے تھے اور انہیں برف کی سفیدی نمایاں کرتی تھی.. اور کچھ سُجھائی نہ دیتا تھا..

برفباری ایک خوابناک رومان کی بجائے، ایک آفت، ایک اذّیت کی شکل میں ہم پر یلغار کرتی تھی..

آسمان ایک نیم تاریک سفیدی میں لپٹا ہوا کفن تھا..

علی کہیں دور جا چکا تھا..

ہم پورٹروں سے بچھڑ چکے تھے..

میرے ساتھی جانے کہاں تھے.. شاید میرے برابر میں.. شائد کہیں دور.. کچھ نظر نہ آتا تھا.. میں یہاں، کہاں سے آیا تھا..

میں تنہا تھا اور دورافتادہ تھا.. اور کہیں بلند پہاڑوں میں تھا.. کسی شام میں تھا.. کسی برف کے عذاب میں تھا.. ایک سفید قید میں تھا اور تنہا تھا اور جانے کہاں سے آیا

تھا.. جانے کہاں سے چلا تھا.. کوفہ سے چلا تھا یا بغداد سے.. مسجد قرطبہ سے سفر شروع کیا تھا یا قصرالحمرا کے شیروں کے صحن سے.. شاید میں فتوحاتِ مکیّہ کے مصنف ابن عربی کی جائے پیدائش مُرسیہ سے چلا تھا، جہاں میں نے ان کے عہد کی ایک مسجد کے آثار تلاش کرلیے تھے.. تو میں کہاں سے آیا ہوں.. میرا سفر کہاں سے شروع ہوا تھا..

میرے اندر اس برفباری میں کسی مندر کا گھڑیال بجانے کی خواہش بھی موجود تھی... مہاتما بدھ کے بند پپوٹے بھی مجھے تسکین دیتے تھے۔ دیوارِ گریہ کی کوئی ایک اینٹ میرے وجود کی عمارت میں بھی چنی گئی تھی.. کسی کلیسا کی گھنٹیاں بھی کسی نہاں خانے میں گونجتی تھیں..

تو میں کہاں سے آیا ہوں..

گزرے زمانوں کا ایک قصّہ ہے.. بیس برس ہوگئے ہوں گے.. میرا سفرنامہ "خانہ بدوش" شائع ہوا.. ایک دوست یورپ سے لوٹتا ہے، مجھ تک پہنچتا ہے اور کہتا ہے "تمہارا نیا سفرنامہ "خانہ بدوش" چھپ گیا ہے.. میں نے اسے اپنے راستے میں دیکھا ہے۔"

"کہاں دیکھا ہے؟" میں دریافت کرتا ہوں۔

"یورپ سے واپسی پر میں عمرے کے لیے سعودی عرب میں ٹھہر گیا.. مسجد نبوی کے سامنے ایک بک سٹال تھا جہاں میں نے اسے دیکھا.. بُک سیلر نے اس کی متعدد کاپیاں دکان کی پیشانی پر سجا رکھی تھیں.."

"خانہ بدوش" کے سرورق پر سعید اختر کی بنائی ہوئی میری ایک پورٹریٹ کا خاکہ تھا.. میری شکل تھی۔

"تم یہ بتاؤ کہ کتاب کے سرورق کا رخ کس جانب تھا؟"

"مسجد نبوی کی جانب.." اس نے صرف اتنا کہا۔

اور جب اس نے یہ کہا کہ.. "خانہ بدوش" کے سرورق پر جو تمہاری پورٹریٹ ہے، اس کا رخ اس جانب ہے جہاں کا شانۂ نبی ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے.. مجھ

سے برداشت نہ ہوا.. کہاں میں.. اور کہاں یہ مقام.. اللہ اللہ..

میری اتنی طویل اور لایعنی ادبی مسافتیں بالآخر میرے کام آئیں... میرا چہرہ مسجد نبوی کے روبرو تھا..

اور اس کے باوجود میں وہ کیکر تھا.. جس پر انگور کی کئی بیلیں چڑھتی تھیں.... مسجد قرطبہ.. مندر کے گھڑیال، بند پوٹوں، دیوار گریہ اور گھنٹیوں کی بیلیں.. اور ان کا ہر گچھا زخمایا جاتا تھا.. ناں میں مومن وِچ مسیتاں..!

میں کہاں سے آیا تھا..

تو برف کے اس عذاب میں.. ڈھل چکی شام میں.. بلند پہاڑوں میں کہیں مجھے کچھ یاد نہ تھا کہ میں کہاں سے چلا تھا..

برف آہستگی سے اترتی تھی اور نابینا کرتی تھی..

پاؤں اٹھتے نہ تھے..

تاریکی گہری ہوتی تھی..

جب منزل پہ یقین اٹھتا جاتا تھا.. تب ہم نے اس جھیل کو دیکھا..

ہم اس لمحے میں نہیں جانتے تھے کہ ہم نے کسی جھیل کو دیکھا.. تب ہم نے برفباری کی نیم سفیدی میں کسی نیم سیاہ دھوکے کو سفیدی سے الگ دیکھا.. اس رات میں بدلتی شام میں.. برفباری کی شدت میں.. ہم کوہ نوردوں نے جن کے بدن برف تھے اور تھکن سے منجمد تھے اور ان کے پاؤں گھٹنوں تک برف کے اندر جاتے تھے، ہم نے ایک شائبے کو دیکھا.. اور اس جھیل شائبے اور دھوکے کو برفباری کے نقاب کے پیچھے دیکھا تو وہاں..

برف گرتی تھی ساز بجتے تھے..

شہر میونخ میں یقیناً آج کرسمس تھی..

برف ایک سناٹے میں بے آواز گرتی تھی اور اس میں جو ساز بجتے تھے۔

ہماری سانسوں کے بے ربط ساز تھے.. نرم برف میں جب بوٹ دھنستا تھا اور اس کی ٹھنڈک میرے ٹخنوں سے چمٹ کر پنڈلیوں پر اثر کرتی تھی تو اس کی خاموش سرسراہٹ.. بوٹ کی برف میں دھنسنے کی خاموش سرسراہٹ ایک ساز تھی۔

شہر میونخ میں یقیناً آج ہی کرسمس ہو گی... بے شک یہ اگست کے آخری دن ہیں.. لیکن ماہ و سال کے یہ حساب کتاب تو میدانوں کے ہیں.. یہاں برجی لاء کے راستے میں تو دسمبر تھا اور برف گرتی تھی.. اور کہیں کوئی کرسمس ٹری نہ تھا جس پر رنگ رنگ کی مختصر روشنیاں جھلملاتی ہوں، کرسمس کے تحفے رنگین کاغذوں میں لپٹے میرے منتظر ہوں... یہاں تو صرف ایک سرمئی فسوں تھا.. میری نیلی جیکٹ پر سفید گالے گرتے تھے.. جیکٹ اور میری اونی ٹوپی کے درمیان گردن کا جو حصہ ہوا کو محسوس کرتا تھا اس پر گیلے بوسے گرتے تھے اور آزار دیتے تھے.. اور سامنے.. چھوٹے بڑے پتھروں کے سیاہ وجود کے گرد سفیدی بیٹھتی جا رہی تھی اور ان سے پرے وہ جھیل تھی جس کا کوئی آسمان نہ تھا، صرف ایک سرمئی چادر اس پر اتری ہوئی تھی.. ہماری آنکھوں کے آگے گرتی برف کی جھالر میں سے ایک سیاہ شائبہ دکھائی دیتا تھا جو جھیل ہو سکتا تھا.. اور اس کے کنارے چند پتھر تھے اور ان کے برابر میں میرا خیمہ تھا جو پورٹر لگا چکے تھے..

یہی میرا شہر میونخ تھا..

برف کے سفید صحراؤں میں ابھرتے سیاہ پتھروں کے پار... ایک ایسی جھیل جس پر برف گرتی تھی اور اس کے کنارے میرا خیمہ.. میرا شہر میونخ تھا..

خیمہ تھا یا ایک سراب تھا..

میں بہت اذیت میں.. مشکل سے.. گرتا پڑتا.. اس سراب خیمے اس شائبہ جھیل کے کناروں تک پہنچا..

"برفباری.. برف آزاری کی رات..
نکتۂ انجماد سے کہیں نیچے"

علی میرا منتظر تھا..

خیمے پر اتنی برف تھی کہ وہ کسی اسکیمو کا اِگلو لگ رہا تھا..

اور یہ وہ علی نہ تھا جو سکردو کے بازار میں پرانے بوٹ فروخت کرتا تھا اور قصائی رہ چکا تھا بلکہ صدپارہ گاؤں کا ایک اور علی تھا جو پورٹر کے طور پر ہمارے ساتھ آیا تھا اور بہترین کُک تھا اور اس علاقے کے چپّے چپّے کو جانتا تھا اور ایک خدمت گزار اور ہمدرد شخص تھا.. اور ہم خوش بخت تھے کہ وہ ہمارے ساتھ تھا..

اس نے خوش آمدید کے طور پر خیمے کے کپڑے کو زور زور سے جھٹک کر اسے برف کے بوجھ سے آزاد کیا.. کسی حد تک آزاد کیا اور پردہ اٹھا کر کہنے لگا۔ "صاحب.. آپ اندر چلو.. ادھر موسم بہت حرامی ہو گیا ہے.. میں کافی بنا کر لاتا ہوں.."

میں اپنے جونک نما یا کچھوا طرز کے خیمے کے آگے گر کر اس میں رینگنے کو تھا تو اس نے کہا۔ "صاحب آپ کے رک سیک اور جیکٹ اور ٹوپی پر جو برف ہے، اسے جھاڑ کر اندر جاؤ ورنہ آپ کا سلیپنگ بیگ گیلا ہو جائے گا اور برف ہو جائے گا.."

میں پھر سے اٹھا.. سیدھا ہوا.. ایک بھیگے ہوئے کتے کی طرح اپنے بدن کو

متعدد بار جھٹک کر اس پر جمی برف کو کسی حد تک جھاڑا "علی... ہمیں کسی نے نہیں بتایا تھا کہ ادھر اتنا برف گرتا ہے.."

"نہیں گرتا صاحب.. لیکن یہ دیوسائی ہے، ادھر دیو لوگ کا گھر ہے.. کیا پتہ کب برف گرا دے.. کب اولے گرائے اور کب بارش لائے.. یا کب اتنا دھوپ ہو جائے کہ ادھر کربلا ہو جائے اور لوگ پیاس سے مر جائے.. یہ دیوسائی تو ایسا ہے صاحب..."

تاریکی میں بھی ہر جانب برف کی سفید سلطنت تھی.. اور اس پر مزید برف گرتی تھی.. میں ایک بوسیدہ پھل کی طرح اپنے خیمے کے اندر ٹوٹ کر گرا.. نڈھال اور اکڑا ہوا.. اور شدید خوف میں کہ میرا بدن اب جواب دے جائے گا.. اتنی تھکاوٹ، اتنی بلندی اور اتنی سردی سہہ نہ سکے گا..

میرے خیمے کا فرش گیلا ہو چکا تھا.. وہ برف کی ایک دبیز تہہ پر ایستادہ کیا گیا تھا اور اس کی واٹر پروفیت جواب دے چکی تھی .... البتہ ڈاؤن میٹرس پر کھلا ہوا میرا سرخ سلیپنگ بیگ اگرچہ اتنا ہی سرد تھا جتنی کہ باہر گرتی ہوئی دل آزار برف.. لیکن وہ گیلا نہ تھا.. خشک تھا.. میں نے خیمے میں داخل ہو کر اس تک پہنچنے کے دوران سانس درست کرنے کے لیے تین قیام کیے.... اس تک پہنچا.. اس کی زِپ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ جامد ہو چکی تھی اور میں زِپ کھولے بغیر رینگتا ہوا اس میں داخل ہوا اور ہانپنے لگا.. ہر ایک سانس کے لیے جدوجہد کرنے لگا..

سانس نہیں آتا تھا..

متلی سی ہو رہی تھی..

سر میں درد بھی تھا.. لیکن بھوک نہیں تھی..

سانس ذرا بہتر ہوا تو میں نے ٹارچ جلا کر اُسے خیمے کی چھت میں لٹکے ایک چھلّے میں پھنسا کر لٹکا دیا..

باہر.. برف گرنے کی کوئی آواز نہ تھی..

لیکن وہ گرتی تھی.. کیونکہ خیمے کی چھت اس کے بوجھ سے نیچی ہوتی چلی جاتی تھی... جھکتی چلی جاتی تھی.. اور میں ہاتھ اٹھا کر خیمے کے کپڑے کو جھٹکتا تھا۔ اسے بوجھ سے خالی کرنے کی کوشش کرتا تھا..

اگر شب بھر برفباری کا یہی چرچا رہتا ہے تو مجھے جاگنا ہوگا، ہر چند لمحوں بعد خیمے کے کپڑے کو جھٹک کر اس پر جمع شدہ برف کو جھٹک کر گرانا ہوگا ورنہ... یہ خیمہ اس کے بوجھ سے دب سکتا ہے.. اور میں.. ایک سفید قبر کی ٹھنڈک میں فی الحال مدفون نہیں ہونا چاہتا تھا...

میرا سانس بے ربط ہو رہا تھا..

میری رانوں کے بیچ بہت دکھ دینے والی خون آلود جھریٹیں جنم لے چکی تھیں..

یہ ٹریک کا پہلا دن تھا.. ابھی عادت نہیں تھی اور مسلسل چلنے سے اب عمر رسیدہ ماس آپس میں رگڑ کھاتا تھا اور وہاں جلد سرخ ہو کر ایک زخم کی صورت اذّیت دیتی تھی..

مجھے کسی کروٹ چین نہ آتا تھا..

نہ میں بیٹھ سکتا تھا.. نہ لیٹ سکتا تھا..

مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری ٹانگوں کے درمیان رانوں میں ٹیسوں کے انگارے ہیں، درد کی شدت کے گھاؤ ہیں جو گہرے ہوتے ہیں اور ان پر کوئی سرخ مرچیں چھڑکتا ہے.. اور سر میں ایک شاندار اذّیت والا درد ہے جو بلبلوں کی طرح پھٹتا چلا جاتا ہے..

مجھے اپنے اس جونک نما کچھوے کی سرشت اور شکل کے خیمے سے ہمیشہ شکایت رہی تھی.. جھیل کرومبر کے کناروں پر بھی اور سوختر آباد کے سنو ٹائیگرز کی لشکتی آنکھوں کے سامنے بھی کہ میں... اس کے اندر آسانی سے داخل نہیں ہو سکتا تھا.. رینگتا ہوا.. چوپایوں کی مانند اس کے اندر داخل ہوتا تھا اور یقیناً خیمے کے باہر جو لوگ

مجھے یوں رینگتے ہوئے دیکھتے تھے تو میرا پشتی نظارہ یعنی بیک ویو دیکھتے تھے اور میں نے اگرچہ اپنا یہ ویو نہیں دیکھا لیکن یہ جانتا ہوں کہ یہ زیادہ دلفریب نہیں ہوگا.. لیکن.. یہاں درّہ برجی لاء کے دامن میں.. اس دل آزار.. برف آزار.. بلندی کے جماؤ کی اس رات میں.. میں نے اس خیمے کی بہت قدر کی... اس کی ستائش کی.. ایک محبوبہ کی مانند اس کی توصیف کی کہ.. اے خیمے اگرچہ تیری کچھوا نما شکل ایسی ہے جس میں رینگ کر میں بمشکل اندر جاتا ہوں لیکن آج میں تیرا شکر گزار ہوں کیونکہ تیری بناوٹ کے باعث.. باہر کی برف.. باہر ہے.. باہر جو کچھ بھی ہو رہا ہے تو نے مجھے اس سے محفوظ کر دیا ہے.. اور تمہارے اندر میرا اپنا گھر ہے.. اگرچہ اکڑا ہوا.. دل آزار گھر ہے.. لیکن میں تیرا شکر گزار ہوں کہ میں تیری پناہ میں ہوں..

باہر.. برف ایک دشمن قبیلے سے بدلہ لینے والے... بلوچ ہٹ والے ہٹ دھرم بلوچ کی طرح بے رحمی اور سفاکی سے گرتی جاتی تھی..

میرے خیمے کے باہر کوئی آیا.. برف کے دبنے کی آواز تھی.. علی جھکا اور پردے میں سے جھانکا۔ "صاحب کافی...."

میں اپنے سلیپنگ بیگ کی گرفت میں رہتے ہوئے ذرا آگے ہوا اور کافی کا مگ تھام لیا.. میرے خیمے سے اوپر ایک ٹیلے پر چند سیاہ پتھروں کی اوٹ میں کچن ٹینٹ کی نیلی ترپال تنی ہوئی تھی اور وہاں سے یہاں تک آتے آتے کافی کی گرمی تقریباً زائل ہو چکی تھی.. لیکن اس کے پہلے گھونٹ نے مجھے بے حد آسودہ کیا..

اتنا آسودہ کہ برف کے گالے جو میرے خیمے پر مسلسل گرتے تھے، ان کی خاموش سی سرسراہٹ ایک سمفنی کی صورت میرے کانوں میں اترنے لگی.. اور اس کافی کے ایک مگ نے.. برجی لاء جھیل کنارے برف کی سفید آفت کے بوجھ تلے شدید سر درد میں مبتلا اس کا ایک گھونٹ بھرتا تھا تو اس ایک گھونٹ کے ساتھ میں ان تمام کافی کے پیالوں اور مگوں کی قربت میں ہوتا تھا جو میں نے آج تک حلق سے اتارے تھے..

میں نے پہلی کافی کہاں پی تھی؟..

شائد نوٹنگھم کے کافی بار "ال گریکو" میں.. جرمن لڑکی ہلتر وڈ کی رفاقت میں.. صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اگرچہ میرے سکول ڈیز.. مسجد تاجے شاہ نارمل سکول گکھڑ منڈی.. رنگ محل مشن ہائی سکول۔ مسلم ماڈل ہائی سکول وغیرہ میں انتہائی دیسی طریقے سے گزرے تھے لیکن مجھ میں اعلیٰ تہذیب کے جرثومے موجود ہیں.. میرے اندر کلبلاتے ہیں اور میں کافی پی سکتا ہوں.. صرف یہ ثابت کرنے کے لیے میں نے اس تمبا کو ذائقے والے کڑوے مشروب کو بمشکل نگلا..

بہت بعد میں مجھ پر کھلا کہ جتنے بھی تلخ ذائقے ہوتے ہیں، یہ بے شک کافی ہو، چاکلیٹ ہو، ہالینڈ کا پنیر ہو، الکوہل ہو یا.. زندگی ہو.. ان کے لیے ذوق کی پرورش کرنا پڑتی ہے.. اور ایک بار ان کی عادت جڑیں پکڑ جائے تو پھر... چھٹتی نہیں ہے منہ کو..

.بہر طور یہ طے تھا کہ برجی لاء کی برفانی رات میں... یہ ایک کافی... روم کے ویا وینتو، پیرس کے شانزے لیزے، سٹاک ہوم کے کنگز گاٹن، ہیمبرگ کے ریپا بہان، لنڈن کے سوہو.. اور ارض روم اور قرطبہ میں پی جانے والی کافیوں سے کہیں سپیریئر تھی..

میں نے کافی ختم کی اور علی کو پکارا۔ "یار تھوڑا سا گرم پانی مل سکتا ہے، لوٹے میں؟"

"صاحب ہم اوپر کچن ٹینٹ میں سٹوو جلاتا ہے اور اس پر جو کچھ رکھتا ہے، وہ گرم نہیں ہوتا.. ہر طرف برف ہی برف ہے.. کوشش کرتا ہوں.. لیکن ابھی تو لوٹا نہیں ہے صاحب.. میاں صاحب اس کو لے کر ایک بڑے پتھر کے پیچھے بیٹھا ہے اور گانے گاتا ہے۔"

ہمارا لوٹا ایک عجیب تاریخی لوٹا تھا.. اس کا ہماری سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا.. کیونکہ یہ اس سے کہیں زیادہ معزز اور معتبر تھا.. یہ ہمیشہ ہمارا ساتھ دیتا تھا، لڑھک کر کہیں اور نہیں چلا جاتا تھا..

میرا سر درد شدید ہوتا چلا گیا..

مجھے یقین ہے کہ دنیا کا کوئی بھی عظیم مصنف، کوئی ٹالسٹائی کوئی گارسیا مارکیز میرے اس شدید سر درد کو بیان نہیں کر سکتا.. کیونکہ جس تن لاگے سو تن جانے.. نہ صرف درد کی شدت میرے سر کو میدان کارزار بناتی تھی جس میں ہینڈ گرنیڈ، اینٹی ٹینک گنز اور منی ایٹم بم اور پتہ نہیں کیا کیا پھٹ رہا تھا بلکہ بدن کی تھکن اور اس میں اٹھتی ٹیسیں ایسی تھیں.. ٹانگوں کی شریانیں اور پٹھے ایسے تھے کہ الو کے پٹھے ہو چکے تھے اور ان میں ایک جلتا ہوا تیزاب، درد اور کٹاؤ کا بہتا چلا جا رہا تھا.. اور اس آج تک نہ سمجھ میں آنے والے فلمی گانے کا مطلب اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ جگر چھلنی ہے، دل گھبرا رہا ہے.. اور محبت کا جنازہ جا رہا ہے..

گھبراہٹ اور تھکن جو بدن کے دھندلاتے شیشے کو کرچیوں میں بدلتی تھی.. سر درد جو آنکھوں میں آنسو اتارتا تھا اور سردی جو رگ و پے میں برف کے کرسٹل جما رہی تھی... اور برف جو چپ چاپ گرتی چلی جا رہی تھی..

"صاحب لوٹا آ گیا ہے.." علی لوٹا تھامے رینگتا ہوا میرے خیمے میں آیا..

"اسے باہر رکھ دو۔"

"جی صاحب.." وہ پچھلے پاؤں رینگتا ہوا پیچھے ہو گیا..

اور یہ میں جانتا ہوں کہ میں اس لوٹے کے لیے اپنے سلیپنگ بیگ میں سے کیسے نکلا.. اس میں سے نکلا.. سانس درست کیا.. پھر رینگتا ہوا خیمے کے پردے تک گیا.. یعنی دو چار ہاتھ تک.. پھر ہانپ کر سانس بحال کیا.. پھر چپل پہنی جو سردی سے لوہا ہو چکی تھی اور پھر باہر آیا... لوٹے میں ڈیٹول کے چند قطرے ڈال کر اس کے نیم گرم پانی سے اپنی رانوں میں آئی ہوئی خراشوں اور ٹیسوں کو دھویا... اور کیا بیان کیا جائے کہ کیسی فرحت محسوس کی.. سخت برف پر اپنی لوہا چپل کو پھسلنے سے بچاتے ہوئے.. زیریں حصہ جات کو ظاہر کرتے ہوئے اور انہیں منجمد ہوتے محسوس کرتے ہوئے.. اور ہمہ وقت سر جھکائے بیٹھے ہوئے کہ.. برف لگاتار گر رہی تھی..

میں خراشوں کی دُھلائی کے بعد اٹھا.. ٹریک سوٹ کی پتلون کو اوپر کرنے کی
کوشش کی تو وہ ٹخنوں کے آس پاس سردی سے پتھر ہو چکی تھی.. اسے بڑی مشکل سے
چڑھایا اور پھر آس پاس نگاہ کی.. صرف یہ جاننے کے لیے کہ.. یہ کونسی جگہ ہے، یہ کون
دیار ہے؟ میں نے یہ سوال پوچھا تو کھٹ سے جواب آیا.. بچّے یہ وہی دیار ہے جس کے
لیے تم سال بھر بے چین رہتے ہو.. گھر کا سکون ترک کر کے دربدر ہوتے اور پھر
پچھتاتے ہو.. اور اب پوچھتے ہو کہ یہ کونسا دیار ہے.. لیکن خدا گواہ ہے کہ اُس برس تو میں
ہرگز اِس عشق کا تمنائی نہ تھا جو جی کو جلائے، رلائے.. اور ایسی محبت سے تو ہم باز آچکے
تھے.. میں نے تو نہایت شریفانہ، معصومانہ اور شرعی قسم کے ٹریک کا چناؤ کیا تھا اور قطعی
طور پر میرے منصوبوں میں اس دیارِ برف کی زیارت اور ذلّت نہ تھی.. اس برفیلی رات
میں ایک عدد لوٹے کے ساتھ سنومین بننے کی خواہش نہ تھی..

مجھے اب معلوم ہوا کہ انگلستان میں اپنی زندگی کی پہلی برفباری کے بعد جب
میں نے گھر کے صحن میں ایک سنومین بنایا تھا، آنکھوں کی جگہ دو کوئلے فٹ کئے تھے
منہ میں پائپ دیا تھا اور گلے میں مفلر لٹکایا تھا تو اس غریب کے احساسات کیا تھے.. اس
غریب کا دل بھی برف کا تھا.. اس کی رگوں میں جو خون تھا، وہ بھی برف کا تھا اور وہ بھی
پکارتا تھا کہ.. رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل.. اور جو آنکھوں سے ہی نہ
ٹپکا وہ لہو کیا ہے..

میں اس لمحے.. برجی لاء کے دامن میں برفباری کی اس رات میں ایک عدد
لوٹا تھاے اُسی سنومین کا ایک کزن ہوا کرتا تھا.. صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ اپنی
رانوں میں آئی ہوئی خون آلود خراشوں کو ڈیٹول اور گرم پانی سے دھو نہیں سکتا تھا..
میں نے ایسا کر لیا تھا اور اب نسبتاً آسودہ اور قرار میں تھا.. اور میں وہ بیمار تھا جسے ڈیٹول کی
وجہ سے قرار آگیا تھا.. اور وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا..

میں نے ایک مرتبہ پھر ایک فرمانبردار ڈوگی کی طرح اپنے بدن کو ایک ڈگڈ

کی مانند ہلا جلا کر برف جھاڑی اور رینگ کر اپنی خیمہ غار میں جا لیٹا.. میں بہت بہتر
محسوس کر رہا تھا..

باہر برف ایک سناٹے میں اترتی تھی.. ایک ایسی ٹرین کی طرح جو رات کی
خاموشی میں نہ وہسل دے اور نہ اس کے پہیّوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے اور وہ خاموشی
سے گزرتی جائے..

"صاحب کھانا کیا کرے گا؟" علی کی آواز سنائی دی.. جیسے کرچیوں کو ریزہ
ریزہ کرتی ٹھٹھرتی ہوئی آتی ہو..

"میری طبیعت ٹھیک نہیں.. کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہتا.. متلی کی
کیفیت ہے.. کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

"نہیں صاحب.." وہ دونوں ہاتھوں کے سہارے رینگتا ہوا اندر آگیا۔

"ادھر ہائٹ پر کھانا بہت ضروری ہے.. بھوک نہیں لگتا لیکن کھانا ضروری ہے.. ہم
نے صرف آلو کا شوربہ بنایا ہے تو وہ لاتا ہوں.. تھوڑا کھا لو.. اوپر کچن ٹینٹ میں بہت
سردی ہے.. ایک دو پورٹر بیمار پڑ گیا ہے۔"

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ یہ صرف میں نہ تھا جو اس برف سفیدی کے انجماد کا
عذاب سہتا تھا... وہ پورٹر بھی تھے جو ایک نیلی ترپال کے نیچے تقریباً کھلی فضا میں اپنے
بوسیدہ کمبلوں میں لپٹے برف کے بے رحم بہاؤ کی زد میں تھے.. ایک ایسے دیار میں تھے
جسے دیکھنے کا انہیں کوئی اشتیاق نہیں نہ تھا... کوئی خواہش، کوئی ہیجان نہ تھا.. صرف پیٹ
کی مجبوری انہیں یہاں لے آئی تھی..

"نہیں علی.. بالکل جی نہیں چاہتا۔"

"صاحب کھانا نہیں کھائے گا تو رات کو نیند نہیں آئے گا.. پاگل ہو جائے گا۔"

"پاگل تو پہلے سے ہے علی جو یہاں آیا ہے.."

"زیادہ پاگل ہو جائے گا صاحب.. ادھر ان علاقوں میں جب برف بہت گرتا

ہے اور ہر پتھر اور پانی اور ہر شے کو ڈھک دیتا ہے تو جو صاحب لوگ ادھر آتا ہے بلندی اور سردی کی وجہ سے بہک جاتا ہے.. عجیب عجیب باتیں کرتا ہے.. آپ کھانا نہیں کھاؤ گے تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔"

میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ "ٹھیک ہے.. کچھ لے آؤ۔"

ٹارچ کے سیل سردی کی وجہ سے کمزور ہو رہے تھے.. اس کی روشنی میں پیلاہٹ اس طرح نمایاں ہوتی تھی جیسے قربت مرگ میں مریض کا چہرہ زرد ہوتا ہے.. پھیکی، زرد اور بجھتی ہوئی ٹارچ کی روشنی...

برف گرتی تھی..

یہ کیسا شہر میونخ ہے جہاں کرسمس نہیں ہے اور پھر بھی برف گرتی ہے..

علی کھانا لے آیا..

آلو کا شوربہ اور چپاتیاں... میں صرف ایک چپاتی مشکل سے نگل سکا.. صرف اس لیے کہ میں پاگل پن سے بچ سکوں.. ساری عمر دیواروں سے باتیں نہ کرتا رہوں..

"پانی..."

علی نے مگ اٹھایا اور مجھے تھما دیا... میں نے ہونٹوں سے لگایا تو میرے حلق میں کچھ بھی نہ اترا۔ "یہ تو جم گیا ہے علی.."

"ابھی اور لاتا ہوں صاحب.. تازہ برف کا بناتا ہوں۔"

"اسے پھونکیں مارتے آنا تاکہ پھر سے جم نہ جائے.."

"پھونکیں مارنے سے تو وہ اور ٹھنڈا ہو گا صاحب.. چائے کی طرح۔" وہ ہنستا ہوا چلا گیا..

کچھ دیر بعد پھر آیا اور مگ تھما کر کہنے لگا۔ "جلدی سے پی لو صاحب.. نہیں تو پھر برف ہو جائے گا.."

اس کے جانے کے بعد میں لیٹ گیا..

باہر برف بدستور گرتی تھی اور درجۂ انجماد 16 ڈگری سے نیچے جا چکا تھا..

میں نے تہیہ کر لیا کہ کسی طرح یہ رات گزر جائے تو کل سویرے میں مزید سفر کر کے برجی لاء ٹاپ تک نہیں جاؤں گا.. یہ درست کہ جیسی ڈیویز نے وہاں سے دنیا کا ایک عظیم پہاڑی منظر دیکھا تھا تو کیا یہ اشد ضروری ہے کہ میں بھی اس مقام تک ہر صورت پہنچوں.. ساٹھ برس میں بہت کچھ بدل جاتا ہے.. ہو سکتا ہے وہ منظر بھی بدل گیا ہو.. میرے سر درد میں تھوڑی سی کمی آ گئی تھی.. تھکاوٹ کی اذیت میں ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا اور میری رانوں کے درمیان جو تیزابی جلن تھی، اسے بھی کچھ افاقہ تھا... اس لیے میری آنکھوں کے اندر جب نیند نے ایک ایک تنکا جمع کر کے اپنا گھونسلا بنایا تو میں اس میں اپنے ٹھٹھرے ہوئے پَر سمیٹ کر گم ہوا.. اگرچہ صرف چند لمحوں کے لیے..

اور برجی لاء کے دامن میں برفباری کی رات میں جو سفید سندیسے اترتے تھے، ان کی سرد عذاب میں کچھ خواب بھی اترتے تھے.. میں برف کی ایک سلطنت میں ہوں اور میرے تن بدن پر کچھ بھی نہیں ہے اور یہ سلطنت مجھ سے پوچھتی ہے کہ یور رائل ہائی نیس، آپ ادھر کیوں آئے ہیں؟... اور میں کہتا ہوں، میں آیا نہیں، لایا گیا ہوں.. سلمان کے خیمے میں سے موسیقی اور قہقہوں کی آوازیں اور وہ بھی ٹھٹھری ہوئی آ رہی تھیں.. وہاں جوان خون تھا.. جو برف بدنوں کو پگھلانے پر بھی قادر ہوتا ہے اور یہ تو صرف برف تھی..

"صاحب..." کسی نے پکارا..

"کون ہے؟"

"میں ہوں.. علی..."

"کیا ہے؟" میں نے نہایت ناگواری سے پوچھا...

"صاحب..." اس کا سر بلا اجازت خیمے کے اندر داخل ہو گیا اور اس کے دانت ٹارچ کی زرد روشنی میں ایک پُرمسرت ڈائناسور کی طرح چمکتے تھے۔ "صاحب

باہر آکر دیکھو.."

"باہر آکر کیا دیکھوں.." میں نے غصے سے کہا..

"صاحب برفباری رک گیا ہے.. آسمان صاف ہو گیا ہے۔"

برفباری کیسے رک سکتی تھی.. وہ تو ایک سرد تسلسل کے ساتھ اینجل فالز کی طرح گرتی چلی جارہی تھی.. ایک آتش بار کیسے رک سکتا تھا..

میں نے حسب سابق.. باہر آنے کے لیے سانسوں کے تین پڑاؤ کیے اور ایک چوپائے کی طرح بلکہ ایک ایسے ڈوگی کی طرح جسے ہڈی ملنے کی نوید ملی ہو، خوش خوش سر ہلاتا کان کھڑے کیے باہر آگیا..

میرے پاؤں ٹخنوں تک تازہ برف کے اندر دھنس گئے اور میں بمشکل کھڑا ہوا..

اور اوپر چولستان کی ایک رات تھی.. صحرا کا کھرا انکور آسمان تھا.. اور اس میں ستاروں کا جگمگاتا میلہ لگا تھا.. نہ صرف آسمان پر بلکہ میرے خیمے کے ساتھ جو جھیل ظاہر ہوئی تھی، اس میں بھی وہ ستارے اترتے تھے اور ڈبکیاں لگاتے تھے، اشنان کرتے تھے اور لُچّوں کی طرح آنکھیں مارتے تھے.. اور جھیل کے پانی کروٹیں لے رہے تھے جیسے ایک خواہش پر آئے ہوئے بدن پر لپٹا ریشمی لباس سلوٹوں میں بدلتا ہے.. اور آس پاس بلند پہاڑ ایک لامتناعی سکوت میں دم بخود اور تازہ برف کے بوجھ سے بھرے ہوئے تھے اور شفاف آنکھوں کے اندر سفید خنجر کی طرح بلند ہوتے تھے..

"مبارک ہو صاحب.. یہ تو ایسا برفباری تھا کہ نہ رکتا تو کئی دن نہ رکتا.. اب تھم گیا ہے تو اس کی مہربانی ہے.. اور آپ کا نصیب ہے... صبح برجی لاء جائے گا صاحب؟"

جھیل سے پرے برجی لاء بلند، واضح اور کھرے آسمان میں نکھرا ہوا تھا..

"نہیں جائے گا.." میں نے سر ہلایا۔ "صاحب اچھا نہیں ہے.. طبیعت بہت خراب ہے.. تھک گیا ہے.. صبح ادھر سے ہی واپس جائے گا.. صاحب برجی لاء نہیں جائے گا"

"ان گنت ہیروں پر قدم رکھتے.. لچّھن جھیل برف میں قید"

اور صاحب بُرجی لاء جارہا تھا..

صرف اس لیے کہ علی نے میری ہمت بندھائی تھی، ڈھارس دی تھی۔

"صاحب اتنا مصیبت کر کے آیا ہے تو یہاں سے واپس چلا جائے گا تو ساری عمر پچھتائے گا.. بہت روئے گا کہ اوپر کیوں نہیں گیا.. وہ دیکھو.. جھیل کے ساتھ ساتھ دوسرے کنارے پر جائے گا.. پھر تھوڑا چڑھائی ہے.. اور بُرجی لاء کا ٹاپ وہ سامنے دکھائی دے رہا ہے اور صاحب موسم صاف ہے.. ادھر ایسا موسم نصیب والوں کو ملتا ہے.. ہمّت کرو.."

واقعی بُرجی لاء ایک کھرے، نکھرے ہوئے آسمان میں ایک الف لیلوی قلعے کی مانند بلند ہو رہا تھا.. اور بہت نزدیک لگتا تھا.. ہاتھ بڑھاؤ تو چھولو، اتنا قریب...

اور وہ صبح بھی کیا صبح تھی..

میں اپنے خیمے سے باہر آیا تو ابھی جھیل اور ہمارے خیمے سائے میں تھے اور ان سے پرے ایک برفانی تودے کے پیچھے جو زرد سی بلندیاں تھیں، ان کی چوٹیوں پر دھوپ کی پہلی دستک اترتی تھی.. انہیں یوں چکا چوند کرتی تھی کہ ان کی جانب دیکھا نہ

جاتا تھا.. ہمارے خیمے سردی سے اکڑے ہوئے تھے اور ان کے نچلے حصوں کے گرد بے شمار برف تھی جو لوہے کی طرح سخت ہو چکی تھی.. قدموں کے نیچے بھی جو برف تھی، اس کی سختی ایسی تھی کہ پیر پھسلتے تھے اور بار بار اپنے آپ کو سنبھالنا پڑتا تھا.. اگرچہ بدن میں ابھی تک تھکن ٹھہری ہوئی تھی لیکن سر درد زائل ہو چکا تھا..

جھیل کنارے ہمارے دو خیمے... دو پرندے ہوں جو سائبیریا کے سرد موسموں سے نقل مکانی کر کے آئے ہوں.. گرم خطوں کی طرف آئے ہوں اور یہاں پہنچے ہیں تو یہاں بھی وہی برف موسم ہیں.. اور اب حیران بیٹھے ہیں..

ان میں ایک پرندہ جو میرا تھا. سلیٹی رنگ کا تھا.. اس لیے کہ اس میں قیام کرنے والا بھی سلیٹی رنگ کا ہو چکا تھا.. اس کے من میں جو پرندہ تھا، اس کی آتشی سرخ لمبی دم جھڑ چکی تھی اور جو چونچ تیز اور سبز رنگ کی تھی، وہ کُند ہو چکی تھی... کہیں ٹھونگا مارنے سے دکھتی تھی..

اور دوسرا پرندہ دمکتے نیلے رنگ کا تھا، اس لیے کہ اس میں بسیرا کرنے والوں کے من میں جو پرندے تھے، ان کے پروں کے رنگ جوانی کی تیز بھٹی میں ابھی ابھی پختہ اور چمکیلے ہوئے تھے.. وہ پتھر کو بھی چونچیں مارنے سے باز نہیں آتے تھے..

رات ایک عجیب سانحہ ہوا...

یہ سانحہ شرفاء کی کتاب میں تو بیان نہیں ہو سکتا لیکن ایک آوارہ گرد کی کتاب میں بیان ہو سکتا ہے کیونکہ وہ شریف نہیں ہوتا زندگی کے قریب ہوتا ہے.. شائد نصف شب کے بعد کی کوئی ساعت تھی جب دباؤ بڑھنے لگا.. بلندی کا نہیں... اب میں پہلو بدلتا ہوں، اسے فراموش کرنے کے لاکھ جتن کرتا ہوں، اسے بھولنے کا چارہ کرتا ہوں، خواہ مخواہ گنگناتا ہوں لیکن دباؤ ہے کہ پھولتا ہی جاتا ہے.. اس کشمکش میں ایک خواب آتا ہے.. یاد رہے کہ کشمکش اس لیے کہ سلیپنگ بیگ اور خیمے سے باہر نکلنا ناممکن

ہے.. نکل جاؤں تو منجمد ہو سکتا ہوں.. واپس آنا ممکن نہ ہوگا تو خواب آتا ہے کہ کوئی صاحب مجھے ربڑ کا ایک پائپ پیش کر رہے ہیں جیسا کہ باغ کو پانی دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کہتے ہیں، تارڑ صاحب.. آپ کا کیا خیال ہے کہ جو کوہ پیما آپ کی موجودہ ہائٹ سے بھی آٹھ دس ہزار فٹ مزید بلندی پر خیمہ زن ہوتے ہیں تو کیا وہ ایسے دباؤ کو خارج کرنے کے لیے اپنے خیمے سے باہر نکتۂ انجماد سے چالیس درجے نیچے رات میں اس مقصد کے لیے باہر نکلتے ہیں؟.. ہرگز نہیں.. اس لیے یہ پائپ حاضر ہے جس کا دوسرا سرا خیمے سے باہر جاتا ہے۔ آپ اس میں فِٹ ہو کر راحت حاصل کیجئے پلیز... اور میں اس ربڑ پائپ کو دیکھتا ہوں، پرکھتا ہوں اور کہتا ہوں کہ جناب اس کا سائز تو بہت بڑا ہے.. میں اس میں فِٹ نہیں ہو سکتا.. عجب بیہودہ خواب تھا.. اور میں ان صاحب کو کہتا ہوں کہ براہ کرم آئندہ پائپ لائیں تو میرے سائز کا لائیں.. سخت بیہودہ خواب تھا.. بہر طور اس دباؤ سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں اپنی جان پر کھیل گیا اور باہر گیا..

تو وہ صبح بھی کیا صبح تھی..

اور صاحب بُرجی لاء جا رہا تھا..

اوپر میرا نیلگوں آسمان... جس کی شفافی میں کوئی ایک پرندہ بھی تیرتا تو اسے ریزہ ریزہ کر دیتا.. نیچے لشکتی براق برف کے صحرا میں ایک نیلی جھیل جس کے کناروں پر ہم چلتے تھے اور ہمارے قدموں تلے برف کڑکڑاتی تھی..

آج کی سویر میں واحد خاص بات یہ تھی کہ گرم کافی اور دلیے کے باوجود میرے اندر کا سسٹم چونکہ برف ہو چکا تھا، اس لیے جب میں ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں سخت برف پر اپنے آپ کو بمشکل بیلنس کرتا بیٹھا تو بیٹھا ہی رہا تھا.. بیٹھنا بیکار گیا تھا.. اس کے سوا ہر طرف سے خیر کی خبریں آتی تھیں..

فیصلہ یہ ہوا کہ ہم آگے سفر کریں گے، برجی لاء کی ٹاپ پر پہنچیں گے۔ اس

کمبخت جیسی ڈیویز کے بیان کردہ منظر پر اپنی نظریں نذر کریں گے، وہاں سے واپس اپنی جھیل کنارے اپنے کیمپ میں آئیں گے اور سامان سمیٹ کر نیچے اتر جائیں گے.. اور بقول علی مدد دوپہر کے کھانے تک واپس شتونگ پہنچ جائیں گے جہاں ہمارے تینوں ساتھی اگر وہ صحت یاب ہو چکے ہیں، اگر وہ بلندی کی تاب نہ لاتے ہوئے نیچے سکردو نہیں اتر گئے تو ہمارے منتظر ہوں گے.. تو یہ فیصلہ ہوا تھا..

میں جب اپنے ناول ''بہاؤ'' کے کرداروں اور گئے زمانوں کے موسموں کو اپنے اوپر وارد کرنے کے لیے.. انہیں اپنے اندر زندہ کرنے کی جستجو میں چولستان گیا تھا تو ایک گرم دوپہر میں.. ایک صحرا کی خشک جلتی دھوپ میں بہت دور تک دریائے گھاگھرا کے کناروں اور اس کی خشک گزرگاہ میں تنہا چلا تھا..

بُرجی لاء کی جانب چلتے ہوئے... جیسے میں اسی چولستانی کیفیت میں چلتا تھا.. وہاں اُس صحرائی تپش میں ریت کا ہر ذرّہ میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتا، تلملاتا اور لشکتا تھا.. ہر ذرّہ الگ الگ.. جیسے اُس ایک ذرّے کو جنوبی افریقہ کی کانوں میں سے نکال کر بلجیم کے ایک ایکسپرٹ ڈائمنڈ کٹر نے اسے ایسے تراشا ہے، اس کا ایک ایک پہلو، ہر کونہ، ایک ایک رخ ایسے تراشا ہے کہ اس پر جو روشنی پڑتی ہے، اس کی ایک شعاع بھی ضائع نہیں جاتی.. وہ روشنی پوری پوری اس میں جذب ہو کر دوچند اور سہ چند ہو کر سفید روشن تیروں کی طرح اس میں سے نکلتی ہے اور ہر آنکھ کو خبر کرتی ہے کہ... میں ایک ذرّہ نہیں، ایک ہیرا ہوں.. بس ایسے ہی جب میں اپنی سیاہ گاگلز میں سے اپنے سامنے دیکھتا ہوں تو میرے سامنے برف کا ہر ذرّہ، اپنی یکتائی میں، الگ الگ، جدا جدا سورج کی کرنوں کو جذب کر کے مجھ پر روشنی کے تیز تیروں کی یلغار کرتا تھا اور میری آنکھوں کے اندر جا جگمگاتا تھا.. ایک نفاست سے کٹے ہوئے ہیرے کی طرح... اور برف کا کوئی ایک ذرّہ تو نہ تھا.. لاکھوں ان گنت ہیرے دمکتے میری آنکھوں میں اتر کر روشنی کے جھماکے تخلیق کرتے تھے.. میں یہ منظر بھی ہرگز بیان نہیں کر سکتا..

یہ دراصل ایک ہیروں بھرا آسمان تھا جو زمین پر تھا اور ایسے جگمگاتا تھا کہ اس کی جانب دیکھنا مشکل ہو رہا تھا.. اگرچہ میں جانتا تھا کہ یہ صرف برف ہے جو چمکتی ہے اور اس کے ذرّے ہیں جن سے شعاعیں پھوٹتی ہیں لیکن ذرا غافل ہوتا تھا تو یہی لگتا تھا کہ برف نہیں ان گنت تراشیدہ ہیرے ہیں جو میرے قدموں میں بچھے ہیں اور تہہ در تہہ بچھے ہیں اور ان پر پاؤں رکھتا ہوں تو ان کی کرچیاں سنائی دیتی ہیں.. اس دنیا میں کتنے لوگ ہوں گے جن کے قدموں میں ہیرے بچھتے ہیں..

جھیل کے گرد چلتے ہوئے.. سیاہ پتھروں کا ایک علاقہ آیا.. اور ہم ان پر بہت دھیان سے قدم رکھتے تھے.. ان کے درمیان میں نرم برف تھی اور گہرائی تھی..

برجی لاء کے دامن میں پہنچ کر.. اس کے عین نیچے کھڑے ہو کر ہم نے اوپر دیکھا.. وہ بلندی جو ہمارے کیمپ سے نہایت آسان اور معصوم لگتی تھی، اب عرش تک اٹھتی تھی۔ ''علی ہم اوپر کیسے جائیں گے..''

''صاحب جیسے خچّر جاتا ہے ویسے جائیں گے۔''

''ہم خچّر کی برابری نہیں کر سکتا علی.. ہم کیسے جائیں گے؟''

''صاحب پرانے زمانوں میں ادھر سے برجی لاء ٹاپ تک ایک خچر راستہ جاتا تھا جو دوسری طرف سکردو میں اتر جاتا تھا.. ہم اس راستے پر چلیں گے۔''

''وہ راستہ ہے کہاں؟''

''وہ اس حرامی برف نے چھپا دیا ہے صاحب.. لیکن راستہ ہے.. اور آسان ہے.. دکھائی مشکل دیتا ہے۔''

برجی لاء کی ٹاپ کو چڑھتے ہوئے ہمیں تو کوئی راستہ دکھائی نہ دیا..

البتہ ایک جھیل دکھائی دی..

زرد اور برف میں ڈھکے پہاڑوں کی گود میں پوشیدہ، آرام کرتی ہوئی، نامعلوم، انجانی اور کسی سحر میں مبتلا.. تنہائی کے سکوت میں آئی ہوئی ایک عجیب جھیل دکھائی

دی.. اسے دیکھ کر سبھی سکوت میں آگئے..

ہمیں اس کی بھی اطلاع نہیں تھی.. کوئی خبر نہیں تھی.. کوئی سندیسہ نہیں تھا.. اس نے کسی پوسٹ کارڈ پر اپنی تصویر چھپوا کر ہمیں پیغام نہیں بھیجا تھا کہ میں برجی لاء کے پہلو میں تمہاری منتظر ہوں.. نہ کسی پورٹر نے بتایا تھا اور نہ کسی گائڈ نے.. جیسے سنگ مرمر کے تودوں کے درمیان ایک نیلا پتھر تراش کر جڑ دیا گیا ہو..

"یہ کونسی جھیل ہے علی؟"

"یہ لچھّن جھیل ہے صاحب.. اسے کھانا گوش بھی کہتے ہیں۔"

"اس کے پاس لوگ جاتا ہے؟"

"نہیں صاحب ادھر تو کوئی نہیں جاتا.. ادھر اگر کبھی کوئی آتا ہے تو برجی لاء کو جاتا ہے.."

"اس کے کنارے کبھی کسی نے کیمپ کیا ہے؟"

"خدا جانے کوئی گورا ادھر گیا ہو صاحب.. ہم تو آج تک نہیں گیا.. کیا کرے گا جا کر.. خطرناک جھیل ہے صاحب.. یکدم اوپر پہاڑ ہے اور اوپر سے برف کا تودہ گرتا ہے۔"

"کیا ہم واپسی پر اس کے کناروں تک جا سکتے ہیں؟.. ادھر رات کر سکتے ہیں؟"

"کیسے کر سکتے ہیں صاحب.." علی ہنسنے لگا۔ "ہمارا سامان اور خیمہ تو ادھر برجی لاء جھیل کے پاس ہے.. اور آج شام تک شتونگ پہنچنا ہے.. نہیں جا سکتا۔"

لچھّن جھیل کے دور افتادہ اور تن تنہا برفانی حسن کو اگر بہت احتیاط سے بیان کیا جائے تو بھی وہ ایک حواس باختہ کر دینے والا منظر تھا..

ہمیں برجی لاء کی برفانی رات کی صعوبتوں کے دو انعام مل چکے تھے.. ایک برفیلی ذرّوں کے ہیرے انبار اور دو... لچھّن جھیل..

ہم نے لچھّن جھیل سے منہ موڑا اور برجی لاء کو منہ اٹھا کر دیکھا..

صبح کی دھوپ کی زردی میں.. ہمارے اوپر ایک بل کھاتا برفانی راستہ تھا جو اونچا ہوتا چلا جاتا تھا اور یہ ناممکن لگتا تھا کہ ہم کبھی بھی اس کی چوٹی پر پہنچیں گے..

میں نے صرف ایک تصویر کی خاطر جھیل کرومبر تک کا "یاک سرائے" سفر اختیار کیا تھا.. میں توبہ تائب ہو جانے کے باوجود کسی نہ کسی فریب میں مبتلا ہو جاتا تھا اور جیپسی ڈیویز نے مجھے اس موجودہ فریب میں مبتلا کیا تھا اور یہ برفانی فریب بلند ہوتا چلا جاتا تھا..

میرے پاؤں برف میں دھنستے تھے اور میرا سانس ہر قدم پر کم ہوتا تھا..

میں سر اٹھا کر اپنے ساتھیوں کو دیکھتا تھا جو مجھ سے بہت آگے جا چکے تھے کیونکہ ان کے پَر چمکیلے تھے، چونچیں تیز تھیں اور وہ جوان تھے.. اگر وہ وہاں ہیں تو میں بھی.. اگرچہ تاخیر کے ساتھ.. وہاں تک پہنچ سکتا ہوں... وہ برجی لاء کی ناممکن دکھائی دینے والی چڑھائی پر مکوڑوں کی طرح رینگتے دکھائی دے رہے تھے..

اور مجھے ایک اطمینان تھا.. بس یہی کہ یہاں کوئی برالڈو نہیں.. کسی بیافو یا ہسپر گلیشیر کی دراڑیں نہیں.. کوئی خطرہ نہیں.. صرف مشقت ہے، بلندی اور سانس کی کمی ہے.. سانس جاتا ہے لیکن جان نہیں جائے گی..

یہاں ایک اور نوازش ہوئی.. ایک اور عنایت ہوئی.. اس چڑھائی کے درمیان میں پہنچ کر جب میں ایک مرتبہ پھر سانس درست کرنے کے لیے رکا تو نیچے برف کے صحرا میں برجی لاء جھیل کا جو یکتا منظر دیکھا، وہ بھی حواس گم کر دینے والا تھا.. سفیدی کی عظیم وسعت میں اس جھیل کا زمرد جڑا ہوا تھا.. اس کے کناروں پر ہمارے خیمے تھے لیکن برف میں گم نظر نہیں آتے تھے.... اگر ہم صرف اس جھیل کا فضائی منظر دیکھنے کے لیے ہی دیوسائی پر آتے تو بھی یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا.. لاہور میں زندگی کا کوئی ایک برس گزارنے کے لیے لچھّن جھیل اور برجی لاء جھیل کو یوں اپنے نیچے بچھے ہوئے دیکھنا ہی کافی تھا..

ایک قدم.. اور ایک گہرا سانس.. اور رک کر اس سانس کو درست کرنا..

میں نے اوپر دیکھا، اس لمحے جب میں تھکاوٹ سے لاچار برف پر لڑھک کر نیچے لچھّن جھیل تک جا سکتا تھا.. تو ایک خشک اور پتھریلی بلندی پر میں نے اپنے پورٹروں کو ہاتھ ہلاتے دیکھا.. اور وہ کچھ کہتے تھے جو مجھے سنائی نہ دیتا تھا..

جب میں کچھ اور قریب ہوا تو علی کی آواز آئی۔ "صاحب تھوڑا ہمت کرو.. مشکل نہیں ہے.. ادھر ٹاپ ہے.."

برجی لاء کی ٹاپ پر جب میں نے قدم رکھا.. تو مجھے کچھ سجھائی نہ دیا..

میری آنکھوں کے سامنے ڈرمرے ناچتے تھے.. تھکن کی کرچیاں میرے تن بدن کو چھیدتی تھیں..

ہم سب برجی لاء پر پہنچ گئے تھے..

سوائے ایک ساتھی کے..

پچھلی شب اس کا برا حال تھا.. جیسے ہم سب کا تھا.. لیکن ہم سب شور مچاتے تھے کہ ہم مارے گئے لیکن وہ بیان نہیں کرتا تھا.. اس کا المیہ یہ تھا کہ وہ قبول نہیں کر سکتا تھا.. وہ بے شک آخری دموں پر ہو لیکن... وہ یہی کہے گا کہ مائی لیڈر سب اچھا ہے.. وہ دل کی بات لب پر نہیں لاتا تھا.. کہیں اس کی حیاتی میں بہت ساری محرومیاں تھیں، نفرتیں تھیں جن کا وہ شکار ہوا تھا اور وہ ان کے بوجھ تلے دبا مسلسل اپنے آپ کو اور ہمیں فریب دیتا تھا.. لیکن میرے جیسے کائیاں شخص کو وہ بیچارہ کیسے فریب دے سکتا تھا..

آج صبح جب ہم سب برجی لاء کے سفر کے لیے تیار ہوئے تو وہ کہنے لگا "مائی لیڈر.. آپ لوگ ہو آئیں، میں یہاں ٹھہرتا ہوں.."

"کیوں؟" میں فکر مند ہو گیا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں.."

"ہاں سر.. میری طبیعت کو کیا ہونا ہے.. میرا خیال ہے کہ میں ادھر ٹھہرتا ہوں.. آپ اوپر ہو آئیں۔ میں اس دوران خیمے پیک کرواتا ہوں.. میں نے کچھ کپڑے بھی دھونے ہیں، انہیں دھو کر سکھاتا ہوں.. اور اس جھیل کے منظر سے ذرا لطف

اندوز ہوتا ہوں.."

"تمہیں چکر تو نہیں آ رہے.. بلندی کا اثر تو نہیں ہو گیا...."

"نہیں جی.. میں تو مکمل طور پر فِٹ ہوں... میں تو صرف اس لیے یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں کہ جب آپ برجی لاء سے واپس آئیں تو یہاں کوئی تو ہو جو آپ کا استقبال کرے.."

اور وہ سچ نہ کہتا تھا.. نہ صرف ہم سے بلکہ اپنے آپ سے.. کیونکہ وہ بلندی کے پنچ سے ناک آؤٹ ہو چکا تھا اور اب اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ برجی لاء کی جانب ایک قدم بھی اٹھا سکے لیکن وہ اقرار نہیں کرتا تھا..

اور مجھے اس پر ترس آیا..

چنانچہ ہم سب... میرے تین ساتھی اور میں برجی لاء ٹاپ پر پہنچ گئے تھے..

میں اوپر پہنچا تو ایک دھند میں تھا..

سولہ ہزار فٹ سے زائد بلندی پر مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا، کچھ دکھائی نہ دیتا تھا.. شائد اس لیے کہ میں اپنی جسمانی حدود پار کر کے یہاں تک پہنچا تھا..

کچھ دکھائی اس لیے بھی نہ دیتا تھا کہ جھیل کناروں پر چلتے ہوئے جو ہیرے جواہر میری آنکھوں میں اترتے تھے، میں ابھی تک ان کی شعاعوں کے طلسم میں تھا.. بلجیم کے ہیرا تراشوں نے وہ ہیرے ایسی چابکدستی اور کمال سے تراشے تھے کہ میری آنکھیں چندھیا چکی تھی..

انہیں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا..

میں بالآخر برجی لاء کے بلند درے پر پہنچ گیا تھا اور... میرے سامنے ایک منظر تھا..

”برجی لاء ٹاپ سے پہاڑوں کے عظیم ترین منظر کے سامنے.. کے ٹو۔ مشابرم۔ چوغولیزا کے سامنے“

اور وہ منظر میں اتنی شتابی سے بیان نہیں کروں گا..

ذرا ٹھہر کے... دھیرج سے بیان کروں گا..

میں برجی لاء کی چوٹیوں پر... دیوسائی کے اس بلند درّے پر.. پچھلی شب گرنے والی ان چھوئی برف پر پاؤں جمائے کھڑا تھا..

چمڑے کے مضبوط.. میو ہسپتال لاہور کے فٹ پاتھ سے خریدے گئے.. خالد ندیم کے خریدے گئے سیکنڈ ہینڈ ٹریکنگ بوٹس میں برف پر پاؤں جمائے کھڑا تھا..

میرے ٹریکنگ سوٹ کے پائینچے جرابوں میں جکڑے ہوئے تھے..

ایک بھاری سویٹر میں.. باریک پروں سے گندھی ہوئی نیلی ڈاؤن جیکٹ میں.. جو سنو لیک پر بھی میرا پہناوہ تھی.. میں کھڑا تھا..

میرے بائیں جانب بھورے پہاڑ تھے.. رات کی شدید برفباری کی زد میں آکر ان پر جہاں کہیں برف ٹھہر سکتی تھی، ٹھہری ہوئی تھی.. اور ان کے ماتھے پر برفیلی ریکھائیں تھیں.. اور ان پہاڑوں کے اوپر لیلیٰ پیک کا مکھڑا ظاہر ہوتا تھا..

لیلیٰ او لیلیٰ..

یہ لیلیٰ ہم سے کوسوں دور تھی..

کالی نہ تھی، گوری تھی..

اور اس کے باوجود اسے لیلیٰ کا نام دیا گیا تھا.. یا شائد میں اسے قیس کی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے پیاری لگتی تھی..

یہ لفظ ”پیاری“ کتنا عامیانہ اور بازاری سا ہے.. اور اس کے باوجود آپ بے شک کسی شکل کو میر اور غالب کے حوالوں سے بیان کریں... کہ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے.. اور.. کتنے شیریں ہیں تیرے لب... وغیرہ.. تو جو بات صرف یہ کہہ دینے سے بنتی ہے کہ.. وہ بہت پیاری ہے.. ان شعروں کی بھول بھلیوں سے ہرگز نہیں بنتی..

تو لیلیٰ پیک بے حد پیاری تھی..

اور اس پیاری کے پہلو میں ہراموش سلسلے کی گولڈن پیک بھی نیلے آسمان میں ایک سونے کے قلعے کی طرح بلند ہوتی تھی.. اور اس کی برفیں آنکھوں کو خیرہ کرتی تھیں..

برجی لاء ٹاپ پر ہم سات افراد تھے..

تین ممبر.. اور چار پورٹر..

اور یہ سب کے سب حضرات وہاں خوب اودھم مچا رہے تھے.. پچھلی شب کی برفباری کو فراموش کر چکے تھے.. تصویریں اتار رہے تھے.. برف پر قلابازیاں لگا رہے تھے اور پہلی بار ڈزنی لینڈ میں آئے ہوئے بچوں کی طرح خوشی سے دیوانے ہوئے جاتے تھے..

میں نے جو کچھ اپنے بائیں جانب دیکھا وہ تو بیان کر دیا.. لیلیٰ پیک اور گولڈن پیک کو ظاہر کر دیا لیکن جو کچھ میری نظروں کے عین سامنے قطار باندھے کھڑا تھا.. اُس آوارہ گرد شخص جیسی ڈیویز کے سفرنامے میں بھی تو یہی منظر تھا جو مجھے یہاں تک لے آیا تھا..

اس منظر کو بیان کرنے سے میں اس لیے کترا رہا ہوں، اجتناب کر رہا ہوں.. کہ اسے میں کیا بیان کروں..

آج سے ساٹھ برس پیشتر وہ گورا کوہ نورد اسی برجی لاء ٹاپ پر کھڑا ہوا تھا.. ابھی

میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ یہاں پہنچ گیا تھا.. اگر نقش قدم برف پر سلامت رہ سکتے تو
میں اسی کے نقش پا پر کھڑا ہو کر اپنے سامنے.. وہی منظر دیکھ رہا تھا جو اس نے دیکھا تھا..

برجی لاء یہاں سے نیچے اترتا تھا..

ایک تنگ وادی کے اندر..

برف صرف ٹاپ پر تھی.. نیچے اترائی تھی.. بنجر پہاڑ تھے.. جن سے پرے دو
دن کی مسافت پر سکردو تھا.. ہم سکردو سے اوپر آ کر ایک نیم دائرے میں سفر کرتے
ایک مرتبہ پھر اس شہر پر معلق برف پوش پہاڑوں کے اوپر کہیں تھے..

اور اس وادی کے نیچے.. کہیں.. پورٹروں کا کہنا تھا کہ جو سرسبز ٹکڑا بہت دور
دکھائی دیتا ہے، وہ وادیٔ شگر ہے..

اور اب اصل منظر کی طرف..

جس کے لیے یہ سب کشٹ کاٹے گئے.. دیوسائی کے ریشم کو متشرّع کیا گیا..
برجی لاء وادی کے اوپر وہ سب قطار بنائے، فرمانبردار بچوں کی طرح کھڑے تھے.. جیسے
آج ان کا معائنہ ہو.. وردیوں اور بوٹوں کی چیکنگ ہو.. بنے سنورے، صاف ستھرے،
دھلے دھلائے، بال سنوارے.. وہ سب ایک قطار میں کھڑے تھے..

اور کون کھڑے تھے..؟

اور جو کھڑے تھے اور بلند ہوتے تھے.. وہ سب ہم سے.. اس برجی لاء کی ٹاپ
سے... ایک سو بیس کلومیٹر کے طویل فاصلے پر کھڑے تھے.. اور پھر بھی نمایاں تھے..
نظر آتے تھے.. نیلگوں... کسی ایک بادل.. کسی دھند کے ایک شائبے سے آزاد کھلے
آسمان تلے.. وہ سب کے سب.. ایک مختصر تصویر ہوتے تھے.. ایک منی ایچر تصویر کی
طرح بام فلک پر پینٹ کیے ہوئے لگتے تھے.. اس لیے کہ دوری بہت تھی.. اور دوری
بڑے سے بڑے حجم کو اور محبت کو بھی مختصر کر دیتی ہے.. اسے شائبے اور خیال کی شکل
دیتی ہے.. لیکن اس دوری کے باوجود وہ سب کے سب واضح اور اپنی اپنی شکلوں کی

شناخت میں سربلند اور عالیشان تھے..

اور یہ سب جو سربلند تھے میرے سامنے.. قطار بنائے.. بیبے بچوں کی
طرح... ایک مختصر تصویر دکھائی دیتے.. یہ سب میرے جانے پہچانے تھے.. میں ان
سے شناسا تھا اور وہ مجھے جانتے تھے کہ پانچ برس پیشتر میں ان کے سفید پیراہنوں کو
چھونے کے لیے ان کے قدموں تک پہنچا تھا جیسے ایک مرید اپنے مرشد کے لبادے کو
اپنی انگلیوں کی پوروں سے مس کرتا ہے، پھر انہیں اپنی آنکھوں سے لگاتا ہے.. تو ان
کے پیراہنوں کی ٹھنڈک ابھی تک میری آنکھوں کی ٹھنڈک تھی..

لیکن میں نے انہیں اتنی بے آرام کرنے والی قربت میں دیکھا تھا کہ وہ مجھ پر
حاوی ہوتے تھے.. میں ان کے رعب تلے دب گیا تھا.. ان کا پورا وجود دیکھ نہ سکتا تھا..
جیسے آپ قریبی دوستوں کو اتنے قریب سے دیکھتے ہیں کہ وہ آؤٹ آف فوکس ہو جاتے
ہیں.. آپ ان کی شباہتوں کو بیان نہیں کر سکتے.. کسی ایک شکل کو بیان کرنے کے لیے
ایک فاصلہ درکار ہے..

تو اب میرے اور ان کے درمیان کافی فاصلہ تھا.. بلکہ کچھ زیادہ ہی تھا..

اور ان آسمانی بلندیوں میں وہ کونسا تھا جو قربتِ یزداں میں تھا.. جو آسمانوں پر
دستک دیتا تھا کہ در کھولو، میں زمین کی مہک لے کر آیا ہوں..

یہ کے ٹو تھا..

یہ شاہ گوری تھی..

اگرچہ میں نے پچھلی شب اسے خواب میں نہیں دیکھا تھا لیکن یہ شاہ گوری تھی..
دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی... کے ٹو... شاہ گوری، ایک اہرام کی طرح...
برف کے ایک کوہ نور ہیرے کی طرح اس مجموعے میں سے بلند ہوتی تھی..

اس کے گورے بدن پر میری آنکھوں کے بوسوں کے جو نیل تھے، وہ یہاں
سے دکھائی نہیں دیتے تھے.. اگرچہ وہاں تھے.. ایسے نیل جو معدوم ہو جائیں تب بھی

یاد رہتا ہے کہ وہ کہاں کہاں تھے..

کے ٹو کے برابر میں براڈ پیک کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا.. اس کی پوری وسعت اور مکمل وجود دکھائی نہیں دیتے تھے.. لیکن اس کا سفید حجم ایسے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کے ٹو پر حاوی ہو جانا چاہتی ہو..

اور پھر اس قطار میں گشابرم ایک۔ دو اور چار کی مشہور زمانہ چوٹیاں اپنی دیدہ زیب شکلوں کے ساتھ کھڑی تھیں..

اور آخر میں.. مشابرم تھی.. عقابی چونچ والی چوٹی جسے میں کے ٹو کے علاوہ کسی کی مدد کے بغیر پہچان سکتا تھا..

میں اس کے دامن تک... اپنے پورے خاندان سمیت.. ہوشے کے گاؤں تک پہنچا تھا.. پھر ہوشے کے دوسری جانب... مشابرم کے سائے میں کے ٹو کے راستے پر ایک برفانی عجائب گھر کے سفید برفانی عجوبوں میں کھڑے ہو کر میں نے اسے قریب سے دیکھا تھا.. اسی لیے میں اسے خوب پہچانتا تھا..

اسی عظیم مجموعے میں چوغولیزا کے برف زار بھی نظر آتے تھے.. بقیہ چوٹیوں کے پہلو میں سے جھانکتے ہوئے..

ایورسٹ کے آس پاس.. سوائے ایورسٹ کے اور کچھ نہیں ہے.. بقیہ بلند چوٹیاں اس سے بہت دور ہیں، اس کی تصویر میں نہیں آتیں لیکن یہاں کے ٹو کے آس پاس ایک ہی تسلسل میں دنیا کی بلند ترین چوٹیاں سجی ہوئی تھیں.. اور ان میں سے بیشتر بلندیاں ایسی تھیں جو صرف ان کے دامن میں پہنچ جانے والے کوہ نوردوں پر ہی ظاہر ہوتی تھیں.. اور ہیلی کاپٹر کے علاوہ کہیں اور سے دکھائی نہیں دیتی تھیں.. سوائے ایک مقام کے.. اور میں اس مقام پر کھڑا تھا.. جیپسی ڈیویز جو دوہائی دیتا تھا کہ یہ دنیا کا عظیم ترین پہاڑی منظر ہے تو درست ہی دیتا تھا..

تھینک یو جیپسی ڈیویز..

لیکن مجھے اس حقیقت کا بھی اعتراف کر لینا چاہیے کہ جب میں نے پہلی بار اس منظر پر نگاہ کی تو تھوڑا سا مایوس ہوا.. میرے ذہن میں اس منظر کی جو تصویر تھی، وہ ذرا مختلف تھی.. میرا خیال تھا کہ ان چوٹیوں کے برفانی انبار بالکل سامنے دھرے ہوں گے.. آسمان غائب ہو جائے گا اور کے ٹو۔ مشابرم اور گشابرم اتنی نزدیک ہوں گی کہ مجھ پر گرنے کو ہوں گی اور عین ممکن ہے کہ ان پر چڑھنے والے کوہ پیما پلٹ کر ہمیں صبح بخیر وغیرہ بھی کہہ دیں... لیکن یہ تو میری خام خیالی تھی.. ایک فینٹسی تھی... بھلا ایک سو بیس کلو میٹر کی دوری پر واقع یہ بلند مجموعہ اتنا قریب کیسے آ سکتا تھا.. یہ مایوسی صرف چند لمحوں کے لیے تھی... بھلا اہرام مصر یا تاج محل کو ایک سو بیس میل کی دوری سے دیکھا جائے تو وہ کیا نظر آئیں گے.. لیکن یہ چوٹیاں اس طویل فاصلے کے باوجود نہ صرف صاف نظر آتی تھیں بلکہ اپنی واضح پہچان رکھتی تھیں..

تصویریں اترتی جاتی تھیں اور ہمارے چہرے ایسے روشن تھے جیسے ان کے سامنے ریفلیکٹر لگا دیئے گئے ہوں۔ کسی ٹیلی ویژن، ڈرامے یا فلم کی شوٹنگ کے لیے اور چہرے اس لیے چمکتے اور لشکارے مارتے تھے کہ سورج کی شعاعیں برف سے منعکس ہو کر ان چہروں کو روشن کرتی تھیں.. اسی لیے تصویریں اتارنے کے لیے کسی فلیش کی حاجت نہ تھی.. اور ان سب تصویروں میں ہمارے اور پورٹروں کے چہرے ایسے جگمگاتے تھے جیسے ان پر بیک وقت درجنوں فلیش نچھاور کیے گئے ہوں..

"صاحب ہم ایک دو بار گورا لوگ کو بھی ادھر لایا ہے.." علی بھی اشتعال انگیز حد تک پر مسرت تھا۔ "تو نیچے برجی لاء جھیل پر اگرچہ موسم کلیئر ہوتا تھا لیکن ادھر اوپر پہنچا تھا تو اس منظر کے سامنے بہت بادل ہوتا تھا.. ہمیشہ... تو ہم گورا لوگ کو بولتا تھا کہ دیکھو صاحب اس بادل کے پیچھے کے ٹو ہوگا.. مشابرم اور براڈ پیک ہوگا اور وہ اپنی ڈائری پر لکھتا جاتا تھا.. لیکن آج تو کمال ہو گیا.. بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں.. ہم خود اسے پہلی بار ایسا دیکھ رہا ہے.."

اگرچہ یہ علی بھی ایک پورٹر کی حیثیت سے ہمارے ساتھ آیا تھا لیکن بہترین آرگنائزر تھا.. اچھا کک اور ان علاقوں کا واقف تھا اور نفیس انسان تھا۔ اس لیے ان دو دنوں میں وہ اس علی مدد پر حاوی ہو گیا جو سکردو بازار سے اٹھ کر ہمارے گائڈ کے طور پر ساتھ آیا تھا.. اور گائیڈ کی بجائے مس گائڈ تھا اور سوائے اپنے ذاتی سامان کے ایک تنکا بھی نہ اٹھاتا تھا.. چنانچہ اس نے اپنی سرداری ثابت کرنے کے لیے کھانس کر کہا۔ "بھئی یہ اس لیے ہوا ہے.. کہ صاحب لوگ مسلمان ہے اور وہ گورا کافر تھا.. ان پر اللہ کا فضل ہوا ہے اور موسم صاف ہو گیا ہے۔"

"صاحب تھوڑا ہمت ہے.." جو بہتر علی تھا اس نے پوچھا..

"کیوں؟"

"صاحب یہ تو برجی لاء کا ٹاپ ہے جہاں ہم کھڑے ہیں.. لیکن ادھر سے جو چٹانیں اوپر کو جاتا ہے.. جس کو رج بولتا ہے تو ذرا اوپر چڑھ گے تو ایک چوٹی ہے.. ذرا ہمت کرو تو دس منٹ میں پہنچتا ہے اور اس چوٹی سے..."

اور وہ چوٹی ہم سے دور تو نہ تھی.. برف میں گھرا ایک بھورے پتھروں کا راستہ اوپر جاتا تھا.. اور برفوں میں گم ہوتا تھا اور وہاں ایک مختصر اور بے وقوف سا بادل نیلے آسمان کے خوف سے ذرا دہشت میں آیا کبھی کبھی حرکت میں آجاتا تھا..

"تو صاحب اس چوٹی سے یہ سامنے والا نظارہ زیادہ صاف نظر آنے لگے گا.. اور اگر پیچھے دیکھو گے تو برجی لاء جھیل کے عقب میں نانگا پربت بھی دکھائی دے گا.. صاحب اوپر جائے گا؟"

"صاحب اب کہیں نہیں جائے گا.. یہی کافی ہے.. اگر صاحب لالچ کرے گا تو مارا جائے گا... نانگا پربت کو ہم نے بہت دیکھا ہے.. لیکن تھینک یو علی..."

چونکہ ٹیم ممبران ہلا گلا کے موڈ میں تھے.. ایک دوسرے سے بار بار گلے مل رہے تھے اور اتنی دیر تک مل رہے تھے کہ ان پر "گے" ہونے کا گمان ہوتا تھا.. اور"

ایک دوسرے کو انتہائی لغو لطیفے سنا رہے تھے جو یقیناً "دنیا کے عظیم ترین پہاڑی منظر کے سامنے سنائے جانے والے فحش ترین لطیفے" کے عنوان سے آئندہ کی گینس بک آف ریکارڈز میں جگہ پائیں گے..

بائیں جانب لیلیٰ روٹھی ہوئی لگتی تھی کیونکہ شاہ گوری کی چاہت میں میں نے اسے فراموش کر دیا تھا.. چنانچہ میں اپنے ساتھیوں سے الگ ہوا اور لیلیٰ اولیلیٰ کی جانب جو چٹانی راستہ اوپر ہوتا تھا، اس پر آہستہ آہستہ چڑھنے لگا.. اور جب برجی لاء ٹاپ پر کھڑے میرے ساتھیوں اور پورٹروں کی آوازیں اور شور و غل دھیمے ہو کر بلندیوں میں دب گئے تو میں تنہا ہوا.. ایک سگریٹ سلگایا اور بھورے اور نوکیلے سنگریزوں پر بمشکل اپنے آپ کو براجمان کر لیا.. بمشکل اس لیے کہ کل کی پُر مشقت ٹریکنگ کی وجہ سے میری رانوں کے علاوہ میری پشت بھی حساس مقامات کی فہرست میں شامل ہو چکی تھی..

میں وادیٔ ہراموش میں سے اٹھتی ہوئی سفید لیلیٰ اولیلیٰ کی قربت میں تھا اور میرے سامنے.. ایک تنہا یکتائی میں، مکمل خاموشی میں، نہ صرف اس دنیا کا بلکہ اس کائنات کا.. کہ اس کائنات میں اگرچہ سیّارے اور چاند ستارے بہت ہیں لیکن ایسے عظیم الشان پہاڑ تو نہیں ہیں، تو اس کائنات کا سب سے پُرشکوہ پہاڑی منظر میرے سامنے تھا..

اور میں تھا..

اور یہاں تک پہنچنے میں میرا کچھ کمال نہ تھا..

میں یہاں تک پہنچا تو اس ایک کرن کی وجہ سے پہنچا جو ربِّ عظیم کے عرشوں میں سے پھوٹتی ہے اور مجھ پر خاص کرم کرتی ہے.. جو مجھ سے جواں سال اور ہمت والے تھے، وہ دیوسائی ٹاپ پر بلندی کا شکار ہو گئے... برجی لاء کی جھیل کنارے رہ گئے تو اگر میں یہاں تک پہنچا ہوں تو اس میں میرا کچھ کمال نہ تھا.. اُس ایک کرن کی برکت تھی تو یہاں اسی کا شکریہ ادا کرنا واجب ٹھہرتا تھا.. اگر دنیا بھر کے درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر روشنائی ہو جائیں تو بھی اس کی توصیف ممکن نہیں.. اس لیے توصیف کیا کرنی..

شکریہ ادا کرنا واجب ٹھہرتا تھا۔ چنانچہ میں نے وہیں ذرا احتیاط سے کھڑے ہو کر شکرانے کے دو نفل ادا کیئے..

چٹی بوئی گلیشیر پر... سنو لیک پر.. میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا.. تھینک یو بولا تھا..

لیکن یہاں برجی لاء پر ایک فرق تھا..

جب میں نے سلام پھیرا ہے.. دائیں جانب نگاہ کر کے "السلام علیکم.." کہا ہے تو کے ٹو اور براڈ پیک اور مشابرم تک یہ نگاہ گئی.. اور بائیں جانب رخ پھیرا ہے تو برف میں قید برجی لاء کی جھیل کی نیلاہٹ پر آنکھیں بجھنے لگیں....

سلام پھیرنے پر ایسے منظر دیکھنے کو ملیں تو انسان ساری عمر مصلے پر ہی بیٹھا رہے۔

میرے ساتھیوں کا ہنگامہ کم ہو چکا تھا اور وہ خاموشی سے بیٹھے گرم چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے..

صدپارہ کا اچھا علی میرے حصے کی چائے اوپر لایا اور مگ مجھے تھما کر واپس چلا گیا۔

برجی لاء کی ایک اور خصوصیت تھی.. پرسوں ہم سکردو میں تھے اور آج ہم اس کی ٹاپ پر بیٹھے حیرت ناک بلندیوں کا مشاہدہ کر رہے تھے.. ہمیشہ ٹریک کے سب سے شاندار مناظر کئی روز کی مسافت کے بعد سامنے آتے تھے.. اور ہم یہاں ایک ڈیڑھ دن کے باقاعدہ سفر کے بعد پہنچ گئے تھے..

کے ٹو کی برفانی زنجیر نے ہمیں اتنا مسحور کر دیا تھا کہ ہم بہت دیر تک ایک ایسے منظر سے غافل رہے جو اپنی سحر طرازی میں کسی سے کم نہ تھا..

جب ہم دیوسائی کا گھیراؤ کرنے والے پہاڑوں کی بلند ترین سطح پر پہنچے تھے تو ہم نے دائیں جانب ایک وسیع وادی کے پار برفانی بلندیوں میں گھری ہوئی دو جھیلیں دھند اور شام کی سیاہی میں دیکھی تھیں.. وہ کبھی وہم کبھی خیال ہوتی تھیں اور میں نے انہیں دیوسائی کے کسی نقشے پر نہ دیکھا تھا.. شام کے سرد سکوت میں ایک طویل فاصلے پر

وہ اپنی یکسائی کی تنہائی میں گم تھیں اور دھندلاتی تھیں..

برجی لاء ٹاپ سے یہی دو جھیلیں، اُس جھیل کے پار ایک طویل فاصلے پر نظر آ رہی تھیں جس کے کنارے ہمارے خیمے تھے.. یہ دریلا جھیلیں کہلاتی ہیں.. آج تو ان کے چار چفیرے برف کی سفیدی تھی لیکن ایک پورٹر کا کہنا تھا کہ یہ وادی بہار کے دنوں میں انتہائی سرسبز اور پھولوں اور بڑے بڑے پتوں سے رنگی جاتی ہے..

دریلا جھیلیں بہت دور تھیں، اس لیے وہ خوابناک سی لگتی تھیں.. ان پر بادل اُمڈے ہوئے تھے اور ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی.. یہ کے ٹو کے منظر سے بالکل مخالف سمت میں تھیں اور صرف انہیں یہاں سے دیکھنے کے لیے بھی برجی لاء کا سفر جائز ٹھہرتا تھا..

کے ٹو کی برفانی زنجیر کھرے آسمان میں واضح اور صاف تصویر تھی..

دریلا جھیلیں ایک دُھندلائی خوش نمائی میں تھیں..

میں دریلا جھیلوں سے واپس آیا اور پھر سامنے دیکھا تو کھرے آسمان کا ایک چھوٹا سا حصہ کھوٹا ہو رہا تھا.. جانے کہاں سے ایک مختصر سا بادل وجود میں آیا تھا اور وہ کے ٹُو کی چوٹی کے آگے پھیلنے لگا تھا.. پھر مشابرم کے آس پاس بھی دھند ظاہر ہونے لگی.. براڈ پیک بھی نظروں سے اوجھل ہونے لگی..

"واپس چلیں صاحب..." نیچے سے علی کی آواز آئی۔ "ابھی نیچے جا کر کیمپ ختم کرے گا اور پھر شتونگ جائے گا.. شتونگ زیادہ قریب نہیں صاحب.."

پورٹر برجی لاء سے اترنے لگے تھے.. ان میں سے ایک برف پر بیٹھا پھسلتا ہوا نیچے جا رہا تھا..

میرے ساتھی میری آمد کے منتظر تھے..

وہ مختصر سا بادل پھیل کر کے ٹو زنجیر کو اوجھل کر رہا تھا. محبوب کو بے پردہ دیکھنے کے بعد اس کے چہرے کو روپوش ہوتا دیکھنا اچھا نہیں ہوتا..

ہم برجی لاء سے نیچے اترتے تھے.. برف پر پھسلتے اور ہانپتے نیچے اترتے تھے..

ہم ایک ایسے منظر سے جدا ہوئے تھے جس سے دوبارہ ملاقات کا کوئی امکا
نہ تھا.. اس لیے دل کی اور بدن کی ایک جدا کیفیت تھی..

میں اپنے ہی نقش پا پر چلتا تھا.. برف میں میرے بوٹوں کے نشان گہر
تھے.. برجی لاء پر چڑھتے ہوئے وہ ثبت ہوئے تھے..

برف پر میرے پاؤں پھسلتے تھے اور میں ایک بے اختیار آہستگی کے سا
نیچے اترتا جاتا تھا... میں صرف ایک لمحے کے لیے سامنے دیکھتا تھا اور پھر اپنے قدمو
احتیاط سے اٹھانے کے لیے برف کو پرکھتا تھا اور اس ایک لمحے میں.. برجی لاء کی نیلو
جھیل فلیش کرتی تھی۔ لچھن جھیل پر امڈی ہوئی برف جگمگاتی تھی اور دریلا جھیلوں
دور افتادہ تنہائی دھندلاتی تھی.. ان جھیلوں تک پہنچنے کے لیے ایک عمر درکار تھی اور
اسے بسر کر چکا تھا۔ اب میرے پاس گنجائش نہ تھی..

اگرچہ ہم اس منظر سے جدا ہو چکے تھے... وہ اوپر برجی لاء کی چوٹی پر رہ
تھا.. لیکن یہ ہمارا خیال تھا کہ وہ چوٹی پر رہ گیا ہے.. وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا.. ا
کی سرد سانسیں ہمارے بدن پر اس کی شباہتوں کی تصویریں بناتی تھیں.. وہ ہمارے اند
راج کر رہا تھا.. سربلند اور پرشکوہ تھا۔ جیسے سوہنی ملاقات کر کے جدا ہو جائے تو بھی
کچھ عرصے کے لیے موجود رہتی ہے.. نظر آتی رہتی ہے.. راج کرتی رہتی ہے.. اور
ایک لمحہ آتا ہے جب ایک جھٹکے سے دیدار اور ملاقات کی سب ڈوریاں ٹوٹ جاتی ہیں
اندر ویرانی کا راج ہو جاتا ہے.. جدائی مکمل ہو جاتی ہے..

وہ لمحہ آیا تو نہ لیلیٰ رہی..
نہ شاہ گوری رہی..
نہ براڈ پیک۔ گشابرم۔ مشابرم اور چوغولیزا رہیں..
اور نہ ہم رہے..
اور نہ جنوں رہا نہ پری رہی...

"ہم دیوسائی کی سیاہ شب میں راستہ بُھول چکے تھے"

گھنی چُپ رات تھی اور ہم راستہ بھول چکے تھے..

دیوسائی کے میدانوں کی گھنی چُپ رات کے ٹھہرے ہوئے بلند جادو میں
ہم وہ بے وقوف سانپ تھے جو پہلے تو اس کے حُسن کی مست کر دینے والی بین پر جھومتے
رہے تھے اور اب وہ بین سیاہ رات میں گم ہو گئی تھی اور ہم نہیں جانتے تھے کہ اس نابینا
سکوت میں کیا کریں.. اور اس کی تاریک گھاس میں رینگتے چلے جاتے تھے کہ کہیں تو
کوئی پناہ ملے گی..

ہمارا تمام تر زہر تو برجی لاء کے منظر کے جادوئی منکے نے چوس لیا تھا اور اب
ہم کیسے سانپ تھے کہ ہم میں زہر نہ تھا.. ہم تو کینچوے ہو چکے تھے، بے آسرا، ڈرے
ہوئے، دیوسائی کی سیاہ رات میں رینگتے ہوئے..

یہ ایک ایسی رات تھی جس میں نہ کوئی مینڈک ٹرّاتا تھا، نہ کوئی جھینگر بولتا تھا
اور نہ کسی ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج کی دوہائی سنائی دیتی تھی۔ اس لیے کہ ایک مینڈک،
ایک جھینگر، ایک کونج ہم سے زیادہ سیانے ہوتے ہیں، نیچے میدانوں اور وادیوں میں
رہتے ہیں، چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر آ کر راستہ نہیں بھول جاتے..

ہر سُو ایک ایسا سناٹا تھا کہ اگر میں اسے اپنی واکنگ سٹک سے چھوتا تھا تو اس

میں چھید ہو جاتا تھا اور اس کے پیچھے خاموشی کی ایک اور چادر تنی ہوئی ہوتی تھی..

انصاری ابکائیاں لے رہا تھا اور کہہ رہا تھا بلکہ اس کی آواز کہہ رہی تھی کیونکہ وہ دکھائی نہیں دیتا تھا کہ سر جی میری طبیعت خراب ہے، میں چل نہیں سکتا.. مجھے یہیں چھوڑ جائیں.. میں سونا چاہتا ہوں..

اور سر جی بھی تو نہیں چل سکتے تھے، وہ بھی حالت غیر میں تھے اور ان کی رانوں میں آئی ہوئی خراشیں پھر سے خون آلود ہو چکی تھیں اور وہ ایک موٹی بطخ کی طرح پاؤں پسار پسار کر مشکل سے چلتے تھے.. اور وہ سنبھلنے دے، اے ناامیدی کیا قیامت ہے.. کا ورد کرتے تھے..

اور ہم چار تھے.. اور علی تھا.. اور ہم راستہ بھول چکے تھے اور رات کے نو بج چکے تھے..

ہماری دو بیٹریوں کے سیل کمزور ہو کر سسکتے ہوئے جگنوؤں سے بھی کم روشنی ہمارے سامنے ڈالتے تھے اور ارد گرد کی کوئی خبر نہ دیتے تھے کہ ہم کہاں ہیں.. اور کہیں جا بھی رہے ہیں یا ایک دائرے میں گھوم رہے ہیں.. اس لیے کہ کوئی لینڈ مارک، کوئی نشانی نہ تھی.. کوئی پتھر، کوئی جھاڑی نہ تھی جسے دیکھ کر پتہ چلتا کہ ہم یہاں سے گزر چکے ہیں یا نہیں.. صرف گھاس کی اونچ نیچ تھی اور قبر کی سیاہ رات تھی..

مجھے ایک بلتی پورٹر نے بتایا تھا کہ دیوسائی کے میدانوں میں کئی بار گلتری اور دور افتادہ وادیوں سے سکردو آنے والے لوگوں.. روزگار کی تلاش میں اس بلند میدانوں کو عبور کرنے والے لوگوں کو یہاں رات ہو جاتی تھی.. ان میں سے کئی اشیائے خورد و نوش حاصل کرنے کے لیے آتے تھے.. اگرچہ ان کے بزرگوں کو اور انہیں دیوسائی ازبر تھا اور اس کے باوجود جب انہیں رات ہو جاتی تھی تو ان میں سے کچھ راستہ بھول جاتے تھے، ایک ہی مقام پر، صحرا میں گم پیاسے مسافر کی طرح ایک ہی مقام پر چکر کاٹتے رہتے تھے اور پھر درجۂ حرارت گرتا تھا تو وہ منجمد ہو جاتے تھے اور ان کی لاشیں دیوسائی کے

پھولوں اور جھاڑیوں میں اس طرح ملتی تھیں کہ وہ شکل سے زندہ لگتے تھے..

میں ایک ملبے میں دبے ہوئے شخص کی طرح ڈھے چکی آواز میں علی سے بار بار پوچھتا تھا۔

"علی... شتونگ کب آئے گا؟" اور وہ کہتا "ابھی معلوم نہیں صاحب.. میں ادھر کا رہنے والا ہوں لیکن رات ہو جائے تو یہاں کوئی راستہ نہیں ہوتا.. آپ تیز نہیں چلا، اس لیے رات ہو گئی ہے.. میرا خیال ہے ادھر کچھ پہاڑیاں ہیں اور ایک ندی ہے۔ اس کے پار ایک اور میدان ہے جس میں دیوسائی روڈ ہے.. شائد ہم ادھر پہنچ جائیں لیکن ابھی معلوم نہیں۔" آج وہ ہمیں قطعی طور پر "فکر نہ کریں صاحب" یا "ابھی نزدیک ہے صاحب" نہیں کہہ رہا تھا کیونکہ وہ بھی فکرمند دکھائی دیتا تھا..

ہم ٹھوکریں کھاتے.. مکمل طور پر اندھے.. ہاتھ پھیلائے.. دماغ سے دیکھنے کی کوشش کرتے چلتے تھے.. کبھی گر بھی جاتے تھے..

انصاری رکا ہوا تھا.. بُت بنا کھڑا تھا..

"کیا ہوا؟"

"میں چلتا جا رہا تھا تو میں نے دائیں جانب گھاٹی کی طرف دیکھا.. اور وہاں ایک سیاہ وجود کو حرکت کرتے دیکھا.. میں قسم کھاتا ہوں کہ وہاں کچھ تھا.. یقیناً ریچھ تھا۔"

میں دیوسائی پر ایک ریچھ کو دیکھنے بھی آیا تھا.. لیکن اس سیاہ رات میں بھٹکتے ہوئے میں ایسی ملاقات کا ہرگز تمنائی نہ تھا..

"نئیں اوئے.." سلمان کی سراسیمہ آواز آئی..

"میں نے قسم کھائی ہے یار... یہ کوئی موقع ہے مذاق کرنے کا.."

"ر... ر... ریچھ.." شاہد نے کہا۔ "مائی لیڈرز ذرا احتیاط کریں.."

میں ٹھہر گیا۔ "ادھر ریچھ ہوتا ہے؟" میں نے علی سے پوچھا..

"ادھر تو ہوتا ہے صاحب.. حرامی رات کو نکلتا ہے لیکن قریب نہیں آئے

گا..اوپر سے دیکھتا رہتا ہے۔"

دیوسائی کی سیاہ رات کا آسیب ہمارے بدنوں میں فوراً سرایت کر جاتا اگر وہاں کوئی گنجائش ہوتی کہ وہاں صرف اور صرف تھکاوٹ اور نقاہت تھی جو بدن کو بھر چکی تھی

دیوسائی پر گم ہو جانا.. ایک شبِ سیاہ میں گم ہو جانا.. اور اس کی نابینا تنہائی میں لاوارث اور یتیم بچوں کی طرح ٹھوکریں کھانا.. اور بھوکا ہونا... سراسر... خلائی جہاز سے باہر آکر خلاء میں گم ہو جانے کے مترادف نہ تھا.. کہ وہاں آپ کو اپنے نیچے زمین تو دکھائی دیتی ہے۔ یہ اطمینان تو ہوتا ہے کہ کیپ کنیورل اور روس میں سینکڑوں سائنسدان ہیں جو آپ کے بارے میں فکرمند ہیں اور آپ کو سپیس شٹل میں واپس لے جانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں... نیچے زمین پر تشویش تو موجود ہے.. ہمیں تو زمین بھی نظر نہ آتی تھی..

اور نہ اس زمین پر کوئی ایسا تھا جو ہمارے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو...

اور نہ ہم کوئی ایسا تاریخی کارنامہ سرانجام دے رہے تھے کہ یہاں منجمد ہونے کے بعد ہمیں کوئی یاد کرتا.. اگر یاد کرتا تو یہی کہتا کہ کیا ضرورت تھی دیوسائی کی رات میں اترنے کی.. کہیں کیمپ کیوں نہ کر لیا.. منصوبہ بندی کیوں نہ کی.. یہ حماقت کیوں کی..

انصاری لڑکھڑا رہا تھا.. اس کی حالت بہت دگرگوں ہو رہی تھی.. اس سے اپنی ٹارچ بھی سنبھالی نہیں جا رہی تھی... وہ بار بار رکتا اور دیر تک کھڑا رہتا.. میرے مختصر رک سیک میں نمکو کا ایک پیکٹ تھا.. وہ کھول کر میں نے اسے دیا اور حیرت ہے کہ اسے کھانے کے بعد وہ بہت بہتر محسوس کرنے لگا..

"شتونگ کہاں ہے علی؟"

"ہم کو معلوم ہوتا صاحب تو اب تک وہاں پہنچ نہ گیا ہوتا۔"

ہم یقیناً کہیں نہیں جا رہے تھے.. ایک ہی علاقے میں گھوم رہے تھے..

اس شبِ سیاہ کے سناٹے کے اندر ہم گم صم.. چلتے جاتے تھے.. ٹارچوں کی روشنی مدھم ہو کر جواب دینے کو تھی.. نہ ہمارے پاس کوئی خیمہ تھا اور نہ خوراک کہ.. یہیں رات بسر کر لیں..

مقامی لوگ کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں دیوسائی پر آبادیاں تھیں.. کھیت اور کھلیان تھے۔ پھر کسی بزرگ کی بددعا سے موسم بدلے، اس پر برف گرنے لگی اور یہ بستیاں ملیامیٹ ہو گئیں.. اگر ہم ان زمانوں میں ہوتے تو کوئی ایک دِیا، کوئی چراغ نظر آجاتا اور ہم اس کی جانب چلنے لگتے..

لیکن ہم تو اور زمانوں میں تھے..

اور ان زمانوں میں یہاں ہر سُو تاریک خاموشی تھی.. مُہر بلب سناٹے تھے.. اور سیاہی کے ساتھ سردی بڑھتی جاتی تھی.. ہم سانس لینے کے لیے رکتے تو وہ ہماری جیکٹوں کو بچ کر کے سینے کے بالوں کو بھی منجمد کرنے لگتی..

ہم اور کتنی دیر چل سکتے تھے..

اور اگر یوں کھلی فضا میں زیادہ دیر ٹھہرتے تھے تو سردی کا شکار ہوتے تھے..

ساڑھے نو بج چکے تھے..

"سلمان.. ہم کتنی بلندی پر ہیں؟"

سلمان ٹریک کے آغاز میں ہی اپنی ایک عجوبہ جاپانی گھڑی کی فخریہ نمائش کرتا پھرتا تھا کہ سر جی یہ موسم کا حال بتاتی ہے، ہائٹ بتاتی ہے، درجہ حرارت بتاتی ہے..

"گھڑی تو رک گئی ہے سر جی۔"

وہ اس لیے رک گئی تھی کہ اس پر زیادہ سے زیادہ تیرہ ہزار فٹ کی بلندی ریکارڈ ہو سکتی تھی کیونکہ میڈان جاپان تھی اور جاپانیوں کے خیال میں کوہ فوجی یاما سے بلند دنیا میں اور کونسا مقام ہو سکتا تھا.. وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ گھڑی دیوسائی پر بھی جا سکتی ہے..

تاریکی میں.. مجھ سے پرے.. میں نے ایک سیاہ وجود کو آہستگی سے چلتے اور پھر لڑھکتے دیکھا..

میں نہیں جانتا کہ یہ میرا واہمہ تھا یا سچ مچ کوئی ایک ریچھ تھا جو ہمارے برابر میں، ٹارچوں کی روشنی سے پرے تاریکی میں چلتا تھا اور گھات لگائے منتظر تھا کہ ان میں سے کون پہلے گرتا ہے..

ہم اور کتنی دیر چل سکتے تھے..

زیادہ دیر نہیں..

اور اس کے بعد کیا ہوگا...

"شہر بے چراغ میں بھٹکتے.. نااُمیدی کے آنسوؤں کو روکتے.. مرنے کا منظر"

آج سویرے ہم برجی لاء کی چوٹی پر تھے.. ہمارے چہروں کو برف کی چمک لشکاتی تھی اور ہم چلبلے اور پُرشور ہوتے تھے.. لیلےٰ ہمارے سامنے تھی.. شاہ گوری کی سرگوشیاں مجھ تک پہنچتی تھیں کہ... آئی لَو یو... میں تم سے ایک طویل فاصلے پر ہوں اور میں ان دنوں کو یاد کرتی ہوں جب تم میرے دامن تک آئے تھے.. میری برفوں پر تمہارے خیالوں کے بوسے ابھی تک ثبت ہیں اور ان کے نیل مٹائے نہیں مٹتے.. میں ان کو روپوش کرتی ہوں تو وہ پھر سے ظاہر ہو جاتے ہیں اور جب بھی میں تمہیں اپنی قربت میں محسوس کرتی ہوں تو جھیل کرومبر کے سارے پانی مجھ میں اترتے ہیں...

یہ آج کی سویر تھی.. لیلےٰ اور شاہ گوری سے ملاقات کی سویر تھی..

اور ہم گمان نہ کر سکتے تھے کہ اسی سویر کی رات میں.. ہم دیوسائی کی تاریک شب کے جال میں بے بس ہو جائیں گے.. ہمارا زہر ختم ہو جائے گا اور ہمارے پھن بے جان ہو جائیں گے اور ہم بھٹکے ہوئے کینچوے ہو جائیں گے.. ہم گمان بھی نہ کر سکتے تھے..

برجی لاء کی جھیل کنارے سے اپنے خیمے سمیٹ کر نہایت پُر مسرت.. چِپی ڈیویز کے منظر تک پہنچنے کے نشے میں چُور جب ہم دیوسائی کے میدانوں میں اترے

تو گویا برف کے جہنم سے نکل کر ایک جنت گم گشتہ میں اترے.. جہاں برف کا آزار نہ تھا.. گھاس تھی، جھاڑیاں تھیں اور مرجھائے ہوئے پھول تھے.. خشک مٹی قدموں تلے تھی برف نہ تھی..

"صاحب.. واپسی ہے تو ہم ایک الگ راستے سے اترے گا.." علی نے کہا تھا۔

"ادھر ذرا اونچا جا کر ہم اس ندی تک پہنچے گا جہاں ہم نے کل دوپہر کا کھانا کھایا تھا.. آج بھی وہیں رکے گا اور پھر شتونگ چلا جائے گا.."

"شتونگ..." جہاں ہم پرامید تھے کہ ہمارے بیمار اور آزردہ ساتھی ہمارے انتظار میں تھے۔ "ہم وہاں کتنے بجے پہنچ جائیں گے' علی؟"

"لنچ کے بعد چلے گا تو چار بجے تک ادھر ہوگا صاحب.. انشاء اللہ"

"راستے میں رات تو نہیں ہوگی.." میں نے برجی لاء کو جاتے ہوئے جب شتونگ تک واپسی کے سفر کا حساب کیا تھا تو وہ مجھے کچھ طویل لگا تھا..

"رات کیسے ہوگی صاحب.. قریب ہے۔"

برجی لاء جھیل کے کناروں سے خیمے سمیٹتے ہوئے.. ہم ذرا رنجیدہ ہوئے کیونکہ ہم نے اس جھیل کی قدر نہ کی تھی.. پچھلی شب ہم اس کے کناروں پر اترے تھے تو یہ برفباری کے سفید اندھیروں میں اوجھل تھی.. جب آج سویرے ہم برجی لاء کو جاتے تھے تو اسے نظر بھر کے نہ دیکھا تھا.. اور اب خیمے سمیٹے تھے تو شتابی میں تھے کہ جلد از جلد کوچ کر جائیں.. اور ہم نے اس کے پانیوں کی قدر نہ کی تھی جن میں برفباری تھم جانے کے بعد ستارے ڈبکیاں بھی لگاتے تھے.... ذرا ٹھہر کے اس کے حسن کی تحسین نہ کی تھی.. ہم نے اس مختصر اور نامعلوم اور برفانی موسموں میں گھری جھیل پر دیر تک نگاہ نہ کی..

خیمے سمیٹے اور رخصت ہوگئے..

جھیل سے جدا ہو کر ہم ذرا اوپر گئے.. وہاں حیرتوں کے سفید منظر کھل گئے.. پچھلی

شب کی برفباری نے ہر شے کو ڈھک دیا تھا.. کچھ بھورے پتھر تھے، دو چار نیلے پھول تھے جو اس کی سفیدی میں سے باہر آتے تھے اور ان کے اوپر دیوسائی کا نیلگوں آسمان تھا..

پھر ہم برف کے اس صحرا سے نیچے آئے.. نیچے آئے تو سبزے اور موسم گل میں نکھار آنے لگا.. اور جب بالآخر ہم اس ندی کے کناروں تک پہنچے جہاں ابھی تک خزاں آلود گھاس اور رنگ برنگی جھاڑیوں کے جھرمٹ اور پھیکے پڑتے پھولوں کے رنگ تھے تو چار بجنے والے تھے..

ہم بہت تیز چلے تھے لیکن ندی تک پہنچتے پہنچتے چار بج چکے تھے.. دیر ہوگئی تھی.. اور ندی سے بہت پرے.. اور ندی بھی ادھر جا رہی تھی.. دیوسائی کے میدان تھے جن میں کہیں شتونگ تھا..

اور ایک مرتبہ پھر میں نے علی سے پوچھا کہ اے علی شتونگ کتنا دور ہے یہاں سے.. تو اس نے یہی کہا تھا کہ صاحب یہ ملک لاء کی وادی ہے تو ادھر سے اترتے ہیں تو سامنے شتونگ ہوگا.. نزدیک ہے صاحب..

اس ندی کنارے ہم نے پھر قیام کیا.. کچھ طعام کیا اور پھر سے چلنے لگے..

خاصی دیر چلے اور پھر اس مقام کے نیچے سے بھی گزر گئے جہاں ژالہ باری کی زد میں آکر ہم دیوسائی ٹاپ سے اترے تھے..

یہاں سے اگر ہم وہی راستہ اختیار کرتے تو تقریباً ایک گھنٹے میں ہم دیوسائی ٹاپ ہوٹل تک پہنچ سکتے تھے لیکن ہم نے شتونگ جانا تھا، اس لیے آگے بڑھ گئے..

آگے ایک طویل فاصلے کی دھند میں ملک لاء کی وادی کے اختتام پر دیوسائی کے میدان شام کے آخری اندھیروں میں روپوش ہونے لگے تھے اور میں فکرمند ہوتا تھا۔

کوئی ایک میدان آیا جس میں پتھر بہت تھے..

پھر جھاڑیوں کا ایک گھنا جنگل آیا جیسے چائے کے باغ ہوں..

ایک سربلند پہاڑ دکھائی دیا جو دیوسائی کے میدانوں میں ایک قلعے کی طرح

نمایاں ہوتا تھا..

پھر ایک تیز ندی راستے میں آئی اور ہم اس کے پار گئے..

پار گئے تو پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی.. روشنی نہ رہے تو تاریکی فوراً اس کی جگہ لینے آجاتی ہے..

تاریکی یکدم نیچے آئی اور دیوسائی کے میدانوں کو... جو ہمارے سامنے تھے اوجھل کر دیا..

ایک تاریک شب جو اترتی تھی..

دیوسائی کے میدان ایک خوفناک فلم کے منظر کی طرح تاریک وسوسوں سے آلودہ ہوتے تھے..

ہم ملک لاء کی وادی سے باہر آکر دیوسائی کی وسعت میں داخل ہو چکے تھے..

لیکن یہاں پہنچتے پہنچتے.. کہ میں آج صبح پانچ بجے کا چلا ہوا تھا.. برجی لاء چڑھ کر واپس آیا تھا اور آرام کئے بغیر تب سے چل رہا تھا.. شائد چودہ گھنٹے ہو گئے تھے مسلسل چلتے ہوئے.. اس لیے.. جیسی میری حالت اب تھی۔ کبھی ایسی تو نہ تھی.. میں تھکن سے اپاہج ہو چکا تھا.. سانس مشکل سے کھینچتا تھا.. بھوک میری رگوں کو خشک کر کے مردہ کرنے کو تھی.. اور جب میں بہت لاچار ہو گیا تو میں نے اپنے ساتھیوں اور پورٹروں کو رکنے کے لیے کہا.. "حضرات میرے دانے ختم ہو گئے ہیں.. میں مزید نہیں چل سکتا... آپ ذرا مجھے اپنے دھیان میں رکھیں کہ مکمل ضعف اور ناتوانی سے کسی بھی لمحے گر سکتا ہوں.. ڈھیر ہو سکتا ہوں.. اس لیے آپ میں سے جن لوگوں میں سکت ہے، وہ آگے چلے جائیں.. سفر جاری رکھیں.. اور مجھے ایک پورٹر، ایک خیمہ اور کچھ خوراک دے جائیں... اگر میں آج رات تک اس شتونگ بہن...... میں پہنچ گیا تو پہنچ گیا ورنہ ادھر کہیں رات کروں گا اور اگر بچ گیا تو کل وہاں پہنچ جاؤں گا..."

کوئی بھی معترض نہ ہوا..

سبھی تھکاوٹ اور مایوسی کے ہاتھوں عاجز آئے ہوئے تھے..

ایک خوف سے حاملہ دیوسائی کی تاریکی میں سامان اور خوراک کی تقسیم ہوئی..

اور چونکہ میں سکردو بازار کے علی مدد کی بجائے صدپارہ کے علی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا تو اس لمحے نہ جانتا تھا کہ علی مدد حسد کی آگ میں مبتلا ہو کر میرے لیے کوئی خیمہ یا سلیپنگ بیگ چھوڑ کر نہیں جا رہا... بیشتر سامان اپنے ساتھ لے جا رہا ہے اور میں اپنی ناتوانی میں چیک نہیں کر سکتا تھا کہ اگر میں دیوسائی کی رات میں تنہا چلتا ہوں تو رات گزارنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے.. اس لمحے میں نہیں جانتا تھا..

لیکن وہاں ایک عجیب وقوعہ ظہور پذیر ہوا..

وہاں یہ کھلا کہ صرف میں نہ تھا جو نڈھال اور لاچار ہو چکا تھا... صرف میں تھا جس نے اقرار کر لیا تھا.. انصاری، سلمان اور شاہد بھی مجھ سے بہتر حالت میں نہ تھے اور انہوں نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ پورٹر آگے چلے جائیں، ہم پیچھے پیچھے آتے ہیں..

اور پورٹر ہمیں خدا حافظ کہہ کر آگے چلے گئے.. کہاں چلے گئے.. ہمیں کچھ دکھائی نہ دیا کہ کہاں چلے گئے.. اور میں نے انہیں صرف اتنا کہا کہ اگر آپ لوگ شتونگ پہنچ جاتے ہیں تو ہمارے خیمے ایستادہ کر دیجئے گا۔ خوراک کا کچھ بندوبست کر دیجئے گا.. اور اگر ہم نہیں پہنچتے تو کل صبح امدادی پارٹی روانہ کر دیجئے گا.. صرف اتنا کہا..

اور وہ چلے گئے..

اور اب رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے اور ہم علی کے ہمراہ دیوسائی کی تاریکی میں خوفزدہ مارموٹس کی طرح بھٹکتے تھے...

ہم وہ تھکے ہوئے ریچھ تھے جنہیں سرمائی نیند کے لیے غار نہیں مل رہے تھے..

وہ سنوٹراؤٹ تھے جو اپنی مستی میں ندی سے باہر آکر تڑپتی تھی..

وہ گولڈن ایگل تھے... جو اپنی حد سے زیادہ پرواز کر کے اب کسی چٹان پر گرنے والا تھا..

اور وہ سنو ٹائیگر جو دیوسائی کی اندھی رات کے شکنجے میں جکڑے جا چکے تھے جن کے پنجے اس شکنجے کی آہنی گرفت خون آلود کرتی تھی اور رہائی کا کوئی امکان دکھائی نہ دیتا تھا..

دونوں ٹارچیں زرد اور بجھتی ہوئی روشنی دینے سے بھی انکاری ہو گئیں اور تاریک ہو گئیں.. لیکن ان کے بجھنے سے دیوسائی کچھ کچھ دکھائی دینے لگا... اور وہاں نہ چراغ تھے، ان بستیوں کے جو کبھی یہاں تھیں.. نہ صدپارہ کے جگنو تھے جو کاشانۂ دیوسائی کو روشن کرتے تھے اور نہ کہیں ماہتاب ابھرتا تھا.. البتہ ابر بہت تھے...

ہم اس شہر بے چراغ میں چلتے جاتے تھے.. آس امید کے بغیر، لوہے اور پتھر بدنوں کو گھسیٹتے زور لگاتے... ناامیدی کے ان آنسوؤں کو روکتے جو بڑی آسانی سے بہہ سکتے تھے..

ہر ایک اپنی صلیب اٹھائے گھسٹتا جا رہا تھا..

"صاحب روڈ آ گیا ہے.." کہیں سے علی کی آواز ہم تک پہنچی..

"روڈ آ گیا ہے.. روڈ آ گیا ہے.." حواس باختہ بے یقین آوازیں ہر سو گونجنے لگیں۔

"کہاں آ گیا ہے.. کونسا روڈ آ گیا ہے.."

ہم گرتے پڑتے کوڑھ زدہ مریضوں کی طرح اپنے اس مسیحا کو تلاش کرنے لگے.. ایک گھاٹی سے نیچے آئے..

اور یہ ایک ناممکن معجزہ تھا.. رات کے دس بجے ہم دیوسائی کی تاریکی میں ایک روڈ پر آ نکلتے ہیں.. اور وہ ہمیں ابھی دکھائی نہیں دے رہی، صرف علی کہہ رہا تھا کہ صاحب یہ روڈ ہے جس پر آپ کھڑے ہیں..

"چلیں صاحب.. شتونگ چلیں.."

ہم سب چلنے لگے لیکن ہم کدھر جا رہے تھے۔ "علی اگر یہ دیوسائی روڈ ہے، کوئی اور کچا راستہ نہیں تو بھی تم کیسے جانتے ہو کہ ہم شتونگ کی جانب چل رہے ہیں۔

ہو سکتا ہے بالکل مخالف سمت میں دیوسائی ٹاپ کو واپس جا رہے ہوں.."

"میرا اندازہ ہے صاحب... ستارے نظر آ رہے ہوتے تو کچھ حساب لگاتے.. لیکن صاحب اگر واپس دیوسائی ٹاپ پر بھی جا نکلتے ہیں تو کم از کم ادھر ہوٹل کا ٹینٹ ہوگا.. رضائی اور بستر مل جائے گا.. چلتے جاؤ صاحب.."

ہم چلتے گئے.. لیکن اسی اندھیری غار میں.. بس چلتے گئے..

سلمان میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا. مجھے بھٹکتا اور ڈولتا دیکھ کر اس نے مجھے خبردار کیا۔ "سر جی آپ روڈ کے کنارے پر چل رہے ہیں اور کنارے کے عین نیچے بہت گہری کھائی ہے.. ذرا احتیاط سے چلیں.."

اور میں احتیاط کرنے لگا.. کہیں ٹھوکر لگتی تو کوشش کرتا کہ بائیں جانب کھائی میں نہ جا گروں... اور مسلسل اس تاریکی کو گھورتا چلتا جس میں جانے کتنی گہری کھائی موجود تھی.. اور بہت بعد میں دیوسائی سے واپسی پر میں نے اسی مقام کو غور سے دیکھا تو بائیں جانب کوئی کھائی نہ تھی.. صرف میدان تھا.... لیکن اس رات تو وہاں کھائی تھی اور میں اپنے آپ کو سنبھالتا چلتا تھا.. میں تھکاوٹ سے اتنا نڈھال تھا کہ کسی بھی ٹھوکر کے بعد زمین پر ڈھیر ہو سکتا تھا..

دور.. اس روڈ سے ذرا بلندی پر... دیوسائی کی سیاہ چادر میں ایک جگنو ٹمٹمایا.. اور سب رک گئے..

"صاحب... یقیناً یہ شتونگ ہے اور انہوں نے لالٹین روشن کی ہے، ہمیں گائڈ کرنے کے لیے.."

ہم بمشکل مسکرائے کہ شب سیاہ کا خاتمہ قریب ہے.. ہم بہت خوش نہ ہو سکتے تھے کہ ہمارے بدنوں میں خوش ہونے کی سکت بھی نہ تھی... اور نہ ہم مزید تیز چل سکتے تھے کہ جلد از جلد منزل پر پہنچیں...

تھوڑی دور چلنے کے بعد احساس ہوا کہ یہ جگنو دیوسائی کی اتھاہ تاریکی میں

حرکت کرتا تھا.. تو پھر یہ شتونگ نہ تھا کوئی مسافر تھا جو کہیں جا رہا تھا.. لیکن محسوس ہو
تھا کہ وہ ہماری جانب آ رہا ہے..

میں اپنے آپ کو اس تاریکی میں اترتی ہوئی شدید سردی میں ایک اپاہج کی طرح
گھسیٹتا ہوا قدم اٹھاتا تھا.. اور اگر اس لمحے میرے ہاتھوں میں ایک کشکول ہوتا تو میں
گداگر ہو جاتا یقیناً اور اپنی تھکاوٹ اور لاچارگی کی غربت میں کشکول پھیلا کر بھیک
مانگتا... ایک خیمے کی... سوپ کے ایک پیالے کی... کافی کے ایک گرم کپ کی... میں
صدق دل سے کہہ رہا ہوں کہ میں ایسا کرتا.. گھٹنوں پر جھک کر بھیک مانگتا کہ میں اتنا
تھک چکا تھا، اتنا بے بس ہو چکا تھا..

اور اس بے چارگی میں کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ میں یہیں گر کر سو جاتا
ہوں.. آگے چلنے سے انکاری ہو جاتا ہوں.. جیسے برف کے طوفان میں گھرا ایک کوہ پیما
تھکن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور برف پر گر کر سو جاتا ہے.. ہمیشہ کے لیے..

وہ جگنو اب واضح طور پر اندھیرے میں جھولتا ہمارے قریب آتا گیا...

ہم سب کھڑے ہو گئے.. اگرچہ کھڑے ہونے کے لیے بھی بہت ہمت
درکار تھی..

تھوڑی دیر میں ٹارچ کی تیز روشنی ہمارے چہروں پر پڑی.. اور وہ اتنی تیز تھی
کہ ہماری آنکھیں چندھیا گئیں..

اس ٹارچ کے پیچھے... عباس اور علی مدد تھے...

عباس نے سب کو دیکھا اور پھر میری جانب لپک کر آیا۔ "صاحب آپ ٹھیک
ہو؟" اس کی ہمدردی اور فکرمندی میں کوئی بناوٹ نہ تھی، صرف مجھے خوش کرنے کا کوئی
شائبہ نہ تھا بلکہ وہ ایک ایسا شخص تھا جو برف کے طوفان میں گھرے ہوئے ایک شخص کی
مدد کے لیے صرف اس لیے پہنچتا ہے کہ وہ ایک انسان ہے۔ "صاحب ہم آپ کے لیے
چائے لایا ہے.. بسکٹ لایا ہے.. صاحب تھک گیا ہے؟"

"ہاں.." میں اس کا شکر گزار ہوا..

"ہم ادھر شتونگ میں بیٹھا آپ کا انتظار کرتا تھا.. رات بہت ہو گیا تو میں
نے کہا چلو.. چائے بناؤ، بسکٹ پکڑو اور صاحب کا پتہ کرو، ادھر کیوں بیٹھا ہے.. اللہ کا
شکر ہے صاحب آپ آ گیا.. چائے پیو صاحب.."

میں نے بمشکل چائے کے چند گھونٹ بھرے.. بسکٹ نہ کھا سکا کیونکہ بلندی
اور تھکاوٹ نے مجھے پتھر کر دیا تھا اور حلق کام نہ کرتا تھا..

"عباس ادھر سے شتونگ کتنا دور ہے؟"

"ابھی تو ایک گھنٹہ لگے گا آپ کو.. ہمت کریں.. اب تو دور نہیں۔" اس کے
کھردرے پتھر چہرے پر میرے لیے سخت فکرمندی تھی۔ "ابھی چلتے رہو نہیں تو
ٹانگیں سخت ہو جائیں گی اور مشکل ہو گا۔"

چائے کے ان چند گھونٹوں نے امرت دھارے کا کام دیا.. بدن کو ڈھارس
دی.. اور ہمیں یہ بھی ڈھارس ہوئی کہ ہم شتونگ کی جانب ہی سفر کر رہے ہیں..

میں نے چلنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا گیا.. اور پاؤں یوں جیسے زمین میں پیوست
ہو کر پتھر ہو گئے ہوں..

عباس آگے آیا۔ "صاحب آپ بولو نہیں.. آپ کا حال اچھا نہیں.. ہم آپ
کو اپنے کندھے پر اٹھا کر چلتا ہے.. آؤ۔"

"نہیں عباس.."...

"ضد نہیں کرو صاحب.. آپ گر جائے گا.. ہم آپ کو اچھی طرح اٹھائے
گا.. ہم اچھا گھوڑا ہے۔" وہ ہنسنے لگا..

اور یہ موجودہ حالات میں ایک خوشگوار آفر تھی.. میں کسی بھی لمحے ڈھیر ہو
سکتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ ندیوں کے پار جانا، پورٹر پر سوار جانا تو مکمل مجبوری ہوتی
تھی... لیکن کسی انسان کے کندھوں پر سوار ہو کر سفر کرنا ایک عجیب سی بات تھی.. اس

میں انا کا ہرگز دخل نہ تھا.. پہاڑوں کے اندر جاتے ہی انا سب سے پہلے دم توڑتی ہے.. اور
مجھے ساری عمر قلق رہے گا کہ میں اتنا لاچار ہو گیا تھا کہ مجھے کسی اپاہج کی طرح اٹھا
کر منزل پر پہنچایا گیا.. ٹھیک ہے اگر میں چند قدم چلنے کے بعد گر جاؤں تو عباس مجھے
بے شک اٹھا لے لیکن وہ چند قدم تو چلوں..

"عباس اگر ہم گر جاتا ہے تو پھر خوشی سے گھوڑے پر بیٹھ جائے گا.. ابھی چلتا ہے"
اس کے باوجود عباس بار بار میری بغل میں ہاتھ ڈال کر مجھے سہارا دیتا ہوا چلا..

جس مقام پر... ملک لاء کی وادی میں سے اتر کر ہم نے پورٹروں کو رخصت کیا
تھا، وہ واٹوپائی کہلاتا تھا... اور یہ جگہ جہاں عباس خواجہ خضر بن کر پہنچا تھا، بلوم ڈولے
تھا.. اور ہم سے آگے کوئی مقام پھوتے داس نام کا تھا اور اس کے بعد کہیں شتونگ تھا..
پہلے تو جوڑ جوڑ دکھتا تھا.. پھر پورا بدن دکھتا تھا.. پھر پوری خدائی دکھتی تھی اور اس دکھ
بھرے سناٹے میں میں ہر شے سے غافل اور بے حس چلتا تھا.. ٹھپ ٹھپ.. آئرش
خچروں کی طرح کے جھالر دار بوجھل پاؤں سے چلتا تھا... ذرا جھولتا تھا تو گرنے سے قبل
ہی عباس مجھے سہارا دیتا تھا..

رات کا پتہ نہیں وہ کونسا پہر تھا... جب ہمارے کانوں میں ایک مدت کے بعد
پانی کے بہنے کی آواز آئی.. قریب ہوئے اور ایک نالے کو پار کیا.. پھر ہمیں کچھ بھی
سجھائی نہ دیتا تھا، نہ ہمیں احساس ہوتا تھا کہ ہم چڑھائی پر بلند ہوتے ہیں یا کہیں نیچے
اترتے ہیں.. صرف ہم چلتے جاتے تھے دیوسائی کی رات میں... جب عباس نے کہا "ادھر
صاحب..." "ہم ادھر ہو گئے.. وہاں تاریکی میں ہمارے خیمے تھے.. کہیں ایک لالٹین بھی
تھی.. شتونگ تھا... یا نہ تھا.. ہمیں اس کی پروا نہ تھی.. ہم تو صرف اپنے خیموں کو ایستادہ
دیکھتے تھے.. تاریکی میں بھی ان کے رنگ ہم تک پہنچتے تھے.. یہ وصال کے رنگ تھے جو
تاریکی میں بھی نمایاں ہو رہے تھے.. وہ ہمارے انتظار میں تھے..
مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تاریکی میں سے کون آگے آیا.. کس نے مجھے سہارا

دیا.. کس نے مجھے خوش آمدید کہا..
میں کسی کو نہ دیکھتا تھا.. صرف اپنے خیمے کو دیکھتا تھا.. میں جھکا اور بوٹوں سمیت
خیمے کے اندر رینگ کر سلیپنگ بیگ تک پہنچا اور پتھر ہو گیا..
خیمے کے اندر مختلف آشنا شکلیں جھانکتی تھیں اور دریافت کرتی تھی۔ "تارڑ
صاحب.. آپ ٹھیک ہیں ناں.." بھلا ایک پتھر کیسے جواب دیتا...
خالد ندیم کا مسکراتا مار موٹ چہرہ بھی اندر آیا۔ "ہم تو آج سویرے.. اوپر
برجی لاء پر نظریں جما کر بیٹھ گئے تھے.. ناشتے کے بعد ہم نے انتظار کرنا شروع کر دیا...
دوپہر کا کھانا کھایا تو کرسیوں پر بیٹھ کر آپ کی راہ دیکھنے لگے.. اوپر برفوں میں اگر کوئی دھبہ
نظر آتا تو ہم کہتے کہ یہ ہماری ٹیم ہے... رات ہو گئی تو... سر آپ کہاں رہ گئے تھے؟"
میاں صاحب کی عینک بھی اندر آئی۔ "جناب عالی.. ہم تو فکر کرتے کرتے
نامہ نیم ہو چکے تھے.. ادھر لوگ بتا رہے تھے کہ دیوسائی پر رات ہو جائے تو... تو
جناب عالی ہم تو بہت ہی فکر مند تھے... فارغ ہو گئے تھے پریشانی میں۔"
میں ان سب کی محبت کے جواب میں بس ہُوں ہاں کیے جاتا تھا..
میاں صاحب برآمد ہو گئے تو حسن صاحب طلوع ہو گئے۔ "تارڑ صاحب
ایک تو میں ویسے اداس تھا، بیگم سے بات کیے ہوئے پورے دو دن ہو گئے ہیں اور ایک
آپ کے لیے بہت تشویش تھی.. دوپہر کے بعد تو بہت انتظار کیا کہ ابھی آتے ہیں،
ابھی پہنچتے ہیں.. ملک لاء وادی کی طرف سے بتایا گیا تھا کہ آپ اتریں گے.. دوربین سے
بھی جائزہ لیا.. پھر رات زیادہ ہو گئی تو عباس بہت پریشان ہوا، کہنے لگا میں چائے اور
بسکٹ لے کر جاتا ہوں۔ میرا صاحب پرابلم میں ہے.. دیوسائی کی رات میں ہے..
صاحب کے ساتھ ہم سنولیک گیا تھا، بیافو ہیسپر گیا تھا.. اس کے لیے چائے اور بسکٹ
لے کر جائے گا.."
مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ دیوسائی ٹاپ پر ہم جن بیماروں کو چھوڑ آئے تھے،

ان کا حال اچھا تھا.. اگرچہ اب ہمارا حال برا ہو گیا تھا..

شتونگ... یعنی جہاں گوشت ملتا ہے.. اللہ جانے کس کا گوشت ملتا ہے.. مارخور ادھر ہوتا نہیں، مچھلی ہوتا ہے یا ریچھ ہوتا ہے تو کس کا گوشت ملتا ہے جس کے حوالے سے اس جگہ کو شتونگ کہتے ہیں..

نہ میں نے شتونگ دیکھا تھا اور نہ مجھے کوئی خواہش تھی.. میں نے صرف اپنا خیمہ دیکھا تھا..

میں ایک بار اپنے خیمے کے اند گیا تو پھر باہر نہیں آیا..

میرے لیے یہی کافی تھا کہ میں شتونگ پہنچ گیا تھا اور میں گداگر ہونے سے بال بال بچ گیا تھا... کشکول دراز کئے بغیر مجھے ایک خیمہ مل گیا تھا.. جس میں میں اپنی رانوں میں آئے ہوئے زخموں کو سہلا سکتا تھا، ڈیٹول سے دھو سکتا تھا..

سلیپنگ بیگ پر بیٹھے روم سروس مل گئی تھی اور میرے سامنے ایک پیالے میں چکن کارن سوپ گرم اور بھاپ دار تھا، مکئی اور انڈے کی مہک والا تھا..

پھر کافی کا ایک مگ بھی بن مانگے آ گیا... جس کے تلخ ذائقے میں زندگی پھر سے کروٹیں لینے لگی..

شتونگ... جہاں گوشت ملتا ہے..

شتونگ.. جہاں میں پہنچ گیا تھا..

دیوسائی کی نصف شب میں..

میرے لیے تو شتونگ وہی بستی تھی جو اگلے زمانوں میں یہاں آباد تھی..

یہاں شہر تھے اور آبادیاں تھیں..

اور ایک لاچار اور بے بس کوہ نورد عباس کے دیئے کی روشنی میں یہاں تک پہنچ گیا تھا..

بس میرے لیے یہی شتونگ تھا..

"شتونگ کی غار میں زخموں سے کراہتا ہمالیائی ریچھ"

شتونگ کی شب میں.. اپنے غار نما خیمے میں.. میں ایک زخمی اور نڈھال براؤن ہمالین بیئر کی طرح کراہتا اور اپنے زخم سہلاتا رہا.. یہ بھورا ہمالیائی ریچھ اپنی سرمائی نیند کے لیے اپنے مخصوص غار میں پہنچ تو گیا تھا لیکن سو نہ سکتا تھا..

عمر کے لمبے سفر نے میرے بدن کی رگ رگ میں تھکاوٹ کا زہر بھر دیا تھا... جیسے موہنجوداڑو کی ایک ایک اینٹ پانچ ہزار برس کی مسافت کے بعد بُھربُھری اور شکستہ ہوتی ہے، ایسے میرا بدن تھا..

اگرچہ اب میں وہ سنو ٹراؤٹ تھا جسے خشکی پر تڑپنے کے بعد یکدم پانی مل گئے تھے لیکن میرے گلپھڑے ابھی تک پھڑکتے تھے..

میں وہ گولڈن ایگل تھا جو بالآخر ایک طویل پرواز کے بعد اپنے گھونسلے میں اتر آیا تھا لیکن چونچ کھولے ہانپتا تھا..

اگرچہ میرے پنجے دیوسائی کی رات اور اس میں ایک پُرہول سفر کے شکنجے سے آزاد ہو چکے تھے لیکن میں وہ سنو ٹائیگر تھا جو اپنے خون آلود پنجوں کو چاٹتا تھا..

شتونگ کی شب میں.. اپنے غار نما خیمے میں.. یہ میں تھا.. کروٹیں بدلتا ایک ریچھ تھا.. ایک سنو ٹراؤٹ تھی.. ایک گولڈن ایگل یا ایک سنو ٹائیگر تھا..

زخم سہلاتے، کروٹیں بدلتے، سوتے جاگتے.. سویر ہو گئی..

میری غار کے تنگ دہانے کے سامنے جو تاریکی تھی، اس میں روشنی گھلتی گئی اور بڑھتی گئی.. ایک ہاتھ اندر آیا.. شاید علی مدد کا ہاتھ اور میری غار میں ناشتہ رکھ کر پیچھے ہٹ گیا..

سب لوگ مجھ سے خائف تھے.. مجھ سے گریز کرتے تھے.. اس لیے کہ غار کے اندر اپنے زخم چاٹتا ہوا ایک ناراض بُھورا بھالو تھا.. اور وہ مجھ سے دور دور رہتے تھے.. خاص طور پر علی مدد... جو پچھلے کئی برس سے دیوسائی پر نہیں آیا تھا اور ہمارا گائیڈ بن گیا تھا.. اس نے برجی لاء سے شتونگ کا سفر کبھی نہیں کیا تھا.. یہ اس کی نااہلی تھی کہ ہم بھٹک گئے اور راستے میں رات ہو گئی..

"سر جی اب طبیعت کیسی ہے؟" یہ خالد ندیم کی مؤدب اور ڈری ڈری آواز تھی جو خیمے کے اندر آئی..

"سخت بی پی طبیعت ہے.." میں نے دھاڑنے کی کوشش کی..

"سر جی.. اب تو باہر آجائیں.. شتونگ اتنا بُرا نہیں.." وہ بے حد ملتجانہ انداز میں کہہ رہا تھا..

میں نے بہت سوچا کہ مجھے باہر جانا چاہیے یا نہیں..

اس غار کی عافیت سے باہر نکلنا چاہیے یا نہیں...

کیا پتہ باہر ابھی تک دیوسائی کی رات ہو، گھات لگائے بیٹھی ہو.. وہ میری منتظر ہو اور جب میں باہر نکلوں تو یہ سویر دھوکا ہو اور باہر تاریکی ہو اور میں پھر سے بھٹکنے لگوں اور ایک خیمے، ایک پیالی سوپ اور کافی کے ایک مگ کے لیے گداگر ہو جاؤں..

ابھی تو میں اپنی غار میں ہوں اور محفوظ ہوں..

لیکن باہر.. کچھ اور آوازیں تھیں جو مجھے اطلاع کرتی تھیں کہ باہر دن ہے..

کوئی بہت ناتواں اور گھسا ہوا ٹیپ ریکارڈر کسی ہندوستانی گانے کے تھکے تھکے بول دہراتا جاتا تھا.. آجا اب تو آجا میری قسمت کے خریدار..

کچھ نامانوس آوازیں تھیں.. کسی اور زبان میں باتیں کرتیں.. اور کچھ مانوس آوازیں تھیں میرے ساتھیوں کی جو مجھ سے خائف ذرا ہولے ہولے بولتے تھے.. چنانچہ میں نے ہمت کی اور ایک چوپائے کی طرح جو کہ میں تھا اور ایک بھالو کی طرح جو کہ میں دیوسائی میں بھٹکتے ہو گیا تھا، اپنے بھاری کندھے اور کولہے ہلاتا خیمے سے باہر آگیا..

"دیوسائی کاٹج... یہاں ہر قسم کے تازہ کھانوں اور کیمپنگ کا بندوبست ہے.."

ٹین کا ایک بورڈ یہ اعلان کرتا پتھروں پر ٹیڑھا ہوتا مشکل سے ٹکا ہوا تھا.. اور اس بورڈ سے پرے... ایک گھاس بھری ٹھنڈک آلود وسعت میں تین خاموش ندیاں، سویر کی ہلکی روشنی میں پارہ ہوتی، روشن ہو کر تلملاتی جیسے ایک سنو ٹراؤٹ تلملاتی ہے، ندیاں رواں تھیں.. اور ان میں سے ایک کے کنارے میاں صاحب شیو بنا رہے تھے، ریزر کو سرد پانی میں ڈبوتے تھے، پھر اسے اپنے رخسار پر رکھتے تھے جو ناتوانی کے باعث رخسار کہلانے کا مستحق تو نہ تھا، بہرحال اس پر ریزر رکھتے تھے اور اس کے سرد بلیڈ کو محسوس کر کے کراہتے تھے اور زیر لب بھاٹی دروازے کی کوئی پیچیدہ گالی بڑبڑاتے تھے اور چہرے سے جھاگ اور داڑھی صاف کرتے تھے.. خالد ندیم منہ میں ایک لمبا سا برش جو دور سے مسواک لگتا تھا، گھسیڑے بار بار ندی میں تھوتھو کرتا آلودگی پھیلاتا تھا..

دیوسائی کاٹج ہوٹل... دیوسائی روڈ کے کنارے.. دو بدنما خیمے.. ایک میں ریستوران اور دوسرے میں رہائش کا مناسب بندوبست.. درمیان میں ایک اونچے پائپ پر پاکستان کا چاند ستارہ پرچم دیوسائی کی باریک ہوا میں پھڑپھڑاتا نظروں کو خوشی دیتا تھا..

میں اسے دیکھ کر ایک بچے کی طرح مسکرایا... یہ میری پہلی قدرتی مسکراہٹ تھی..

ہوٹل کے دو خیموں کے درمیان پاکستانی جھنڈے کے عین نیچے چند آہنی

کرسیاں اور دو میز تھے... اور ہمارے چار خیمے ایستادہ تھے.. ایک نیلا.. ایک زرد گنبد والا.. ایک گہرا سبز اور ایک وہی غار نما سلیٹی رنگ کا جس میں سے ابھی ابھی ایک عمر رسیدہ بھالو برآمد ہوا تھا..

حسن صاحب نے فوراً اس بھالو کو ایک سگریٹ کا آدھا ٹوٹا پیش کیا.. کیونکہ ہمارے برینڈ کے سگریٹوں کا سٹاک ختم ہو چکا تھا اور اب ان کے ٹوٹوں کی بھی راشن بندی کی جا رہی تھی..

"دیوسائی ٹاپ سے ادھر شتونگ تک کا سفر کیسا رہا حسن صاحب؟"

"جناب پرسوں صبح آپ کے چلے جانے کے بعد ہم بہت دیر تک بہت افسردگی میں رہے کہ ہم آپ کے ہمراہ برجی لاء نہ جا سکے.."

"اچھا ہوا جو نہ جا سکے.. ہم جو گئے تو ہم بھی پچھتائے.. ہمارا حال دیکھا ہے"..

اور میں نے انہیں برجی لاء کی برفباری اور اس رات کے دلدوز قصے سنائے.. اور دیوسائی کی رات میں بھٹک جانے کی ہولناک داستان بیان کی..

"لیکن سر جی..." خالد ندیم جو اپنے دانت لشکا کر واپس آ چکا تھا، اس پر ان قصوں اور داستان کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ نہایت مسرت بھری رغبت سے کہنے لگا.. "آپ نے نظارے تو دیکھے ہوں گے ناں.. زبردست.. نہیں؟"

"نہیں..." میں نے کہا۔

"کیوں نہیں...؟" وہ پریشان ہو گیا۔ شتونگ کی تازہ نکھری ہوئی اور سرد ہوا میں پریشان ہو گیا..

"کوئی خاص نظارہ نہیں تھا جب ہم ٹاپ پر پہنچے.. چند چوٹیاں تھیں اور بہت ہی دور تھیں اور ہم تو ان کو پہچان بھی نہ سکے.. صرف علی نے بتایا کہ وہ کے ٹو ہو سکتی ہے اور شاید وہ والی مشابرم ہے.. اب ان لوگوں کا کیا اعتبار... پتہ نہیں وہ کے ٹو تھی بھی یا نہیں.. یقین کرو خالد تم نے کچھ بھی مس نہیں کیا.."

"جانے دیں سر.." اس نے بہت بدتمیزی سے کہا۔ "آپ تو چاہتے ہی نہیں کہ میں کے ٹو دیکھوں.. پہلے تھنگل میں مجھے بیمار قرار دے کر موتی نفے کے ساتھ سکردو واپس کر دیا اور خود آگے چلے گئے.. اور اب میں ذرا سا علیل ہوا ہوں تو دیوسائی ٹاپ پر چھوڑ کر پھر اسے دیکھنے چلے گئے.. آپ جان بوجھ کر مجھے ساتھ نہیں لے جاتے.. اچھا تو آپ کے ٹو کو پہچان نہیں سکتے تھے.. چھوڑیں سر.. آپ کے ٹو کو نہیں جانتے تو اور کون جانتا ہے.."

اور شائد یہ حقیقت تھی.. اگر میں کے ٹو کو.. شاہ گوری کو نہیں جانتا تھا تو اور کون جانتا تھا..

میرے سوا اور کون تھا جو پچھلی شب شاہ گوری کو خواب میں دیکھتا تھا.. کوئی نہیں.. اس کی بدنی بناوٹ اور سفید انگلیوں کو جانتا تھا جو سیدھی میرے دل میں اترتی تھیں.. میں اسے ایک دیوی کی طرح پوجتا تھا.. کوشش کرتا تو اپنی بھدی آواز میں اس کی شان میں بھجن گا سکتا تھا.. تیرے دوار کھڑا اک جوگی.. وغیرہ... میں نے اسے ہر حالت میں دیکھا تھا! کنکورڈیا سے.. ہیلی کاپٹر سے... پی آئی اے کے بوئنگ جیٹ کے اس کاک پٹ سے جس میں اس کی چوٹی کے عین اوپر "کے ٹو کہانی" کی تقریب رونمائی ہو رہی تھی تو اسے میرے سوا اور کون جانتا تھا..

میں جان بوجھ کر انہیں برجی لاء کے اس منظر کے قصے نہیں سنا رہا تھا.. ٹاپ پر سے نظر آنے والی جھیلوں کے قصیدے نہیں کہہ رہا تھا تاکہ وہ دکھی نہ ہوں کہ وہ کیوں ہمارے ساتھ نہ گئے..

منظروں کا تکبر کیا جائے تو وہ آپ کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں... عشق اور حسن کے حصول کا تکبر کیا جائے تو وہ ماند پڑ جاتے ہیں..

"تو آپ کیا کہہ رہے تھے حسن صاحب؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا جناب کہ آپ کے چلے جانے کے بعد ہم بہت ملول اور

رنجیدہ بیٹھے رہے کہ ہم آپ کے ہمراہ برجی لاء کیوں نہ جاسکے.. ہم نے کچھ آرام کیا۔ کچھ پراٹھے اور دیسی انڈے کھائے ناشتے کے طور پر.. کچھ اور آرام کیا اور پھر پراٹھے اور دیسی انڈے کھائے تو طبیعت بحال ہوگئی۔ ہم بہتر محسوس کرنے لگے اور ہم نے سوچا کہ اب سفر کرنا چاہیے.. رک سیک اٹھائے، پورٹروں کو آگے لگایا اور دیوسائی روڈ پر چلنے لگے.. چلتے گئے.. اور پھر ہم نے حُسن کا اخیر دیکھا تارڑ صاحب..."

"کہاں دیکھا؟"

"جناب دیوسائی میں چلتے ہوئے اخیر آتا ہی نہیں.. لگتا ہے کہ اخیر آگیا ہے.. اس کی خزاں رسیدہ گھاس کے میدانوں میں.. بادل عجیب تھے.. ہوا عجیب تھی.. چودہ ہزار فٹ کی بلندی کو اپنے بدن میں محسوس کرتے ہم چلتے جاتے تھے.. اور ان بے شمار نیلی ندیوں کو دیکھتے ہوئے چلتے تھے جو اس میدان میں جانے کہاں سے آتی ہیں اور جانے کہاں چلی جاتی ہیں.. چلتے ہوئے کوئی منظر سامنے آتا ہے تو لگتا ہے کہ اخیر آگیا ہے.. لیکن نہیں آتا.. ذرا آگے جاتے ہیں تو کوئی اور سلسلہ شروع ہوجاتا ہے.... حُسن کا سفر ہم سمجھتے ہیں کہ یے تک پہنچ گیا ہے تو وہ پھر الف سے شروع ہوجاتا ہے.. اور جب ہم حُسن اور تھکاوٹ سے نڈھال ہوگئے تو پیچھے سے ایک جیپ آئی.. اسے اشارہ کیا تو وہ رک گئی.. اور ہم نے کہا۔ "بھئی ہمیں شتونگ تک لے جاؤ گے.."

ڈرائیور مسکرا کر کہنے لگا۔ "جتنی دیر میں تم جیپ میں بیٹھو گے اور پھر اترو گے، اتنی دیر چلو تو شتونگ آجائے گا.. یہ اس گھاٹی کے پار میدان میں ہے—

اور تارڑ صاحب ہم پانچ منٹ چلے ہیں تو شتونگ آگیا.."

"پھر کیا ہوا؟"

"تو پھر یہاں دیوسائی کاٹیج ہوٹل تھا... اور یہاں مچھلی تھی۔"

"مچھلی تھی؟"

"جی ہاں۔" خالد فوراً مارموٹ مونچھیں سنوار کر بولا۔ "دیوسائی کاٹیج کا جو

مالک ہے.. وہ بھی کوئی پورٹر ہے.. تو یہ ایک کپڑا اپنی شلوار میں چھپا کر نیچے گیا اور جو بڑا نالہ ہے وہاں تک گیا... جب واپس آیا ہے تو اس کے پاس یہ اتنی بڑی بڑی نو مچھلیاں تھیں.. میں نے ان کی تصویر بھی اتاری ہے.. میں نے پوچھا کہ یار تم آدھے گھنٹے میں اتنی ڈھیر ساری مچھلیاں کیسے پکڑ لائے ہو تو اس نے بتایا کہ صاحب ادھر سخت پابندی ہے کہ دیوسائی کی ندیوں میں مچھلی کا شکار نہیں کرنا.. تو ہم نے پیٹ تو بھرنا ہے تو ہم ذرا چپکے چپکے جاتا ہے اور کسی ایسی جگہ پر جہاں ندی تنگ ہوتا ہے، ادھر کپڑا ڈالتا ہے تو اتنا مچھلی لوگ آتا ہے کہ ہم سنبھال نہیں سکتا.. جتنا اٹھا کر لا سکتا ہے، لے آتا ہے.."

میں نے پوچھا۔ "ہمیں بھی کھلاؤ گے؟"

کہنے لگا "کھلائے گا.."

"اور تارڑ صاحب اس نابنجار نے ہمیں کل شام کے کھانے میں ہمیں صرف مچھلی کی پونچھیں اور سر کھلائے اور ساٹھ روپے وصول کر لیے.. کم از کم شتونگ میں تو یہ ظلم نہیں ہونا چاہیے.."

خالد ندیم از حد آزردہ تھا..

"آپ نے اپنی بیگم کو شتونگ سے فون کیا؟" میں نے حسن صاحب سے پوچھا۔

"نہیں جی.." وہ معصومیت سے بولے۔ "ادھر پی سی او ہی نہیں ہے۔"

سلمان کے والد صاحب نے بھی جب اسے سنولیک ٹریک سے واپسی پر سرزنش کی تھی کہ بے وقوف کے بچے تم نے پورے تین ہفتے فون کیوں نہیں کیا تو اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا کہ والد صاحب ادھر درہ ہسپر اور سنولیک پر کوئی پی سی او نہیں تھے.. اس اطلاع پر والد صاحب سخت متعجب ہوئے تھے اور ڈانٹ کر کہا تھا کہ تم ایسی جگہ کیوں چلے گئے جہاں پی سی او بھی نہیں ہوتا.. انہیں اگر سچ مچ معلوم ہوجاتا کہ وہ کس قسم کی جگہ گیا تھا تو وہ نہ صرف اسے عاق کر دیتے بلکہ فوری طور پر مرغا بھی بنا دیتے.. اور سلمان کو بوجوہ مرغا بننے میں بے حد دشواری پیش آتی..

چند آوازیں اور انجن کا شور.. سکردو سے آنے والی ایک جیپ شتونگ کی ایک
ندی کے عین درمیان میں پہنچ کر پھنس گئی تھی.. دھواں چھوڑتی، زور لگاتی تیز پانیوں کی
زد میں آ کر لاچار ہو چکی تھی.. دیوسائی کاٹج کا سارا عملہ اور ہمارے پورٹر فوراً اس کی مدد
پہنچے اور اسے دھکیل کر ندیا کے پار لے جانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے..

ان علاقوں میں کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ یہ جو مصیبت میں گرفتار ہے، وہ میرا
دوست ہے یا رشتے دار ہے.. اگر کوئی بھی ابتلا میں ہے.. خطرے میں ہے تو ہر کوئی سب
کام کاج ترک کر کے اس کی مدد کو پہنچتا ہے.. امدادِ باہمی کا یہ اصول یہاں رائج نہ ہو تو ان
علاقوں میں زندگی ٹھہر جائے...

جیپ ابھی تک پھنسی ہوئی تھی.. دوسرے کنارے پر مسافر منتظر تھے.. ا
ان میں چھوٹے چھوٹے بچے اور خواتین بھی تھیں..

شتونگ کے منظر کو دیکھنے سے ایک سرخوشی کی لہر بدن میں کھنکتی جاتی تھی
یہ خوبصورت تھا.. اس کا وسیع منظر ایسا تھا کہ صرف ایک نشہ کرنے والے شخص کے
تخیل میں ہی آ سکتا ہے.. کیونکہ اس میں ایک عجیب سی فینٹسی تھی.. حقیقت سے بہت
دور کوئی مقام تھا جہاں صرف ایک بھٹکا ہوا ذہن ہی جا سکتا تھا... ندیاں تھیں.. ہریاول
کے ٹیلے اور گھاس کے میدان تھے اور برفیلے منظروں کی سفیدی کا سرد اثر ہواؤں میں تھا
جو بدن میں سرایت کر کے بندے کو مجذوب کرتا تھا.. اور ایک بڑی تنہائی تھی،
اکلاپے اور دور افتادگی کا ایک ایسا ڈنک تھا جو بدن میں ایک زہریلی مستی کی مہک بھرتا تھا

میں نے دیوسائی کاٹج سے ذرا ہٹ کر کچھ دیر کے لیے ایک ایسے "پاٹی پیلس"
میں بھی قیام کیا جو ایک گھاس میں ڈوبتی سفید ندی کے کنارے واقع تھا..

میں وہاں سے واپس آیا تو خالد کہنے لگا "سر جی ہم ادھر شتونگ میں پورے
دن گزار چکے ہیں لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ.. ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی بھرا نہیں..

تو ابھی جانے کو جی نہیں چاہتا.. تو سر جی ادھر ہی ٹھہرتے ہیں.. ادھر دیسی انڈوں کا
آملیٹ ملتا ہے.. مچھلیاں نہ سہی ان کی پونچھیں اور سر ملتے ہیں.. چائے ملتی ہے اور تانبے
رنگ کی گھاس اور ندیاں ملتی ہیں.. سر جی آج سویرے جب میں اس ندی کے کنارے پر
دانتوں کو برش کر رہا تھا تو میں نے اپنے آپ سے کہا، خالد ندیم تجھ پر لعنت ہے کہ اب
تک ایک 7x7 فٹ کے باتھ روم میں قید ہو کر برش کرتا رہا ہے... برش کرنا ہے تو
شتونگ میں کر.. تو ابھی ادھر ٹھہرتے ہیں.. مچھلیوں کی دُمیں کھاتے ہیں اور برش
کرتے ہیں اور یہیں سے واپس سکردو چلے جاتے ہیں کہ.. ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل
ابھی بھرا نہیں.."

میں نے بہت غور سے خالد ندیم کو جانچا... کہ اسے کیا ہو گیا ہے.. اور اسے
جو بھی ہو گیا ہے تو کیوں ہو گیا ہے.. صرف ایک ندی کے کنارے برش کرنے کی خاطر
یہ اپنی پوری زندگی کو داؤ پر لگانے کو تیار ہے..

لیکن کم از کم میں تو اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا تھا.. کیونکہ میں بھی تو
کسی برجی لاء کے منظر کے لیے.. کسی جھیل کرومبر کے لیے.. گھاس کی کسی تکون کے
لیے.. ایک ریچھ.. ایک پھول، ایک بادل کے لیے زندگی کو داؤ پر لگا دیتا تھا..

اور پچھتاوا صرف یہ تھا کہ صرف ایک زندگی تھی اور اسے سانسوں کی شطرنج پر
کہاں کہاں داؤ پر لگایا جا سکتا تھا؟

بشام میں... برسین موٹل کی بچھی بے شکن چادروں کو دیکھتے شکنوں کے
خیال میں.. فلارنس اور سویڈن میں.. ماسکو کے متروک شدہ مارکسزم کی رات میں..
چنبہ ہاؤس کی کولونیل کھڑکیوں سے پرے لاہور کی بادلوں اور ہواؤں میں غرق ہوتی
رات میں... اندھیری سیڑھیوں میں ماچس کی ایک تیلی کے جل اٹھنے کے لمحے میں...
خانہ بدوش آنکھوں تلے گردن کی سفیدی میں.. اس ایک زندگی کو کہاں کہاں داؤ پر لگایا
جا سکتا تھا.. یا داؤ تو لگ چکا اور کسی کو خبر نہیں کہ ان میں سے کہاں..

اوراب شتونگ میں..

اس ایک زندگی میں... ہم جہاں بھی داؤ لگاتے تو ہر صورت مات ہوتی..

چیک میٹ..

شتونگ... چیک میٹ..

شاہ گوری... چیک میٹ..

”اور تب ہم پر دیو سائی کا طلسم حاوی ہوا“

ہم بُوٹ اتار کر... پائینچے چڑھا کر سرد برف پانیوں میں اترے اور ندی کے پار گئے..

شتونگ چھوڑا اور ایک نہیں.. دو ندیوں کے پار گئے..

ان ندیوں کے پانی ان میں قدم رکھنے سے تیز ہوتے تھے.... لیکن ورگوتھ کی ندیوں کی مانند بے دید اور بے لحاظ نہ تھے..

اگرچہ بہت سرد تھے.. تازہ برفوں کے پگھلاؤ تھے لیکن گہرے نہ تھے.. تیز اتنے نہ تھے کہ بہالے جائیں.. ویری نہ تھے.. جان کے دشمن ہرگز نہ تھے..

وہ جیپ جو آج سویرے سکردو سے اوپر آکر.. دیو سائی ٹاپ پر پہنچ کر.. میدانوں میں دوڑتی، شتونگ کی ندیوں میں چھینٹے اڑاتی لاپروائی سے گزر جانا چاہتی تھی... ابھی تک ندی کے درمیان میں اطمینان سے پانیوں کی روانی میں سکون سے بسیرا کرتی تھی.. اس کے مسافر جا چکے تھے.. اور وہ جان چکی تھی کہ میں ان پانیوں کی گرفت سے آج تو نہیں نکل سکتی..

ہم دو ندیوں کے پار گئے..

کوہ نوردی میں.. کسی ایک متعین راستے پر چلنا.. ایک پگڈنڈی یا ایک روڈ پر چلنا انتہائی شرمناک فعل ہے.... کوہ نورد ہمیشہ اپنے راستے خود بناتے ہیں.. اور اس

اصول سے انحراف کرنا ڈوب مرنے کے مترادف ہے..

اور انحراف کرنے کی سزا بہت کڑی ہوتی ہے... چاہے یہ عیسائیت میں ہو یا اسلام میں... جلا دیا جاتا ہے یا قتل کر دیا جاتا ہے..

لیکن.. ہم کوہ نورد اپنے مذہب کے خود ہی بانی تھے... ہم نے اجتہاد کیا.. مجبوری کا اعتراف کیا اور ایک باقاعدہ راستے پر چلنے لگے.. دیوسائی روڈ پر سفر کرنے لگے..

یہ ایسی روڈ تو نہ تھی جس پر ٹریفک رواں تھی..

یہ دیوسائی کے کنوارے بدن پر ایک گھاؤ ایک بدنمائی تھی.. اور ہم سب.. اس پر قدرے شرمندہ.. سر جھکائے چلنے لگے..

اور تب ہم پر دیوسائی کا طلسم حاوی ہوا...

ایک منظر کھلا..

ایک میدان ہے.. اونچے نیچے ٹیلوں کا جو تانبے رنگ کی گھاس سے ڈھکا ہوا ہے، وہاں تک جہاں تک نظر جاتی ہے.. یہ نیم سنہری گھاس ایسے سرسراتی ہے جیسے تیز ہواؤں کی زد میں آئے ہوئے ببر شیر کے بال سرسراتے ہیں... ایسے جیسے اسی تیز ہوا میں ہمارے بازوؤں پر جو بال تھے اور میرے نیم سفید تھے، وہ اس ہوا میں ریت کے ذروں کی طرح جو ذرے بادِ سموم کی زد میں آتے ہیں، ان کی طرح سرسراتے تھے.. ان گھاس بھرے میدانوں کا کوئی انت نہ تھا.. کوئی اخیر نہ تھا اور جہاں شائد اخیر تھا، وہاں ہلکی برفانی شکلوں والے پہاڑ تھے اور گھاس کے اس بے انت پھیلاؤ میں دیوسائی روڈ سے ذرا نیچے.. ذرا گہرائی میں ایک دریا بہتا تھا.. اس بھوری لینڈ سکیپ میں بل کھاتا.. لہریئے لیتا.. مخمور سا چلتا تھا.. کبھی ادھر کبھی یکدم ادھر... کہیں سبز گھاس کے جزیروں میں بٹ جاتا.. پھر اپنے آپ کو واپس لاتا، جمع کرتا اور ایک ہو جاتا.. یہ دریا اس لیے نہیں بہتا تھا کہ اسے بہنا تھا.. اس کی ڈیوٹی لگی تھی بلکہ اپنی من مرضی سے مزے کرتا من کی موج میں بہتا تھا..

تین سفید پرندے اس دریا کی سفیدی کو حسد سے دیکھتے، ایک خاص بلندی پر اپنے پَر ہلاتے رکے ہوئے تھے.. چونچیں نیچے کیے پَر پھڑپھڑاتے ایک ہی مقام پر قائم نیچے تکتے جاتے تھے.. پھر ان میں سے ایک پرندہ شڑاپ سے نیچے گرا.. دریا کی سفیدی میں نقب لگا کر پانی کے اندر گیا اور پھر باہر آ کر اوپر اٹھتا اپنے ساتھیوں سے آملا... اور تینوں پرندے پھر سے کسی خیال میں ڈوب کر ایک ہی مقام پر پھڑپھڑانے لگے.. دریا کنارے ایک بڑے پتھر پر ایک اور پرندہ جو سیاہ رنگ کا تھا، اوپر ان تین سفید پرندوں کو دیکھتا تھا.. اس دریا سے پرے ایک طویل فاصلے پر ملک لاء کی وادی کی دھندلائی ہوئی تصویر تھی جس میں سے ہم کل شام نکلے تھے اور دیوسائی میں گم ہوئے تھے..

لیکن آج کوئی تھکن نہ تھی، کوئی آزار، کوئی خوف نہ تھا.. دن کی روشنی تھی، دیوسائی روڈ تھی تو ہم بھٹک بھی نہیں سکتے تھے.. قدرے شرمندہ چلتے تھے کہ کوہ نوردوں کو رستوں پر چلنا زیب نہیں دیتا لیکن سکون کے مزے میں چلتے تھے..

اگرچہ دیوسائی ٹاپ سے شروع ہو کر شتونگ تک اور پھر یہاں تک ہمارے آس پاس جو لینڈ سکیپ تھی، اس کا ڈھنگ ایک ہی تھا.. انداز ایک تھا لیکن اس کے باوجود اس میں یکسانیت نہ تھی.. ہم اپنے خیالوں میں گم.. اپنے گھروں اور بچوں کے خیالوں میں گم جب واپس دیوسائی آتے تو وہ ہر بار.. ایک مختلف میدان ہوتا..

ہم چلتے جا رہے تھے کہ بکریاں آگئیں.. لمبے بالوں والی.. اتنے لمبے بال کہ وہ گھاس کو سونگھتے تھے.. براؤن رنگ کی دودھ سفید بکریاں.. کڑی کمان سینگوں... ہلال نما، تلوار تیز اور پیچدار سینگوں والی بکریاں.. اور بے شمار بکریاں.. اور ان کے ہمراہ ان کے وارث بکروال تھے..

یہ وہی بکروال تھے جو موسم کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے.. جب اپنے راستے میں برف بچھی دیکھتے تھے تو قیام کرتے تھے.. پگھلتی تھی تو آگے سفر کرتے تھے اور پھر صدپارہ سے نیچے سکردو میں اترتے تھے.. اور تب خلق خدا کو علم ہوتا تھا کہ

دیوسائی کی برفیں پگھل گئی ہیں اور راستے کھل گئے ہیں..

یہ وہی بکّر وال تھے جو سینکڑوں برسوں سے اس روٹ پر سفر کرتے آئے تھے..اور نسل در نسل سفر کرتے آئے تھے..دیوسائی لداخ کا حصہ ہو یا مغل سلطنت کا، انگریز ہو یا پاکستانی..وہ ان کا عارضی وطن تھا..وہ اس کے راستوں پر مرتے بھی تھے اور زندہ بھی ہوتے تھے..

حیرت انگیز طور پر یہ بکّر وال خالص پنجابی تھے..

"تارڑ صاحب.." ایک سیاہ جیکٹ میں ملبوس توانا بکّر وال میرے پاس آبیٹھا کہ ہم سب وہاں ستانے کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ "ہمارا سفر جہلم سے شروع ہوتا ہے..جب ادھر گھاس خشک ہو جاتی ہے اور موسم گرما ہریاول کو جلا دیتا ہے تو ہم ادھر سے اپنے مال مویشی، گھوڑے اور بکریاں ہانکتے ہیں اور صدیوں پرانے راستوں پر سفر کرنے لگتے ہیں..گھاس اور چراگاہوں کے لیے..جہلم سے ہم لوگ مظفر آباد آتے ہیں..اور وہاں سے کیل..پھر منی مرگ پہنچتے ہیں.."

"منی مرگ..؟" میں چونک گیا۔ "ذرا ٹھہر جاؤ" میں نے بکّر وال سے گزارش کی۔ "ہم بھی دیوسائی سے اتر کر منی مرگ جا رہے ہیں..."

"ادھر کیوں جا رہے ہیں؟"

"کیوں..کا جواب تو کسی کوہ نورد کے پاس نہیں ہوتا..بس ہم منی مرگ جا رہے ہیں۔"

لیکن کم از کم اس "کیوں" کا جواب میرے پاس موجود تھا..

اسلام آباد ٹیلی ویژن سے میں "کھیل اور کھلاڑیوں" کے بارے میں ایک خصوصی شو کی میزبانی کر رہا تھا..شرکاء میں سکواش کے جان شیر خان، گالف کے تیمور، کوہ پیمائی کے کرنل شیر خان کے علاوہ کرکٹ کے عمران خان بھی شامل تھے..خان صاحب اب تو خیر سے سیاستدان ہو گئے ہیں لیکن ان زمانوں میں ان کے انداز نہایت متکبرانہ

ہوا کرتے تھے اور ہمیشہ ایک ناراض سی بُوتھی بنائے بیٹھے رہتے تھے..میک اپ کے دوران انہوں نے ہنزہ کے کرنل شیر خان سے پوچھا...میں اس برس بھی شمال کے کسی غیر معروف علاقے میں جانا چاہتا ہوں، کہاں جاؤں؟...اس پر شیر خان کہنے لگے، ہم سے کیا پوچھتے ہیں، تارڑ صاحب سے پوچھئے۔ یہ ہمارے علاقے کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں..اب خان صاحب اسی طرح بُوتھی سجائے بیٹھے رہے، نہ ہم سے پوچھا، نہ ہم نے لب کھولے...شائد ان کا خیال تھا کہ میں فوراً طوطا ہو جاؤں گا اور فر فر شمال کا سبق سنا دوں گا...انہوں نے پھر شیر خان سے یہی سوال کیا اور ادھر سے پھر وہی جواب آیا اور مجبوراً خان صاحب نے مجھ سے رجوع کیا...تب میں نے اپنے چند پسندیدہ مقامات کا ذکر کیا..لیکن خان صاحب کہنے لگے۔ "میں یہ پیدل وغیرہ نہیں چل سکتا..مجھے تو کوئی ایسی جگہ بتائیے جہاں جیپ جا سکتی ہو۔" تب میں نے وادئ رُوپل اور نانگا پربت کے گاؤں ترشنگ کی سفارش کی کہ وہاں تک جیپ جا سکتی ہے..کچھ برس بعد گلگت میں مجھے ترشنگ کا ایک رہنے والا ملا اور اس نے بڑے فخر سے کہا کہ "جناب آپ تو سب سے پہلے ہمارے علاقے میں آئے تھے لیکن ہمارے ہاں عمران خان بھی آئے تھے.." میں نے فوراً خان صاحب کی شہرت کو کیش کرنے کے لیے سینہ پھلا کر کہا۔ "ہاں..میں نے ہی انہیں بھیجا تھا.." اس پر وہ ترشنگی ذرا روٹھ سا گیا اور کہنے لگا۔ "اچھا تو یہ آپ تھے جنہوں نے عمران خان کو ہمارے ہاں بھیجا تھا...جناب ہمارے لیے یہ ایک اعزاز تھا..لیکن ان کی آمد سے ہمارے مقامی اخلاقیات کا توازن ڈانواں ڈول ہو گیا تھا..ان کے ہمراہ جو خواتین تھیں وہ...تو کبھی نیکریں پہن کر...اور کبھی..شائد نہ پہن کر ترشنگ کے کھیتوں میں اور نانگا پربت کے دامن میں گھومتی تھیں جناب عالی.."

پھر کچھ عرصہ بعد یوں ہوا کہ خان صاحب نے مجھے اپنی زمان پارک کی رہائش گاہ میں رات کے کھانے پر مدعو کیا...چونکہ اب وہ ایک سیاستدان تھے، اس لیے ایک مختلف عمران خان ہو چکے تھے..کہنے لگے۔ "ترشنگ واقعی پاکستان کا خوبصورت ترین گاؤں تھا.."

لیکن میں وہاں سے منی مرگ بھی گیا تھا.. اور تارڑ صاحب وہاں ایسی ندیاں ہیں جن
کے پانی کرسٹل کلیئر ہیں.. اتنے شفاف ہیں کہ ان کی تہہ میں جو پتھر ہیں، وہ نظر آتے
ہیں اور پانی نظر نہیں آتا.. اور سیاہ جنگل ہیں اور رنگ ہیں..''

اسی لیے جہاں میں نے دیوسائی کے معصوم ٹریک میں بُرجی لاء کو شامل
کر کے اسے متشرع کیا تھا وہاں میں نے اس کے اختتام پر منی مرگ کی وادی کو بھی
الوداعی منظر کے طور پر رکھ لیا تھا..

چنانچہ دیوسائی ٹریک کے آخر میں ہم نے منی مرگ کی وادی میں اترنا تھا..
اسی لیے سکردو میں ٹرانسپورٹ کے انچارج نجف بھائی کو یہ کہہ دیا گیا تھا کہ ہم اتنے
دنوں میں یہ ٹریک مکمل کریں گے اور منی مرگ پہنچیں گے۔ اس لیے فلاں تاریخ کو
وہاں آپ کی روانہ کی ہوئی ایک جیپ موجود ہونی چاہیے جو ہم تھکے ہارے کوہ نوردوں
کو واپس سکردو لے آئے.. اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ فلاں تاریخ کو جیپ منی مرگ میں
آپ کے لیے موجود ہوگی.. اگرچہ ہمارے لیے نجف کی محبت بہت تھی لیکن جیپ کا
کرایہ بھی بہت تھا..

اسی لیے میں بکروال کے منی مرگ کے حوالے پر چونک گیا تھا..

ادھر خالد ندیم ایک خوش شکل بکری کو چھاپا مار کر اس کے ساتھ ایک گروپ
فوٹو اتروانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ باآں باآں کرتی کسمساتی اس کے شکنجے سے نکلنے
کے لیے زور لگاتی تھی.. بکری کا تجربہ پتہ نہیں کیا تھا کہ وہ خالد کے جپھے کی وجہ سے
شکوک میں مبتلا ہو رہی تھی..

اور انصاری.. ایک سناٹے میں آئی ہوئی ایسی بکری جس کی اُون زمین پر
گھسٹتی تھی اور وہ ایک پیارے ٹیڈی بیئر کی طرح خوشنما تھی... اس کے بڑے بڑے تھن
پسماتا.. ان میں سے دودھ کی تیز دھاریں اپنے انصاری کھلے منہ میں وصول کرتا
دودھ کو حلق سے اتارتا اور قہقہے لگاتا تھا...

''جب آپ ادھر رات کرتے ہیں تو ریچھ کا خطرہ نہیں ہوتا؟'' میں نے
بکروال سے دریافت کیا..

''ادھر ریچھ اتنا نہیں ہوتا جتنا لوگ شور کرتے ہیں.... بہت کم ہوتا ہے..
ہاں ہر سیزن میں دو چار بکریاں تو لے جاتا ہے لیکن انسانوں کے قریب نہیں آتا..
ڈرپوک ریچھ ہے.. اوپر رہتا ہے نیچے روڈ تک نہیں آتا.. البتہ رات کو آجاتا ہے.. آپ
کے پاس اگر کوئی برتن ہے تو ہم آپ کو تازہ دودھ پیش کر سکتے ہیں۔''

میرا تجربہ تھا کہ بکری کے دودھ کے ہر گھونٹ میں بکری ہوتی ہے اور
ہمارے پاس کوئی برتن بھی نہ تھا۔ اس لیے ہم نے بکروال صاحب کا شکریہ ادا کیا.. خالد
ندیم کو اس کی محبوبہ بکری سے الگ کیا اور پھر سے چلنا شروع کر دیا..

آج کی منزل ''بڑاپانی'' تھی..

استاد امام دین گجراتی نے کہا تھا کہ... یہ سڑک... سیدھی جلالپور جٹاں کو جاتی
ہے.. اور ہمارے سامنے جو کچی سڑک تھی، وہ ہم جانتے تھے کہ سیدھی بڑاپانی کو جاتی
ہے.. اور ہم نے چلنا شروع کر دیا..

گھاس کے بھورے میدانوں سے پرے ایک برفیلی چوٹی دکھائی دیتی تھی جو
کبھی بادلوں کا پردہ کر لیتی، روپوش ہو جاتی اور کبھی ظاہر ہو کر دھوپ میں ایک ہیرے
کی طرح چمکنے لگتی..

شاہد جرابوں کے بغیر سفید رنگ کے جوگر پہنے.. ٹخنوں سے اونچی ایک پتلون
پہنے آہستہ آہستہ چلتا جا رہا تھا..

''سر جی.. آپ علاقہ کر کے آئے ہیں؟'' سلمان نے نہایت ادب سے پوچھا..

''کونسا علاقہ؟'' شاہد نے اپنی دبیز عینک اتاری، ٹوپی اتار کر اپنے دو چار بالوں
پر ہاتھ پھیرا اور سلمان کو گھورا.. وہ یقیناً اس بدتمیز موٹو سے بچے کو پسند نہیں کرتا تھا..

''سر جی.. ہمارے ہاں جرابوں کے بغیر سفید جوگر پہننے والے سویرے

سویرے بڑا وسیع علاقہ کر کے.. جھاڑو وغیرہ دے کر واپس آجاتے ہیں۔"

مجھے احساس ہوا کہ ہم نے سلمان کی خوش مزاجی کو ذرا زیادہ ہی ڈھیل دے دی تھی۔ اس لیے میں نے اسے بُری طرح ڈانٹا... مجھے اس کا یہ مذاق پسند نہیں آیا تھا.. اور شاہد کو تو بالکل پسند نہیں آیا تھا..

"مائی لیڈر..." شاہد نے احتجاج کیا۔ "یہ آپ کن ناپختہ ذہنوں کے بدتمیز بچّوں کو ساتھ لے آئے ہیں.. انہیں یہ بھی تمیز نہیں کہ بزرگوں کا احترام کیسے کیا جاتا ہے.."

سلمان ایک فرمانبردار بھالو کی طرح سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ "شاہد صاحب... سر جی آپ میرے سر پر بے شک ایک سو ایک چھتّر لگالیں.. آئی ایم سوری.."

"چھوڑیں جی.. بدتمیزی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے.. ہم معزز وکیل ہیں اور اس نے ہمیں کیا بنا دیا ہے.. کوئی حد ہوتی ہے۔"

"سر جی.. میں مرغا بن جاؤں.. ؟" سلمان فوراً مرغا بننے پر آمادہ ہو گیا لیکن اسے بخش دیا گیا.. اور آئندہ شاہد صاحب کا احترام کرنے کا حکم دیا گیا..

ہم پھر سے رواں ہو گئے..

"لفنگے مارموٹ اور مایا تہذیب کے سونے کے گہنے"

ایک تیز سیٹی سنائی دی...

ایک تیز اور گونجتی ہوئی سیٹی کی آواز.. ہم تک آئی.. دریا کے پار جس پر ایک پرندہ مچھلیوں کی آرزو میں کبھی پانیوں میں ڈبکی لگاتا تھا.. کبھی کسی پتھر پر براجمان ہو کر پانیوں میں سے اپنا رزق تلاش کرتا تھا.. ان کے پار وہاں تک وہ سیٹی کی آواز گئی جہاں ملک لاء کی وادی ایک دھندلے فریب میں گم تھی..

دیوسائی روڈ سے ہٹ کر ذرا نیچے بھوری گھاس کی اونچ نیچ میں مٹی کے ایک تازہ تودے پر اپنے اگلے پاؤں سینے سے لگائے ایک عمر رسیدہ مارموٹ کھڑا تھا اور ہمیں دیکھ کر سیٹیاں بجاتا تھا..

ایک اور مارموٹ اس کے پہلو میں اسی انداز میں دونوں ٹانگوں پر ایستادہ ہاتھ باندھے منتظر تھا کہ میرے تایا حضور ان کوہ نوردوں کو دیکھ کر لُچّوں کی طرح سیٹیاں بجا کر اپنی حسرت پوری کر لیں تو میں اپنی اننگ کا آغاز کروں...

سب لوگ ٹھہر گئے.. انہی قدموں پر رک گئے..

چپکے چپکے کیمرے نکالنے لگے..

دم روک کر انہیں فوکس کرنے لگے..

ان لومڑی جتنے بڑے بڑے خرگوشوں کو... گلہری نما گل گوتھنے جانوروں کو

جنہیں انگریزی میں مارموٹ کہتے ہیں.. بلتی زبان میں "پھیا" اور شینا میں "تروشن" کہہ کر پکارتے ہیں..

وہ ایک عمر رسیدہ مارموٹ بدستور سیٹیاں بجا رہا تھا.. اور اپنی متحرک گردن کو چار چفیرے گھما رہا تھا لیکن نظر ہم پر رکھتا تھا کہ ان کا ردعمل کیا ہے..

کیمرے کی پہلی کلک ہوئی تو اس نے ذرا چونک کر اپنی سیٹی منقطع کر دی..

یہ گھنے بالوں اور نرم کھال کا خرگوش ایسا تھا کہ اسے آغوش میں لے کر بھینچنے کو جی چاہتا تھا... جیسے سمور کی کھال کے کوٹ میں ملبوس کرسمس کی شام میں برفباری کے دوران ایک لڑکی کو گلے لگانے کو جی چاہتا ہے..

میں نے اس انتہائی خوش مزاج جانور کو سب سے پہلی بار درّہ خنجراب کے راستے پر دیکھا تھا... وہ سڑک کے عین درمیان میں بلا جھجک ایک جوگی کی طرح ہاتھ باندھے کھڑا آپ کو دیکھتا تھا اور اپنی مونچھیں ہلاتا سیٹی بجاتا تھا.. اور میرے بچوں نے ضد کی تھی کہ ابو پلیز اسے پکڑ لیں اور گھر لے چلیں.. یہ ہمارے چھوٹے سے لان میں کتنا کیوٹ لگے گا.. میں نے اس جانور کو بہت سی بلندیوں پر دیکھا تھا اور سنا تھا.. مارموٹ بلندیوں کی خوشنمائی اور زندگی ہے.. وادیٔ رُوپل میں... سوئیج میں... جھیل کرومبر کے کناروں پر.. اس نے مجھے دیکھ کر پُر مسرت سیٹیاں بجائی تھیں..

شائد یہ ایک ہی مارموٹ تھا جو میرے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا..

جہاں میں جاتا تھا وہاں میرے ساتھ پھدکتا جاتا تھا..

اور یہ مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا.. کہ یہ تو پھر آ گیا ہے.. اور سیٹیاں بجا کر میرا استقبال کرتا تھا، مجھے خوش آمدید کہتا تھا..

دیوسائی پر نظر آنے والا وہ پہلا چہرہ تھا جسے دیکھ کر میں خوش ہوا.. وہ میرا ساتھی تھا.. اگرچہ پچھلی شب شتونگ کی غار میں... میں ایک ہمالیائی ریچھ تھا.. ایک سنو ٹراؤٹ.. گولڈن ایگل اور سنو ٹائیگر تھا لیکن وہ تو پچھلے زمانوں کے قصے تھے.. رات

گئی بات گئی.. اور اب میں ایک مارموٹ تھا.. دیوسائی کے گھاس بھرے خنک میدانوں میں اپنے بل کے اوپر مٹی کے ایک ڈھیر پر دونوں پاؤں سینے سے لگائے ایک منی اچر بھالو کی طرح سیٹیاں بجاتا تھا..

تو یہ میں تھا..

اور میرے ساتھی مجھے ہی دیکھتے تھے.. میں بھی اپنے آپ کو دیکھتا تھا اور وہ میری تصویریں اتارتے تھے.. کلک... کلک...

"سر مارموٹ کا کلوز اپ اتار لیا.." انصاری نے اپنے مارموٹ نما دانت عیاں کر کے نہایت پر تشدد قہقہہ لگایا.. اس قہقہے کی گونج نے جہاں پورے دیوسائی کو بری طرح ڈسٹرب کیا وہاں مارموٹ کو بھی اتنا ہراساں کیا کہ اپنے بھتیجے کے ہمراہ فوری طور پر اپنے بل میں روپوش ہو گیا.. اور دیوسائی کی لینڈ سکیپ ویران ہو گئی.. اب وہاں بھوری گھاس سرسراتی تھی، ندیاں تھیں، کوئی ایک پرندہ تھا جو ایک پتھر پر بیٹھا پانیوں میں اپنے رزق کی خاطر ڈبکی لگانے کے لیے پَر تولتا تھا..

ہم چلتے چلتے تھک گئے تھے..

زیادہ نہیں چلے تھے لیکن چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر چلنے سے ہمارے سانس بے ربط ہوتے تھے اور جسم و جاں سے خالی ہوتے تھے.. اور ہم تھک گئے تھے۔ اس لیے ہم دیوسائی روڈ کے کنارے اسی مقام پر جہاں ایک عمر رسیدہ مارموٹ نے ہمیں دیکھ کر غُل کیا تھا، وہاں اپنے کندھے سامان سے خالی کر کے ستانے کے لیے بیٹھ گئے.. اپنی واکنگ سٹکس، بھوری گھاس میں نیزوں کی طرح نصب کر دیں اور گھاس پر لیٹ گئے..

آس پاس سنہری گھاس تھی.. سرد ہوا تھی اور بہت دور برف کے آثار تھے..

ہم گھاس پر لیٹ گئے اور صاف چمکیلی دھوپ میں وہ گھاس ایسے سنہری ہوتی تھی جیسے جنوبی امریکہ کی شاندار مایا تہذیب کے گہنے.. قدیم سونے کے زیور!

جیسے میں نے ایک نادر اشیاء کے شوقین شخص کے پاس.. ڈھائی ہزار بر
قدیم خالص سونے کا ایک جام دیکھا تھا... اس نے اس نادر عجوبے کو.. اپنی تصویروں
پرانے گندھارا مجسّموں.. اور دو ہزار برس قبل کے برتنوں میں ایک انتہائی غلیظ کپڑے
میں لپیٹ کر ایک کونے میں پھینکا ہوا تھا.. جس کونے میں ردی کی ٹوکری تھی.. تا
کسی کو بھی شک نہ ہو... کہ تہران کے میوزیم میں اسی قسم کا جو ایک جام شیشے کے
شوکیس میں سجا ہے، یہ قدیم جام جو ایک غلیظ کپڑے میں لپٹا ہے، اس سے خوش نمائی میں
کہیں برتر ہے.. اس جام کی ڈھائی ہزار سال پرانی سونا رنگت بس اسی گھاس جیسی تھی
میری نظروں کے سامنے افق تک پھیلی ہوئی تھی.. صناعی کے اس شاہکار پر عجیب نقش
تھے اور شیروں کے چار مختصر لیکن مکمل بناوٹ کے سر اس کے پہلوؤں میں سے با
آتے تھے.. میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ یہ پیالہ کیا کسی آرائش کے لیے استعما
ہوتا تھا. "نہیں.." انہوں نے بتایا۔ "ایران کے ساسانی حکمران اس میں انگوروں کی
شراب پیتے تھے۔"

یعنی سونے کی حسین ڈلکتی ہوئی ڈلی ڈھائی ہزار برس سے پیاسی تھی..

کہیں بلوچستان کے صحراؤں میں.. ایرانی علاقوں کے نواح میں یہ کسی کھنڈر میں
مدفون رہی اور پھر کسی بلوچ یا پٹھان کے نصیب میں آئی اور پھر یہاں تھی، اسلام آ
میں.. میرا بہت جی چاہا کہ میں اس جام کی پیاس دور کروں، انگور کی شراب نہ سہی سا
پانی کے دو گھونٹ اس میں سے بھرنا بھی ایک عجیب احساس ہوگا لیکن میرا تمام تر تاریخ
اور دیومالائی رومان ان صاحب نے یہ کہہ کر غارت کر دیا کہ تارڑ صاحب میں آپ کی
یہ خواہش پوری کیئے دیتا ہوں لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ فلم ایکٹرس ریما بھی اس میں
سے کچھ پیئے اور اس کے ہونٹ اس جام کو چھوئیں...

یہ دیوسائی... یہ مایا تہذیب کا طلائی زیور.. ساسانی عہد کا سونے کا جام جس کا
رنگ بھی قدیم ہو چکا تھا اور اس میں درکوت کے خزاں رسیدہ جنگل کے پتوں ایسی گہرائی

سرخی تھی.. یہ میرے سامنے تھا.. پیاسا تھا.. اور آج صرف میرے لیے تھا.. اور میں اس
میں سے اپنی آوارہ روح اور دربدری کی شراب پیتا تھا..

دیوسائی... اے دیوسائی..

میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ ایک خانہ بدوش کے خیمے کے گرد جب گھاس بلند
ہونے لگتی ہے تو وہ کوچ کر جاتا ہے.. میں اگر خیمے کے گرد بلند ہوتی گھاس کی پروانہ کرتا
تو میں بھی کسی ایک مقام.. ایک بستی.. کسی ایک وادی میں آباد ہو چکا ہوتا.. اگر میں
بے آباد اور بے سہارا تھا عمر کے اس حصے میں بھی تو صرف اس لیے کہ میں نے ہمیشہ
کُوچ کیا... اور میری نشانی اس گھاس پر ایک سفید نشان کی صورت چند روز تک دکھائی
دیتی رہتی جس پر میرا خیمہ نصب ہوا تھا..

یہ درست ہے کہ روس میں بھی گھاس کے میدان ہیں جو ان کی نفسیات
اور ادب میں نمایاں ہوتے ہیں اور انہیں "سٹیپے" کہا جاتا ہے.. یہ کرغزیہ کے
گھڑسواروں کے تلے بھی پھیلے ہیں.. ازبکستان میں ان میں خوش گاؤ چرتے ہیں... کاشغر
کے نواح میں صحرائے گوبی کی قربت میں بھی ایسی بلند چراگاہیں ہیں جن میں خانہ بدوشوں
کے "یُرت" خیمے ابھرتے ہیں.. لیکن یہ سب شاید دیوسائی کے برابر میں نہیں آتے..
کیونکہ وہ اتنی بلندی پر واقع نہیں..

اور نہ ان میں مایا زیوروں اور ساسانی جام کی قدیم چمک دمک ہے... اور اگر ہے
بھی اور میں نے نہیں دیکھی تو مجھے ان سے کیا لینا دینا..

یہ میری گھاس تھی... فیئری میڈو کی سبز ٹھنڈک والی گھاس.. اردوکس کی
بلندیوں پر وہ گھاس جو کوہ پیماؤں کی اندھی ہوتی آنکھوں میں سبز بینائی بھرتی ہے.. گھاس
جو ایک سفید تکون پر کھردری ہو کر بدن کو محبت سے بھرتی ہے.. پامیر کے سائے میں
میرے پورٹر قد آدم گھاس میں سے کبھی ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی اس میں گم ہوتے
ہیں... ایسی گھاس اور کہاں تھی؟.. کہیں نہیں تھی.. اور یہ میری گھاس تھی..

اور دیوسائی کی گھاس!

ہم دیر تک اس گھاس میں اونگھتے رہے.. دور کہیں ایک اور مارموٹ تھا جس کی سیٹی کی آواز گھاس میں سے سفر کرتی ہم تک آئی تو ہم آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے..

دھوپ کی تپش کم ہو چکی تھی..

ہم پھر سے چلنے لگے..

اگرچہ یہ ایک روڈ تھی لیکن صبح سے دو تین جیپوں کے علاوہ ادھر سے کوئی نہیں گزرا تھا اور اگر کوئی شاہراہ صرف چند لمحوں کے لیے بھی ٹریفک سے خالی ہو جائے تو لگتا ہے کہ یہ ازل سے ویران ہے.. دیوسائی روڈ بھی جیسے ازل سے ویران تھی اور صرف ہم اس پر چلتے جاتے تھے..

نہ ہم میں تھکن تھی اور نہ ہم مرجھائے ہوئے تھے.. چلتے جاتے تھے..

اور ہم قدرت کے اس عظیم کھیل میں جو کہ دیوسائی تھا.. چلتے جاتے تھے..

ایک بے انت تنہائی میں...

ایک ایسی تنہائی میں جس میں بھوری گھاس، ندیاں اور دور برف سے ڈھکی چوٹیاں تھیں اور ہم تھے.. اور چلتے جاتے تھے..

چنانچہ ہم اس کیفیت میں تھے کہ خود سونا ہو رہے تھے.. ایک مایا زیور، ایک ساسانی جام ہو رہے تھے اور بقیہ نسل انسانی کو حقیر سمجھ رہے تھے کہ سامنے سے اسی نسل انسانی کے دو نمائندے دیوسائی روڈ پر اپنی جانب آتے دیکھ لیے اور ہمیں سخت صدمہ پہنچا.. کہ یہ کمبخت ادھر کیا کر رہے ہیں، دیوسائی تو ہماری راجدھانی ہے..

ایک غیر ملکی کوہ نورد تھا اور اس کے پیچھے اس کا بوجھ اٹھائے ہوئے ایک پورٹر اور گائڈ..

یہ مقامی پورٹر پڑھا لکھا لگتا تھا اس لیے ہمارے قریب ہوا تو اس کی انا نے اسے

چوکنا کر دیا اور وہ فوری طور پر ایک نہایت معزز شکل بنا کر ہمارے دیسی مہاندروں پر ایک چشم حقارت ڈال کر گھاس پر بوجھ رکھ کر خلاؤں میں گھورنے لگا.. کہ وہ جانتا تھا کہ ہم اس گورے سے بات کیے بغیر آگے نہیں جائیں گے اور یہ ان علاقوں کا دستور بھی تھا..

"ہاؤ فار بگ واٹر..." شاہد نے ذرا ٹھہر ٹھہر کے گورے کو مخاطب کیا..

گورا بالکل کورا ہو گیا "بیگ یور پارڈن.."

"میرا خیال ہے انگریز نہیں.. اس لیے انگریزی نہیں سمجھ رہا..." شاہد نے بقیہ ٹیم کی جانب نہایت معتبر انداز میں نگاہ کی اور پھر کھانس کر گورے سے کہا "وچ کنٹری یو کم..."

گورا پھر بہک گیا کیونکہ شاہد کی انگریزی کا انداز.. اندازِ دگر تھا.. بلکہ دگرگوں تھا.. اور گورا مزید بہک گیا.. "بیگ یور پارڈن..." اس نے پھر کہا..

اس کے بعد مشترکہ کوشش کی گئی.. اور پوچھا یہی گیا کہ صاحب لوگو آپ اُدھر سے آ رہے ہو تو یہ مقام بڑا پانی جہاں ہمیں آج پہنچنا ہے یہاں سے کتنا دور ہے اور کیا شام تک ہم وہاں پہنچ جائیں گے..

"بڑا پانی..." گورے نے سر ہلایا اور ہمیں اطلاع دی کہ.. یہاں سے صرف دس منٹ کے فاصلے پر ہے... یہ راستہ جہاں سے اونچا ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے تو وہاں پہنچو گے تو نیچے بڑا پانی دکھائی دینے لگے گا..

ہم خوش بھی ہوئے اور تھوڑے سے مایوس بھی کہ.. اتنی جلدی اور آسانی سے منزل پر پہنچ گئے ہیں..

"آپ آج کدھر سے آ رہے ہیں؟"

"شیوسر جھیل سے..."

شیوسر جھیل ہمارے منصوبوں میں تھی.. بڑا پانی سے ہم نے دیوسائی عبور کر کے منی مرگ پہنچنا تھا اور وہاں سے اس جیپ میں سوار ہو کر.. جو نجف نے سکردو سے

روانہ کرنی تھی ہم نے درہ برزل کے راستے چلم چو کی جانا تھا.. پھر واپس دیوسائی پر چڑھنا تھا اور سکردو لوٹنے سے پیشتر شیوسر جھیل کے کنارے ایک رات بسر کرنی تھی..

یہ جھیل ہمارے منصوبوں میں تھی..

ہم نے ایک بار پھر مشترکہ طور پر ہی گورے کا شکریہ ادا کیا اور اس میں سب سے بلند شاہد کا "تھینک یو ویری مچ" تھا... اور چلنے لگے..

تو بڑاپانی اس مقام سے صرف دس منٹ کی مسافت پر تھا..

ہم تو کمر بستہ تھے کہ شاید کل کی طرح پھر دیوسائی میں رات ہو جائے اور پھر کہیں جا کر بڑاپانی دکھائی دے اور وہ صرف دس منٹ کے بعد آیا چاہتا تھا..

"اللہ تعالیٰ کے نام خط "تھینک یُو سر فار بِگ واٹرز"

اور وہ آگیا..

بڑا پانی آگیا..

اس چڑھائی پر بلند ہوئے تو نیلے رنگ کا ایک بورڈ روڈ کنارے ایستادہ دکھائی دیا..

"دیوسائی نیشنل پارک"

ممنوعہ علاقہ

یہاں ریچھوں پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ اس علاقے میں داخل ہونے کے لیے ضلعی انتظامیہ یا جنگلی حیات انتظامیہ سکردو / استور سے رابطہ کریں۔

نوٹ: پارک میں ہر قسم کا اسلحہ یا بارود لے جانا یا استعمال کرنا سختی سے ممنوع ہے..

دیوسائی نیشنل پارک کے بورڈ پر ایک اداس سے ریچھ کی شبیہہ تھی..

اور ہمارے نیچے.. بہت نیچے جہاں روڈ یکدم اترتی تھی.. بڑاپانی تھا..

دی بگ واٹرز! اس کا منظر ہمارے سامنے بچھا ہوا تھا..

کتابِ دیوسائی کا سب سے اہم اور دلفریب ورق ہمارے قدموں میں کھلا ہوا تھا..
بڑا پانی... اس لیے کہ پورے دیوسائی میں اس سے بڑے پانی اور کہیں نہیں
ہیں.. ایک روح کو عرش تک لے جانے والی دلکش ندی.. دھیمی اور نیلاہٹ کے تیز بہاؤ
میں.. ایک چھوٹا سا دریا.. ایک بڑا پانی..

اور اس پر لکڑی کا وہ جھولتا ہوا عارضی پل جو شہتیروں کو جوڑ جوڑ کر بنایا گیا تھا..
اس بلندی سے ایک لکیر کی صورت نظر آتا تھا.. پل صراط لگتا تھا.. لیکن اس پر سے جیپیں
گزرتی تھیں.. یہ وہی پل تھا جو موسم کے علاوہ میرے اور دیوسائی کے درمیان کئی بار حائل
ہوا.. اپنے نہ ہونے کے باعث.. سردیوں میں برفباری کے بوجھ سے یہ دبتا ہے اور ٹوٹ
جاتا ہے.. اور اس کی لکڑی چلم چوکی اور صدپارہ کے گھروں میں اسی سردی سے بچاؤ کے
لیے جلتی ہے.. جونہی موسم کھلتے ہیں تو اسے دوبارہ تعمیر کر لیا جاتا ہے.. اور جب یہ نہیں
ہوتا تو دیوسائی دو حصوں میں بٹ جاتا ہے... استوار والے ادھر اور سکردو والے ادھر..
چنانچہ میں آتا تھا تو کبھی برفیں نہیں پگھلتی تھیں اور کبھی بڑے پانی کا پل ٹوٹا
ہوا ہوتا تھا اور کبھی تعمیر کے مراحل میں ہوتا تھا..

وہی پُل اب میرے سامنے تھا.. بگ واٹرز برج...

گھاس کے میدانوں میں بڑی پانیوں پر جھولتا دکھائی دیتا تھا.. اور میدان وہاں
تک جا رہے تھے جہاں برف کے انبار چوٹیوں پر دم روکے بیٹھے تھے اور ان پر بادل
تھے.. اور کوئی ایک بادل تھا جس کے لیے میں یہاں تک آیا تھا..

ٹورازم کے رنگین جہازی سائز پوسٹر میں دیوسائی کی جو سب سے معروف
تصویر ہے.. ایک پل، ایک ندی اور ایک جیپ.. تو وہ اسی بڑے پانی کی ہے..

ہم نیچے اترتے گئے..

اس بڑے پانی کی قربت میں ہوتے گئے.. اس کی خلوت میں مخل ہو کر اس
کے پردے اٹھاتے بے نقاب کرتے گئے.. اور نقاب اندر نقاب اس کا حسن سو چند ہوتا

جاتا ہے.. ہمارا خیال تھا کہ جوں جوں ہم نیچے اتریں گے، قریب ہوں گے تو بڑے
پانیوں کا شور بلند ہو کر ہمارے کانوں کو بہرا کر دے گا.. لیکن ہمارے کانوں میں اگر کچھ
اترا تو ایک بے کراں خاموشی... تیز سرد ہوا میں گھاس کی سرسراہٹ.. کچھ سرگوشیاں.. یہ بڑا
پانی اتنے مدھم سروں میں بہتا تھا کہ انہیں صرف وہ شخص سن سکتا تھا جو پانیوں کی موسیقی کا
کن رس رکھتا ہو.. ان کی زبان سے واقف ہو.. ورنہ کچھ سنائی نہ دیتا تھا..

ہم پل تک آئے، اس کے بلند کنارے پر آ کر رک گئے..

دوپہر کی دھوپ تھی اور بڑے پانی کے چوڑے پاٹ میں جتنے بھی پتھر تہہ
میں آرام کرتے تھے وہ سب کے سب گنے جا سکتے تھے.. ان پر بہتے خاصے گہرے پانی ان
کی شکلیں اوجھل نہ کرتے تھے.. ان کا بہاؤ صرف ان پتھروں کو ذرا ہلتے ہوئے دکھاتا تھا
ورنہ ان پر بڑے پانی کا جو سیال شیشہ بہتا تھا انہیں روپوش نہ کرتا تھا بلکہ عیاں کرتا تھا..
دھوپ کا ایک ایسا زاویہ بھی بنتا تھا جہاں سے یہ پانی منجمد برف کا تاثر دیتے تھے.. ایسی
شفاف برف جس کے نیچے پڑے ہوئے سنگریزے اور پتھر صاف دکھائی دے رہے
ہوں.. اگرچہ یہ ایک عام سا منظر تھا۔ ایک ندی، برف پوش پہاڑ، ایک پُل... لیکن یہ
دیوسائی پر تھا اور وہاں کوئی بھی منظر عام نہیں ہو سکتا.. یہ منظر کے بس میں نہیں ہوتا
کہ وہ عام ہو سکے.. نہ ہی عام لوگ وہاں تک پہنچتے ہیں.. شاید اس میں بلندی کی کوئی
سانس روک دینے والی تاثیر تھی جو گھاس کے ہر تنکے کی نوک میں سے پھوٹتی تھی..
پانیوں کو بلند شان دیتی تھی اور اس گھاس بھری برف جھکی تنہائی کو ایک مقام دیتی تھی..
یہ دیوسائی کی بلندی ہی تھی جو اس منظر کو ایک عام منظر سے الگ اور دھاک بٹھا دینے
والا کرتی تھی..

"سر جی.. کمال کی جگہ ہے۔" سلمان نے کہا "عمر کو ادھر ہی گزارتے ہیں.."

"ادھر تمہارے لیے بہت خطرہ ہے بچے.." انصاری بولا..

"کیوں؟"

"ادھر دو چار ریچھ آ نکلے تو تم ان میں گم ہو جاؤ گے اور ہمیں بہت دشواری ہو گی کہ ان میں سے اپنا سلمان موٹو کونسا ہے... عین ممکن ہے کہ واپسی پر ہم کسی ریچھ کو ساتھ لے جائیں کہ یہ تو اپنا سلمان ہے.."

علی دیگر پورٹروں کے ہمراہ ہم سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا اور وہ سب بوجھ اتارے پل کے قریب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ "صاحب، اس کنارے پر کیمپ کرے گا یا پار جا کر اُدھر خیمہ لگائے گا؟"

اگرچہ... جھیلوں اور ایسے بڑے پانیوں کے دوسرے کنارے ہمیشہ زیادہ حسین اور دلفریب دکھائی دیتے ہیں لیکن اس بڑے پانی کا یہ کنارا جہاں ہم تھے.. بقول یوسف بس "غدر" تھا.. بڑے پانی کی گہری نیلگوں ندی سے بلند اس کنارے کی جو ہموار سطح تھی وہاں جو گھاس سرسراتی تھی.. وہ دوپہر کی دھوپ میں مایا زیوروں کے سنہری پن اور ساسانی جام کے سونے کی قدامت سے بھی بڑھ کر سنہری اور روشن تھی... اس کی زرو خزاں رنگت ایسی تھی کہ اس پر دنیا کا سب سے بڑا مصور بھی اگر صرف ایک سٹروک لگا کر اس کے حسن کرشمہ ساز کو مکمل کرنا چاہے... وہ بے شک چاند کے زرد تھال میں سے رنگ نکالے.. ابھرتے سورج کی زردی میں اپنا برش ڈبو لے... تب بھی اسے بڑے پانی کی اس سنہری گھاس میں کہیں ایک ایسا مقام نہیں ملے گا جس پر وہ یہ سٹروک لگا کر تصویر کو مکمل کرے.. کیونکہ تصویر تکمیل کی حدوں سے بھی آگے جا کر اپنی زردی اور سنہرے پن میں... کسی بھی مصور کے بس سے باہر ہو چکی تھی..

"پار نہیں جائے گا علی.. ادھر اسی کنارے پر... اسی گھاس کے میدان میں کیمپ کرے گا"

پورٹروں نے سامان کھولا اور خیمے لگانے میں جُت گئے..

میرا سلیٹی رنگ کا کچھوا خیمہ اس ٹھنڈی زرد آگ والی گھاس میں سر اٹھانے لگا.. اس کا رخ.. میری خواہش کے احترام میں.. بڑے پانی کی طرف کھلتا تھا..

اگرچہ اس کے باہر بیٹھنے سے وہ نظر نہیں آتے تھے کیونکہ وہ بلند کنارے کے نیچے بہہ رہے تھے.. لیکن ان کے پار بھی گھاس کا ایک میدان تھا.. ٹیلے اور پہاڑیاں تھیں، دیوسائی روڈ تھی اور وہاں کہیں چھاؤں تھی اور کہیں دھوپ اترتی تھی اور جہاں چھاؤں تھی وہاں کی گھاس اتنی دوری سے مدھم متانت بھری شانت خاموشی میں تھی.. اور جہاں دھوپ کی خلیجیں تھیں وہ گھاس یوں روشن ہوتی تھی جیسے ان میں کوہ طور کی زرد آگ بھڑک رہی ہو.. اور ان سے پرے جو اونچائی تھی.. ٹیلوں کی بلندی تھی اور جس پر دیوسائی روڈ اٹھتی تھی وہ شمش کٹ کہلاتی تھی.. اور اس سے پرے کہیں ایک اور ندی روڈ کے سامنے آتی تھی جس کا نام کالا پانی تھا.. جزائر انڈیمان کے کالے پانی میں تو لوگوں کو سزا کے طور پر بھیجا جاتا تھا اور یہ کالا پانی ایسا تھا کہ جُرم آوارگی میں ملوّث لوگ اپنی خواہش سے وہاں تک کا سفر کرتے تھے..

تو میرا خیمہ بڑے پانی کے پار ایسے منظر پر کھلتا تھا..

سنہری گھاس پر خیمہ بستی آباد ہو گئی..

کچن ٹینٹ میں سے دھواں اٹھنے لگا..

سب لوگ اسی وسیع لینڈ سکیپ کی تصویریں اتنی ایمرجنسی میں اتار رہے تھے جیسے وہ یہاں صرف چند لمحوں کے لیے آئے ہوں، کوچ کا نقارہ بج چکا ہے اور اب وہ کبھی بھی یہاں نہ آ سکیں گے اس لیے.. ہر پہلو.. ہر پتھر.. ہر زاویے.. ہر بہاؤ اور گھاس کے ہر تنکے کی تصویر ابھی اتار لو... پھر تھوڑی دیر بعد انہیں کچھ قرار آیا کہ نہیں.. ابھی تو ہم کہیں جانے والے نہیں.. ابھی تو دوپہر ہے.. ہمارے خیمے لگ چکے ہیں.. کچن ٹینٹ میں سے دھواں اٹھ رہا ہے.. ابھی تو نصف دن باقی ہے، پوری رات باقی ہے تو ابھی

اطمینان سے بیٹھا جائے.. اور اس کے باوجود ہم میں سے کسی ایک کو بیٹھے بٹھائے ایک ہول سا اٹھتا اور وہ کیمرہ نکال کر چاروں اور کلک کلک کرنے لگتا کہ.. بڑے پانی کا کوئی ایک منظر نہ تھا.. اس کی کوئی ایک تصویر نہ تھی.. اس کے چار چفیرے جو دھوپ چھاؤں کے نیم سیاہ اور زرد کھیل تھے.. پانیوں کے کانچ کا جو بہاؤ مسلسل تھا.. جو بادل تھے، نیم سیاہ پہاڑوں پر اترتے ہوئے.. اڈتے ہوئے ان کی شباہتیں ہر پل بدلتی تھیں اور ان میں سے ہر ایک میں کوئی سامری تھا جو سحر کرتا تھا.. ان کی رنگت اور شکل کو ہر لمحہ بدلتا تھا..

اور زرد گھاس تھی جس پر آرام کرتا میرا سلیٹی رنگ کا خیمہ اپنی بدرنگی پر پشیمان تھا.. اور ایک خیمہ جو زرد رنگ کا تھا، وہ بہت ہی پشیمان تھا کہ میں اپنے رنگ کو زرد سمجھتا تھا اور اب یہ گھاس دیکھتا ہوں تو مجھ پر نازل ہوتا ہے کہ زردی تو اس کو کہتے ہیں..

البتہ سلمان اینڈ کمپنی کا کچے نیلے رنگ کا ٹینٹ اس زرد گھاس پر یوں ممتاز ہوتا تھا اور نمایاں نظر آتا تھا کہ بہت بدتمیز اور شوخا لگتا تھا.. اس کا پانیوں اور گھاس کے رنگوں سے کوئی مقابلہ نہ تھا..

میں نے جوگر اتارے اور اس گھاس پر دراز ہو گیا..

میرے تلووں کو دیوسائی کی ٹھنڈک ایک چُرائے جانے والے بوسے کی طرح چھوتی تھی اور گزر جاتی تھی..

"صاحب گھاس پر کیوں لیٹا ہے.. میٹرس ڈالتا ہوں، اس پر آرام کرو۔" علی مدد نے پیشکش کی..

"نہیں..."

"میں چائے کا بندوبست کرتا ہوں۔" وہ کچن ٹینٹ کی طرف چلا گیا..

پورٹر بہت خوش تھے.. وہ کچھ دیر چلے تھے.. ایک آسان روڈ پر چلے تھے.. اور ان کو پورے دن کی مزدوری مل جاتی تھی..

جب ہم درکوت گلیشیر کے کناروں پر خیمہ زن ہوئے تھے.. اور اگلی سویر

نیم اندھیرے ہمیں اس اجنبی دراڑوں بھرے گلیشیر کے پار جانا تھا تو میں شام ڈھلے ایک پتھر سے ٹیک لگائے اپنے آس پاس کی برف کی جو چُپ دنیا تھی، اس کی منجمد حیرتوں اور جادوئی قلعوں میں گھرا اپنی سفری ڈائری لکھتا تھا.. اور میں نے سوچا تھا کہ اگر دنیا جہان سے کٹے ہوئے.. پامیر کے سائے میں، ازبکستان کی قربت میں اس درکوت گلیشیر پر اگر ایک لیٹر بوکس ہوتا تو میں کسے خط پوسٹ کرتا..

اگرچہ یہ بڑا پانی... درّہ درکوت کی دور افتادہ مسافتوں.. دنیا جہان بلکہ دین دنیا سے الگ ایک برف تنہائی ہرگز نہ تھا.. یہاں تک تو جیپ بھی آتی تھی.. لیکن اس کے باوجود اگر یہاں ایک لیٹر باکس ہوتا تو میں..

پہلا خط اللہ تعالیٰ کو لکھتا اور صرف "تھینک یو سر" لکھتا..

دوسرا خط اپنے بال بچوں کے نام تحریر کرتا کہ وہ مجھ جیسے آوارہ مزاج اباّجی سے نہ صرف محبت کرتے تھے بلکہ مجھ سے برعکس اپنی پڑھائیوں اور اخلاق میں بے حد لائق، فائق اور برتر تھے..

اسی خط میں بیگم صاحبہ کے نام بھی ایک سطر ہوتی کہ میرے بچے خوش اسلوبی سے پالنے کا شکریہ اور مجھے اب تک طلاق نہ دینے کا شکریہ..

اور تیسرا خط یقیناً شاہ گوری کے نام ہوتا.. سنولیک اور جھیل کرومبر کے نام ہوتا کہ آپ سب خواتین کا میں ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے اندر آنے کی اجازت دی... مجھ جنگلی کو اپنے درمیان میں پاکر اُف نہ کی اور برداشت کیا..

اور آخری خط میں عبدالستار ایدھی کے نام لکھتا.. کہ ہم پیغمبروں کے قصّے تو سنتے آئے ہیں لیکن ان کی پیروی کرنے والے نہ دیکھے تھے.. آپ گناہوں کی ایک بستی پر ایک آسمانی صحیفے کی طرح اترے ہو.. ہمارے گناہوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے شکریہ... مصلوب کر دیئے جانے سے پہلے تمہارا شکریہ... دیوسائی کے بڑے پانی سے..

انصاری... نیچے اتر چکا تھا.. بڑے پانی کے کناروں پر کھڑا بار بار اپنی کُنڈی پانی میں پھینک رہا تھا.. وہ ایک پراہتمام شخص تھا۔ اس لیے کہ انصار میں سے تھا.. اور سکردو سے چلتے ہوئے مچھلیاں پکڑنے کے لیے چند کُنڈیاں اور ڈوری خرید چکا تھا..

اُس سے ذرا پرے.. علی... بھی بڑے پانیوں میں ڈوری پھینکتا قسمت آزمائی کر رہا تھا..

مچھلی کے شکاری... صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ زندگی کا روشن پہلو دیکھتے ہیں.. انہیں ہر جوہڑ.. ہر تالاب میں.. بلکہ اپنے گھر کے صحن میں کھڑے بارش کے پانی میں بھی مچھلی نظر آتی ہے.. لیکن یہاں.. بڑے پانی میں تو شنید تھی کہ سنو کارپ.. ٹراؤٹ کی ایک قدرے کمتر قسم وافر تعداد میں تیرتی تھی اور صرف اس لیے کہ چند برسوں سے محکمہ جنگلی حیات والوں نے دیوسائی کی ندیوں میں جال پھینک کر بارود کا دھماکہ کر کے مچھلیوں کو پکڑنے اور ہلاک کرنے پر شدید قسم کی پابندی لگا رکھی تھی.. اب صرف دیوسائی کاٹج کی طرح اِکاّ دُکاّ افراد ہی چوری چھپے مچھلی پکڑتے تھے.. ورنہ اس پابندی کی وجہ سے.. اب دیوسائی کی ندیاں اور بڑا پانی مچھلیوں سے بھرے پڑے تھے..

لیکن انصاری اور علی بہت دیر تک قسمت آزمائی کر رہے تھے اور ان کی کُنڈیوں کو کسی ایک مچھلی نے بھی منہ نہیں مارا تھا..

"مچھلی نہیں آئے گی علی..؟" میں نے پکارا..

"آئے گی سر.." علی نے جواب دیا..

مچھلی پکڑنے کے لیے کانٹے کے ساتھ لٹکتی ہوئی کوئی چمکتی ترغیب چاہیے.. کوئی بیٹ درکار ہے.. خوراک کا ایک دھوکا یا ایک عدد گنڈوہیا یا کینچوا چاہیے.. تو یہ ترغیب یا کینچوا کہاں سے حاصل کیا جائے؟.. علی جانتا تھا.. اس نے ندی کنارے جو بڑے بڑے پتھر پانیوں میں کبھی ڈوبتے تھے، کبھی ابھرتے تھے انہیں اٹھایا.. ان کے نیچے بوسیدہ گھاس تھی اور ٹہنیاں تھیں.. اس نے ایک گلی ہوئی ٹہنی کو اٹھا کر اسے درمیان میں سے توڑا..

اور کیا یہ معجزہ نہیں ہے کہ اس میں چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگتے تھے.. علی نے نہایت احتیاط سے ایک کیڑے کو نکال کر اپنی کُنڈی میں پرویا اور اسے پانی میں پھینک دیا..

یہ عمل میرے لیے حیرت ناک تھا..

جو مقامی لوگ ہیں وہ اپنی دھرتی کی نبض کو پہچانتے ہیں.. صرف وہی جانتے ہیں کہ اس ندی کے کناروں پر جو پتھر ہیں ان کے نیچے بوسیدہ لکڑی ہے اور اسے اگر توڑا جائے تو اس میں وہ کیڑے ہوں گے جو مچھلی کو ترغیب دینے کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں.. درّہ شندور کی چڑھائی سے پہلے "لنگر" کا جو علاقہ ہے اور جہاں ہر سُو گھنی جھاڑیوں میں ندیاں بہتی ہیں.. وہاں سلجوق اور سمیر اپنے غیر ملکی فشنگ راڈ کی چرخی گھماتے گھماتے نڈھال ہو گئے تھے اور کچھ ہاتھ نہ آیا تھا.. لیکن ہمارے جیپ ڈرائیور غازی نے ایک عام سی ڈوری اور زنگ آلود کنڈی کی مدد سے تین چار ٹراؤٹ مچھلیاں پکڑ لی تھیں..

میں گھاس پر.. زرد گھاس کے الاؤ پر.. آسودہ اور زندگی سے خوش تھا.. ایک دیوسائی کے ریچھ کی طرح ایسے آسودہ اور زندگی سے خوش تھا جو ابھی ابھی اپنی محبوب ریچھنی کے ساتھ میل کر کے آیا ہو.. اس نے بڑے پانی سے چند مچھلیاں نوش کی ہوں.. تھوڑی سی سنہری گھاس اپنا ہاضمہ درست کرنے کے لیے پیٹ میں اتاری ہو.. اور پھر ایک بدتمیز سیٹیاں بجاتے مارموٹ کا گرم گوشت نگل کر آیا ہو..

زرد گھاس میرے نتھنوں میں جاتی تھی.. میری آنکھوں کی سطح پر اس کے تنکے زرد تیروں کی طرح دیوسائی کے آسمان سے اترتے تھے..

اور سامنے.. بلکہ خیمے کے نیچے بڑا پانی تھا.. جو ابھی نیلگوں تھا اور اس کی تہہ میں جو پتھر تھے، وہ الگ الگ نظر آتے تھے، اس کے گہرے بہاؤ میں... اور ابھی عجیب شباہتوں والے سامری بادل دھوپ کا راستہ روک لیتے تھے تو وہی پانی سرمئی ہوتے جاتے تھے..

"فان گوگ نے سورج مکھی کے پھول دیوسائی میں پینٹ کیے تھے"

بڑا پانی.. دی بِگ واٹرز..

دیوسائی کی مرکزی ندی.. بڑا دریا.. نیلگوں دلکشی کے باوجود اس میں تکبّر کا شور نہ تھا.. انکساری سے چپ چاپ بہتا تھا..

اور دیوسائی کی سب ندیاں... سب نالے... اور اس خاموشی میں جائیں اتنے بلند نالے... تو دیوسائی کہ نالوں سے بلند نالہ اور کہاں ہوگا... تو یہ نالے... شتونگ نالہ... کالاپانی نالہ.. سارسنگری نالہ.. مرتضےٰ چوکی نالہ... وہ نالے جو ذرا بلند آہنگ ہیں، بڑے ہیں، دور تک جاتے ہیں.. لیکن ان کے سوا چھوٹے چھوٹے بے شمار نالے ہیں.. مثلاً لمالنگ... پھیالنگ... وٹوگیر... اور بڑا دریا شنگو جو کہ درّہ برزل سے بہتا ہوا گل تری کے نزدیک اس بڑے پانی میں جا شامل ہوتا ہے.. یعنی بڑا پانی چونکہ بزرگ نالہ ہے اس لیے سب کے سب چھوٹے بڑے نابالغ نالے اس کی آغوش میں آکر آداب بجالاتے ہیں....

اور یہ بڑا پانی جب میرے سامنے سے بہتا ہوا.. دیوسائی کی تمامتر آبی عظمت کو سمیٹ کر جب گل تری میں پہنچتا ہے تو اپنا نام بدل کر شنگو شگر رکھ لیتا ہے.. شائد اس

لیے کہ اب اس نے اپنا موجودہ وطن چھوڑ کر انڈیا میں داخل ہونا ہوتا ہے.. انڈیا کا ایک قصبہ دراس اس کے کناروں پر آباد ہے.. یعنی یہ پانی جو ابھی میں دیکھ رہا ہوں، کچھ عرصہ بعد دراس کے باسیوں کو دکھائی دینے لگیں گے.. اور یہ ثابت کریں گے کہ پانیوں کا کوئی ملک نہیں ہوتا.. انڈیا میں بھی اس بڑے پانی میں ایک اور دریا سورو نام کا شامل ہوتا ہے اور پھر وہیں سے یہ بڑے پانی.. شنگو شگر پھر سے پاکستان میں داخل ہو جاتے ہیں..

جیسے صبح کا بھولا شام کو واپس آجائے..

ایسے بڑا پانی... شنگو شگر پاکستان واپس آجاتا ہے.. اور پھر کھرمنگ اور اولڈنگ کے قرب وجوار میں وادیٔ خپلو سے ذرا اوپر دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے..

چنانچہ بشام موٹل کے ٹیرس سے دریائے سندھ کی جو سلیٹی چادر کروٹیں بدلتی دکھائی دیتی ہے، اس میں سے ایک کروٹ اس بڑے پانی کی بھی ہوتی ہے.. اور غازی گھاٹ سے نیچے جہاں میں نے سندھ کے پانیوں میں سے اندھی ڈولفن کو ابھرتے دیکھا تھا تو اس کے وجود کو تھوڑی سی ٹھنڈک دیوسائی کی عطا کردہ بھی تھی..

"صاحب.. مچھلی" علی ایک شوخ سرخ جیکٹ میں ملبوس اپنی ڈوری کی سرے پر ایک دُم پٹختی، گلپھڑے پھیلاتی نیم سیاہ مچھلی کو اٹھائے اوپر آرہا تھا..

اس نے مچھلی کو کانٹے سے الگ کر کے گھاس پر ڈال دیا..

مچھلی کی آنکھوں میں ابھی تک پانی سے بچھڑ جانے کی بے یقینی تھی..

سنوکارپ... سنوٹراؤٹ... زرد گھاس کے سونا میدانوں کے پس منظر میں آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی گئی... پھر آخری بار اس کی دُم پھڑکی اور اس کی آنکھیں اسی منظر پر ساکت ہو گئیں جو ہم دیکھتے تھے..

اور ہم کتنے نصیب والے تھے کہ ہم بھی وہی منظر دیکھتے تھے لیکن ہماری آنکھیں ساکت نہیں ہوئی تھیں.. ہمیں فی الحال ایک بڑے شکاری نے نہیں پکڑا تھا..

"صاحب اسے رات کے کھانے پر فرائی کرے گا۔۔" علی نے اعلان کیا اور پھر سے نیچے ندی کی طرف اتر گیا۔۔

انصاری ڈوری پھینک پھینک کر اپنے ہاتھ تھکا چکا تھا اور اس کی کُنڈی۔۔۔ایک بیوہ کے بستر کی طرح ویران رہی تھی۔۔

تھوڑی دیر بعد علی پھر آ گیا۔۔اور اس کی کُنڈی پھر آباد تھی۔۔ایک اور سنو کارپ اپنی دُم کا جھاڑو بے تابی سے پھیرتی تھی۔ "صاحب۔۔اب تو رات کو مچھلی کا جشن ہوگا"

اس نے دونوں سنو کارپ میرے خیمے کے سامنے زرد گھاس پر سجا دیں اور چلا گیا۔۔

شتونگ کی جانب سے۔۔۔اس بلند مقام سے۔۔۔۔ جہاں سے ہم نے پہلی بار بڑے پانی کو دیکھا تھا۔۔۔کب دیکھا تھا؟ شائد صدیوں پہلے دیکھا تھا کہ اب ہم اس کے باسی تھے، عرصہ دراز سے یہاں آباد تھے اور ہماری آبادی میں ابھی تک اور کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔۔اور اب داخل ہو رہا تھا۔۔ وہاں اس بلند مقام پر ہم نے جیپوں کو معلق دیکھا، پھر وہ نیچے آنے لگیں۔۔ پُل کے قریب پہنچ کر ان کے مسافر اتر گئے۔۔ عورتیں، مرد، بچے۔۔بے شمار سامان۔۔ تاکہ خالی جیپیں اس مخدوش پُل پر سے پار جا سکیں۔۔

پہلے ایک جیپ نے ایک عجیب خواب آلود آہستگی سے پُل کے شہتیروں پر ٹائروں کو اٹک اٹک کر گھماتے۔۔ دھچکے کھاتے ایک مدت میں اس پُل کو پار کیا۔۔وہ پار اتری تو دوسری جیپ جو نیلے رنگ کی تھی، پُل پر اپنے ٹائر لے آئی۔۔اور شاید اس جیپ کے بڑے پانی کے اوپر جو ناتواں پل تھا، اسے چھونے سے۔۔ عقب میں جو پورا منظر تھا وہ یکلخت بدل گیا۔۔ایک نیم سیاہ دیومالائی تاریکی سی پہاڑیوں پر ایک دھند کی آہستگی سے پھیلنے لگی۔۔اور ان پر جو بادل جھکتے تھے، وہ دیکھتے دیکھتے حجم میں بڑھتے تھے اور ان کے اندر کوئی طاقت تھی جو پوشیدہ تھی اور میں اس متحرک ہوتے منظر کی سیاہ خوبصورتی بیان کرنے سے قاصر ہوں۔۔ یقیناً اس منظر کے بادلوں میں اپالو دیوتا کے رَتھ چلتے تھے۔۔

یونانی اور ہندوستانی دیویاں ان میں بسیرا کرتی تھیں۔۔یہ خداؤں کا مسکن تھا۔۔اور ان میں بہت سارے عمر خیام اور حافظ تھے جن کی موجودگی ان بادلوں کو مخمور اور مست کرتی تھی۔۔

اور نیلی جیپ بھی ایسے دکھائی دی جیسے اس کے ٹائروں تلے پُل کا شہتیر نہیں۔۔بڑے پانی ہیں جن پر وہ تیرتی جا رہی ہے۔۔ دھیرے دھیرے۔۔ ندیا دھیرے بہو۔۔ جیپ کا نیلا راج ہنس تیرتا چلا جا رہا تھا۔۔

میں نے اس دیومالائی لمحے کی ایک تصویر اتاری تھی اور اس کا تھوڑا سا طلسم قید کر لیا تھا۔۔ میں اس تصویر کو دیکھتا ہوں تو بڑے پانی، زرد الاؤ گھاس، نیلی جیپ، بادلوں کے دھوکے اور جادوئی کھیل کا یقین نہیں آتا۔۔

اسی زرد گھاس کے الاؤ میں دو مچھلیاں پڑی تھیں۔۔۔ڈھلتی دھوپ میں چمکتی سنو کارپ۔۔ دونوں جیپیں پُل کے پار پہنچ چکی تھیں اور اب ان کے مسافر پُل پر سے گزر کر دوسری جانب جا رہے تھے۔۔

تب ایک اور حیرت کدہ اپنی سُرخی بکھیرتا سامنے آیا۔۔

بڑے پانی کے شیشہ وجود کے اوپر جھولتے ہوئے پل پر دو سُرخ خواتین چل رہی تھیں۔۔اس لمحے صرف وہی تھیں جو پُل پر سے گزر رہی تھیں۔۔

زرد گھاس کے میدان سے پرے۔۔۔وہ دونوں۔۔سرخ چادروں میں لپٹی۔۔اس دیومالائی منظر کا ایک حصہ بن گئیں۔۔۔ سرمئی بادلوں میں اپالو نے اپنا رتھ روک دیا۔۔ دیویاں اپنے سنگھاسن سے اتر کر انہیں دیکھنے لگیں۔۔وہ دو خواتین اس جادوئی کائنات کا مرکز بن گئیں۔۔۔وہ دو شوخ سرخ دھبّوں کی صورت اس لینڈ سکیپ میں تیز ہوا سے بچتی۔۔احتیاط سے قدم دھرتی پُل کے دوسری جانب جا رہی تھیں۔۔

مسافر پار پہنچے۔۔اپنی اپنی جیپوں میں سوار ہوئے۔۔

پھر وہ دونوں جیپیں ایک عجیب ماورائی لینڈ سکیپ میں پینٹ کی ہوئیں حرکت میں آئیں اور بلندی کی طرف اٹھنے لگیں۔۔ایک تو نیلی جیپ تھی لیکن دوسری کا رنگ پیلا

تھا اور جب وہ بلند ہو کر زرد گھاس میں اوجھل ہو رہی تھی تو ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ پیلی رنگت کی جیپ درّہ برزل پر الٹ جائے گی..

ہم نے بھی کل صبح اسی ٹیل کے پار جانا تھا لیکن ابھی اس زرد دوپہر میں یہ ممکن ہی نہ لگتا تھا کہ ہم کبھی بھی پار اتریں گے اور سامنے بادلوں کے نرغے میں آئے ہوئے شمش کٹ کے دوسری جانب سفر کریں گے..

اس لیے کہ ابھی... ہم ایک زرد دوپہر میں تھے.. بڑے پانی کے کنارے، سونا گھاس میں اپنے خیموں کے باہر.. دھوپ میں دو مچھلیاں لشکتی تھیں اور کچن ٹینٹ سے دھواں اٹھتا تھا..

میرے خیمے کی طنابوں سے ذرا ادھر وہ لشکتی مچھلیاں تھیں جو ابھی ابھی بڑے پانی سے جدا ہو کر آئی تھیں.. اور جیسے ان مچھلیوں کے لیے بڑے پانی سے جدا ہو جانا.. موت تھا.. ایسے میں اس زرد گھاس میں لیٹا.. اسے محسوس کرتا.. اس میں منہ کھول کر سانس لیتا.. اس سے جدا ہونے کا تصور نہیں کر سکتا تھا.. کہ یہ وہ آکسیجن تھی جو میری زندگی کو زندگی دیتی تھی..

یہ زرد گھاس فان گوگ کی تصویروں میں بھی تھی.. بالکل یہی!

اگر آپ کو ایمسٹرڈیم کے میوزیم آف ماڈرن آرٹ کے فان گوگ سیکشن میں جانے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ بیشتر تصویروں میں بڑے پانی کے کناروں پر دیوسائی کی جو گھاس ہے، اُسی کی سنہری زردی ہے.. یہی گھاس ہے.. فان گوگ نے دیوسائی آکر اسے پینٹ کیا تھا.. وہ بے شک اس نام سے بھی واقف نہ تھا لیکن وہ یقیناً جسمانی طور پر نہ سہی روحانی طور پر ادھر آیا تھا.. ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہی زرد گھاس.. اس کا ایک ایک سنہری تنکا اس کی تصویروں میں نمایاں ہو..

اسی میوزیم میں اس کے مشہورِ زمانہ "سن فلاور" بھی ہیں.. سورج مکھی کے پھول.. جو ہزاروں مصوّروں نے پینٹ کیے ہوں گے لیکن فان گوگ کے یہ پھول

صرف پھول نہ تھے، ان میں اس کی دیوانگی بھی شامل تھی.. وہ کان بھی تھا جو اس نے ایک طوائف کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے کاٹ کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا.. اور اپنے بھائی لیو کی محبت بھی تھی جسے وہ عالم دیوانگی میں خط لکھتا تھا اور اپنے دل کا حال بیان کرتا تھا.... ہم میں سے کتنے بھائی ہیں جو فان گوگ ایسے کسی بھائی کی دیوانگی سمجھ سکتے ہیں..

فرانس کے ایک قصبے میں اس نے اپنی دیوانگی کے آخری دن... رنگ اور کینوس میں ڈوب کر گزارے.. اس کی ہر سٹروک میں ایک پاگل پن تھا.. اور اس دیوانگی میں سب سے بھڑکیلا اور پھڑکتا ہوا جو رنگ تھا.. وہ زرد تھا..

میں جب اس میوزیم کے اُس حصے میں داخل ہوا تھا جس میں فان گوگ کے شاہکار آویزاں تھے تو میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں.. سورج گھومتے ہوئے زرد رنگوں کے سورج اور زردگی میں.. دیوسائی کی گھاس.. اس کا ایک ایک تنکا فان گوگ کی سٹروک تھا.. اگرچہ تب میں بھی دیوسائی سے آشنا نہ تھا.. لیکن پچھلے چار دنوں سے جب بھی میں اس تیز ہوا میں سرسراتی زرد گھاس کے تنکوں پر غور کرتا تھا تو وہ آشنا لگتے تھے..

صرف اس لیے کہ میں انہیں فان گوگ کی تصویروں میں دیکھ چکا تھا..

میں تو یہاں صرف ایک بادل، ایک پھول اور ایک ریچھ کے لیے آیا تھا لیکن اس کے بادلوں میں تو اپالو دیوتا کے رتھ چلتے تھے اور فان گوگ اس کی زرد گھاس کو پینٹ کرتا تھا..

میں بہت دیر اونگھتا رہا.. دھوپ اور گھاس کی زردی میں.. اور شائد وہ مردہ مچھلیاں بھی مجھے حیرت سے دیکھتی رہیں.. دیوسائی.. اے دیوسائی!

”ریچھوں-عقابوں-لومڑیوں اور بھیڑیوں کے عشق میں فنا ایک راج بُھوت“

”تارڑ صاحب.. میں کسی زمانے میں راج پُوت تھا.. پھر سندھ وائلڈ لائف کا محکمہ جائن کیا تو کھلی فضاؤں اور دھوپ میں رہنے کی وجہ سے راج بُھوت ہو گیا..“

”خیر آپ اتنے بھی بُھوت نہیں ہیں...“ میں نے اخلاقاً کہا، اگرچہ وہ خاصے بُھوت تھے... رفیق راجپوت کا رنگ مجھ سے بھی سنولایا ہوا تھا..

”کبھی آپ نے میرے جتنا سیاہ فام راجپوت دیکھا ہے؟“

”ہاں دیکھا ہے.. میرا جگری یار ہے مصطفےٰ چودھری.. ان دنوں اتفاقاً ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہے۔ میں نے اسے دیکھا ہے اور وہ اتنا زبردست رانگڑ ہے کہ اس کے لب ہرگز شیریں بھی نہیں ہیں اور اس کے باوجود اس سے گالیاں کھا کے میں کبھی بے مزہ نہیں ہوا بلکہ فرمائش کر کے کھاتا ہوں۔ اس کے باوجود کہ وائس چانسلری سے اُس کا دماغ اُلٹ گیا ہے۔“

”وہ مجھ سے بھی زیادہ راج بھوت ہیں؟“ رفیق نے بے حد خوش ہو کر پوچھا..

”اب تو بالوں کی سفیدی نے اسے جعلی طور پر مدّبر اور گریس فُل بنا دیا ہے ورنہ جوانی میں ایسا ہی تھا.. اگرچہ آپ کے مقابلے کا نہیں تھا.. ہمیشہ میری بیگم کو جو اتفاقاً راجپوت ہے، کہا کرتا تھا کہ بھابی آپ کے ماں باپ نے آپ کو اس جاہل اور کم ذات جاٹ کے ساتھ بیاہ کر بڑا ظلم کیا ہے..“

رفیق راجپوت... ریچھوں، مارخوروں، عقابوں، لومڑیوں، مچھلیوں، گرگٹوں اور چھپکلیوں کے عشق میں فنا ہو چکا تھا.. اگر اس کا بس چلتا تو وہ اپنی جُون بدل کر ایک ریچھ یا کم از کم ایک چھپکلا تو ضرور ہو جاتا.. جنگلی حیات کو بچانے کے جنون اور اس کی محبت میں مبتلا رفیق ایسا تھا کہ اسے ہر ریچھ میں ایک لیلےٰ نظر آتی تھی... ہر نادر مچھلی ایک صاحباں دکھائی دیتی تھی.. اور ہر مچھلی ہیر کا روپ لگتی تھی.. اور دیوسائی پر جو بھی چھپکلی تھی، اس کے لیے سسّی یا جولیٹ تھی.. وہ ان سب کے مشترکہ عشق میں مبتلا تھا.. اس کی تمام تر گفتگو ان لیلاؤں اور ہیروں وغیرہ کے گرد طواف کرتی تھی جیسے وہ ایک مقدس فریضہ سرانجام دے رہا ہو.. میں نے ایسا عشق صرف حسین طوائفوں کے سارنگی نوازوں یا طبلہ بجانے والوں میں دیکھا ہے جو اپنی بائی کی محبت میں دائم رہتے ہیں اور اپنی پوری زندگی اس آس میں گزار دیتے ہیں کہ جب اس کی عمر ڈھلے گی تو یہ ادھیڑ عمر عاشق اور دولت والے اسے چھوڑ دیں گے۔ تب شائد یہ پیچھے مڑ کر میری طرف اک نگاہ کر لے.. کہہ دے کہ استاد جی.. ذرا ایک پان تو کھلا دیں.... تو میں نے اتنا جاں نثار اور کومٹڈ ریچھ.. لومڑی، گرگٹ عاشق اس سے پیشتر نہ دیکھا تھا..

”جناب میں تو آج صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہا تھا.. سکردو میں تھا.. وہاں بازار میں خبر ملی کہ تارڑ صاحب اوپر دیوسائی میں گئے ہیں.. تو میں نے سوچا، وہ بڑے پانی بھی جائیں گے.. اور وہاں اس کے کناروں پر وائلڈ لائف والوں کا جو کیمپ ہے، وہاں میں نہیں ہوں گا... تو مجھے ہونا چاہیے۔ آپ نے ہمارا کیمپ تو دیکھا ہے ناں.. وہ بڑے پانی کے کنارے.. گھاس اور پتھروں سے پرے جو چند خیمے نظر آ رہے ہیں.. وہ ہمارے ہیں..“

میں نے جب پہلی بار ایک بلندی سے نیچے بڑے پانی کو دیکھا تھا.. اور اسی

دوپہر کو دیکھا تھا.. تو صرف اسے اور اِس کے پُل کو ہی نہیں دیکھا بلکہ میری نگاہ بڑے پانیوں کے کنارے سفر کرتی اس مقام تک بھی گئی تھی جہاں متعدد سفید خیمے نظر آرہے تھے... اور مجھے پہلے سے علم تھا کہ وہاں دیوسائی کی جنگلی حیات کی تحقیق میں مصروف اور اس کی بقاء کے شیدائی کچھ افراد مقیم ہیں.... اور میں چاہتا تھا کہ آج شام میں ذرا ٹہلتا ٹہلتا ادھر نکل جاؤں اور اگر وہ لوگ ذرا فرینڈلی ہوئے تو ان کے ساتھ تھوڑی گپ شپ کروں، اپنی معلومات میں اضافہ کروں..

اور یہ راج بھُوت مجھ سے پہلے پہنچ گیا تھا اور صرف میرے لیے اسلام آباد کی فلائٹ ترک کر کے سکردو سے مارومار کرتا.. واپس بڑے پانی پہنچ گیا تھا..

”جناب ادھر کچھ عرصہ پہلے کوہ پیما میسنر بھی آیا تھا.. تین روز ادھر بڑے پانی میں ٹھہرا اور ریچھ دیکھ کر چلا گیا.. اور میں ان دنوں بدقسمتی سے چھٹی پر سندھ گیا ہوا تھا.. تو اب میں نے سوچا کہ میسنر تو مِس ہو گیا، تارڑ صاحب کو مِس نہیں کرنا چاہیے.“

میں اور میرے ساتھی رفیق کی آتش شوق سے بے حد متاثر ہوئے اور تہہ دل سے اس کا شکریہ ادا کیا..

”یوں بھی آج سویرے آپ کی جیپ یہاں آگئی تھی..“

”ہماری جیپ؟“ میں نے حیران ہو کر کہا..

”آپ نے سکردو میں... ٹھیکیدار برائے جیپاں برائے شمالی علاقہ جات... نجف.. کو کہا تھا ناں کہ منی مرگ میں آپ کو سکردو واپس لانے کے لیے ایک جیپ درکار ہے..“

”ہاں کہا تھا.. لیکن وہ تو کل شام کے لیے کہا تھا.. تاکہ ہم پرسوں واپس آئیں۔“

”دراصل ادھر بڑے پانی پہنچ کر نجف کے ایک ڈرائیور عجائب خان کی جیپ کا انجن اگاڑ پچھاڑ ہو گیا تھا.. یعنی خراب ہو گیا تھا.. تو سکردو میں آپ کی جیپ کے ڈرائیور عبدالصمد خان کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ پہلے بڑا پانی پہنچ کر اس جیپ کو مرمت کرو..

سٹارٹنگ پوزیشن میں لاؤ اور پھر ادھر سے منی مرگ چلے جاؤ.. اب ادھر صمد خان کو پتہ چلا ہے کہ آپ تو ابھی ادھر ہو تو وہ کہتا ہے کہ میں خالی منی مرگ کیوں جاؤں تارڑ صاحب کو ساتھ لے کر جاتا ہوں اور پھر ساتھ واپس لاتا ہوں۔“

اگرچہ ہم بقیہ دیوسائی عبور کر کے.. درّہ برزل سے اُدھر منی مرگ تک ٹریک کرنے کے لیے کمربستہ تھے لیکن ہم نے یہ اطلاع سُن کر کمر کھول دی.. کہ یہ خبر دل کو نہایت تروتازگی اور بالیدگی دینے والی تھی کہ ہم ادھر کچھ پورٹروں کو فارغ کر دیں اور پھر مزے سے جیپ پر سوار ہو کر منی مرگ جائیں.. ایک رات اُدھر ٹھہریں اور پھر دیوسائی عبور کر کے واپس سکردو پہنچ جائیں.. اس تبدیلی سے اگرچہ ہماری پیدل چلنے اور کوہ نوردی کی صعوبتیں برداشت کرنے کی شہرت متاثر ہوتی تھی.. لیکن کون دیکھتا تھا.. ہم میں اتنا جگرا نہ تھا کہ ایک اپنی جیپ کو منی مرگ خالی جاتے ہوئے الوداع کہتے اور پھر دو دن کی پیدل مشقت کے بعد اس تک پہنچتے.. کون دیکھتا تھا..

”جناب آپ سے درخواست ہے کہ رات کا کھانا آپ ہمارے کیمپ میں آکر کھائیں.. وہاں ریچھ بھی آتا ہے..“

”کھانا.. کھانے کے لیے آتا ہے؟“

”نہیں جناب.. صرف سونگھنے کے لیے آتا ہے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں.. پھر لید کرتا ہے اور چلا جاتا ہے..“

”تھینک یو رفیق.. لیکن رات کے کھانے کا مکمل انتظام ہو چکا ہے.. ایک مرغی ہمارے پاس ہے جو شتونگ کی ندیوں کے کنارے ہلاک یا حلال کی گئی تھی اور دو مچھلیاں ہیں جو بڑے پانی میں سے شکار کی گئی تھیں..“

رفیق چوکنا ہو گیا۔ ”آپ نے بڑے پانی میں سے مچھلیاں پکڑی ہیں؟“

”میں نے پکڑی ہیں..“ علی نے سینہ پھلا کر اپنے آپ کو نمایاں کیا..

”آپ نے تو جناب غیر قانونی کام کیا.. اور اس کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔“

"صاحب نے کہا تھا کہ پکڑو.. میں نے تو نہیں پکڑیں.." علی فوراً ایک آؤٹ کر گیا۔

"سنو کارپ مچھلیاں ہوں گی.." رفیق نے آزردہ ہو کر کہا۔ "بہر حال آپ مہمان ہیں.. آئندہ احتیاط کیجئے گا.. ویسے یہاں سے آگے جہاں بڑا پانی میں کالا پانی کی ندی آکر ملتی ہے تو وہاں گہرائی بہت کم ہے.. اور وہاں اتنی مچھلی ہے کہ پانی دکھائی نہیں دیتا.. صرف مچھلیوں کے ڈھیر حرکت کرتے نظر آتے ہیں.. ٹریفک جیم ہو جاتا ہے۔"

ہماری خیمہ بستی سے دور.. بڑے پانیوں کے بہاؤ کے کناروں پر وائلڈ لائف والوں کا کیمپ نظر آرہا تھا.. ڈھلتی دوپہر میں ایک پاکستانی پرچم کا سبز بہاؤ بھی زرد ہوتا آہستگی سے حرکت کرتا تھا.... اس کی قربت میں دو جیپیں ساکت نظر آرہی تھیں.. ان میں ایک تو ہمارے نکاح میں تھی اور دوسری جس کا انجن خلاص ہو چکا تھا..

"جناب ادھر آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو.. کوئی خدمت ہو تو مجھ راج بھُوت کو حکم کریں.."

حسن صاحب ہم سب کی جانب دیکھتے ہوئے ذرا جھجک کر اور ذرا آزردگی سے کہنے لگے۔ "ادھر کوئی ٹیلی فون ہے؟"

"ادھر بڑے پانی میں..." رفیق کی سیاہ آنکھیں چھپاک سے کھل گئیں۔

"نہیں جی.. لیکن اس کے علاوہ کوئی خدمت ہو تو..."

"ادھر کچھ پینے کو ہے؟" حسن صاحب نے ذرا لجاتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہیں جی..." رفیق نے بھی لجاتے ہوئے جواب دیا۔ "شوق ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ فرمائیں کہ.. آپ کونسا برانڈ پسند کرتے ہیں؟"

"گولڈ لیف..."

"جی؟.." رفیق شرمندگی سے مزید بھُوت ہو گیا۔ "یعنی آپ سگریٹوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے.. اوہو.. میں نے سمجھا کہ.. اچھا تو.. وہ میں تو سگریٹ بھی

نہیں پیتا.. لیکن ہمارا ایک کولیگ یہی برانڈ پیتا ہے اور.. اور وہ تو سکردو گیا ہوا ہے.. اپنا سامان لاکر میں مقفل کر کے گیا ہوا ہے.. لیکن جناب ابھی کیمپ واپس جا کر اس کا تالا توڑتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اس کے لاکر میں کوئی سٹاک موجود ہے یا نہیں.. میں ابھی آتا ہوں.."

وہ اٹھا اور ہمارے شدید احتجاج کے باوجود لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کیمپ کی طرف چلا گیا..

ہمارے سگریٹوں کا سٹاک گھُٹ گھُٹ کے مرنے کو تھا... اور یہ جو بقول آسکر وائلڈ، سفید کنول تھے، ان کا ذخیرہ ہمارے پاس اتنا مختصر ہو گیا تھا کہ ہم سارے دن میں صرف دو سگریٹ پھونکتے تھے... یعنی ہم تینوں نشہ باز... حسن، انصاری اور میں.. ناشتے کے فوراً بعد ایک دائرے میں بیٹھ کر ایک سگریٹ سُلگاتے تھے اور باری باری کش لگاتے تھے اور کڑی نگاہ رکھتے تھے کہ کسی کا سُوٹا طول نہ کھینچے اور یہ بھی اہتمام کرتے تھے کہ سگریٹ کا دھواں بُوتھی اوپر اٹھا کر دیوسائی کی پاکیزہ ہوا میں چھوڑ کر آلودگی نہ پھیلائی جائے.. اسے اپنے سینے میں ہی دفن کر لیا جائے تاکہ زیاں نہ ہو..

رفیق راجپوت ابھی گیا تھا اور ابھی واپس آ گیا..

اس نے مسکراتے ہوئے اپنی گرے سبز رنگ کی کاموفلاج جیکٹ میں سے ہاتھ نکالا اور وہاں تین سرخ ہیرے بڑے پانی کی زرد دوپہر میں دمکنے لگے.. گولڈ لیف کے تنے بھرے پُرے پیکٹ.. رفیق ہماری نظروں میں یکدم معزز ہوا اور راج بھُوت سے راج کمار بن گیا.. اگر ہمیں عمدہ اخلاقیات کا پاس نہ ہوتا تو ہم اس کے متعدد بوسے لیتے.. ہم نے ایک ایک پیکٹ قابو کیا اور الگ الگ سمتوں میں جا کر دوسروں کی نظروں سے مخفی ہو کر تنہائی میں ایک عرصے کے بعد ایک ایک سگریٹ پورے کا پورا پیا اور کسی بھی گناہِ کبیرہ سے کہیں زیادہ لذت اندوز ہوئے..

ہم سب اب مستی کی فراوانی میں تھے.. موج میں تھے.. ہم تینوں ایک ایک

سگریٹ پی چکے تھے.. خالد اپنی بیگم کو یاد کر چکا تھا.. اور نور جہاں کا ایک ہیجان خیز پنجابی
گانا سن کر زیر مونچھ مسکراتا تھا.. شاہد اپنے بن جراب جوگروں پر غور کرتا تھا.. میاں
صاحب سنو ٹراوٗٹ مچھلی کے چانے اتار رہے تھے.. سلمان اور انصاری ایک دوسرے
کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اس طرح کھڑے تھے جیسے کوئی اٹھک بیٹھک والا روسی لوک
رقص شروع کرنے کو ہو..

تو ہم سب موج میں تھے..

زرد گھاس کا الاؤ اب ڈھلتی دھوپ میں اترتی ٹھنڈک میں تھا..

رفیق، میاں صاحب کی مچھلی صفائی کی محویت کے اوپر جھکا کہ وہ مچھلی منڈی
کے کسی بیوپاری کی طرح نہایت مشاقی سے مچھلی صاف کر رہے تھے۔"جناب ادھر
دیوسائی کی ندیوں میں تین قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں.. سلیٹی کلر سنو ٹراوٗٹ.. فلیشی
ماؤتھ ہیڈ سنو ٹراوٗٹ اور ہائی الٹی چیوڈ لوچ... کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ اس مچھلی کی
کونسی قسم ہے جسے آپ صاف کر رہے ہیں؟"

"ہیں..." میاں صاحب نے بیزار ہو کر اوپر دیکھا۔"بھائی میرے ہم مچھلی
کے بیوپاری نہیں ہیں کہ ان کی قسمیں یاد کرتے پھریں.. دیوسائی میں تو صرف تین قسم
کی مچھلی ہوتی ہے ناں، تو لاہور کے موری دروازے کی منڈی میں سینکڑوں قسم کی مل
جاتی ہے.. لیکن مچھلی صرف ایک قسم کی ہوتی ہے... بیسن میں تلی ہوئی مچھلی..."

رفیق، میاں صاحب کی ناواقفیت پر بے حد مایوس ہوا اور کہنے لگا۔"ویسے
آپ یہ تو جانتے ہیں کہ یہ دیوسائی ہمیشہ سے یوں ویران اور یخ بستہ اکلاپے میں نہ تھا.
کہتے ہیں یہاں گاؤں تھے، کھیت تھے اور لوگ تھے.. اب کہیں کہیں چار دیواریوں کے
آثار ملتے ہیں.. کھیتوں کی مینڈھیں گھاس تلے پائی جاتی ہیں.. کسی پرانے قلعے کی چند
اینٹیں بھی ایک چوٹی پر بکھری ہیں.. یہاں بستیاں تھیں..."

صورت حال یکدم بدل گئی.. وہ جو موج میں تھے، ان کے چہرے ایک قدم

سحر کی ناآشنا زرد رنگت میں زرد اور حیرت زدہ ہوئے۔"ہاں.. ہم نے بھی سنا ہے کہ
یہاں آبادیاں تھیں اور پھر کسی بزرگ کی بددعا سے ایک سیلاب میں غرق ہو گئیں اور
موسم بدل گئے..."

ہو سکتا ہے کوئی مقامی طوفان نوح یہاں تک پہنچا ہو..

بڑے پانی کے کناروں پر زرد گھاس ڈھلتی جاتی دھوپ میں اپنی چمک کھو رہی
تھی.. اور ہمارے جوگرز کے اوپر گھاس کے جو تنکے آتے تھے، زردی میں بجھے ہوئے
تیر تھے اور ہم جو موج میں تھے، ایک پل میں ان بستیوں کی اداسی میں چلے گئے جو کبھی
دیوسائی میں تھیں.. اگرچہ یہ قرین از قیاس نہیں لگتا تھا.. دیوسائی کی بلندی تو ہمیشہ سے
اتنی ہی تھی، زیادہ تو نہیں ہوئی تھی اور اتنی بلندی پر آبادی ممکن ہی نہ تھی.. ہو سکتا
ہے کچھ لوگ کسی مجبوری کی وجہ سے یہاں کچھ عرصہ ٹھہرے ہوں اور پھر چلے گئے
ہوں.. یہاں مہر گڑھ یا ہڑپہ کی طرح کوئی آثار نہ تھے.. صرف روایتیں تھیں.. حکایتیں
تھیں کہ یہاں بستیاں تھیں جو اجڑ گئیں.. اور ان کا ماتم کرنے والا کوئی نہ تھا.. کیونکہ
اتنی بلندی پر ماتم کرنے والے کا سانس پھول جاتا ہے اور وہ ماتم ترک کر کے نیچے سکردو
میں اتر جاتا ہے...

"چلئے آپ ہمارے ساتھ کھانا نہ کھائیں، شام کی چائے تو ہماری کیمپ میں
پئیں... اور شام ہو رہی ہے.. آئیے چلیں.."

"تارڑ ریچھ.. سلجوق ریچھ اور سمیر ریچھ وغیرہ"

اور ہم شام کی چائے بڑے پانی کی قربت میں.. ایک زرد شام کی نزدیکی اور ڈھلتی سردی میں وائلڈ لائف کیمپ کے تین وسیع خیموں کے باہر آہنی کرسیوں پر براجمان پیتے تھے..

تقریباً پون کلو میٹر کے فاصلے پر بڑے پانی کے پُل کے پہلو میں ہماری خیمہ بستی دکھائی دے رہی تھی اور کچن ٹینٹ میں سے اٹھنے والا دھواں دیوسائی کی سرد فضا میں ٹھہرا ہوا لگتا تھا..

آزمند، جنہوں نے ہمیں دیوسائی ٹاپ تک اپنی جیپ میں لفٹ دی تھی، یہاں نہ تھے، سکردو واپس جا چکے تھے۔

اسی کیمپ سے ذرا ہٹ کر ایک جیپ کھڑی تھی اور اس کے نیچے کوئی صاحب بار بار کروٹیں بدلتے تھے اور صرف ان کا ہاتھ باہر آتا تھا اور ایک پورٹر کبھی اس ہاتھ میں کوئی پیچ کس رکھ دیتا تھا اور کبھی کوئی اور اوزار...

وائلڈ لائف والوں کا کیمپ... ایک کچن ٹینٹ اور سٹور... دو رہائشی خیمے.. ذرا فاصلے پر ایک مستطیل ٹائلٹ ٹینٹ... ان کے آگے اٹھنے بیٹھنے کے لیے ایک صاف ستھرا علاقہ.. اور ایک بلند بانس پر ایک تھکا ہوا پاکستانی پرچم جو بلندی کی وجہ سے ہانپتا تھا اور سہارے کے لیے بار بار اپنے مستول سے لپٹ جاتا تھا..

تھوڑی دیر بعد وہ صاحب جو جیپ کے پیٹ تلے اس طرح لیٹے ہوئے تھے جیسے سمندر کی تہہ میں ایک کیکڑا اپنے اوپر سے گزرتی سب میرین کے پیٹ کو حیرت سے دیکھتا ہے، باہر آئے.. کپڑے جھاڑ کر انہوں نے جیپ کی چابی گھمائی.. اور قدرے ڑُڑُ اور ٹھُس ٹھُس کرنے کے بعد اس کے انجن نے چالو ہو کر دیوسائی میں اترتی شام میں غدر مچا دیا.. انہوں نے دو چار بار انجن کو ریس دے کر بند کیا اور فاتحانہ انداز میں ہاتھ ملتے جیپ سے اتر آئے اور سامنے نگاہ کی..

اور ان کی نگاہ نے پوری مخلوق میں سے صرف مجھ پر زُوم اِن کیا اور وہ ہاتھ پھیلائے تیر کی طرح میری جانب لپکے.. ایک نیم سفید ریش کے مالک خوش شکل اور سنہری رنگت والے صاحب میری جانب ہاتھ پھیلائے مسکراتے آتے تھے.. تب یکدم ان کی بے قابو مسکراہٹ میں کھلا چہرہ سنجیدہ ہوا، انہوں نے ہاتھ نیچے کئے اور میری بجائے پرچم کے مستول تلے جو میز رکھی تھی اس کی جانب لپکے..

وہاں میز پر ایک بے ہودہ سے کلّے پر سختی سے لپٹی.. ستے اور بھڑکیلے کپڑے میں لپٹی طرّے دار پگڑی کو اٹھایا اور اپنے سر پر فِٹ کر لیا.. یہ اُسی قسم کی پگڑی تھی جو ڈبّی بازار یا شاہ عالمی میں فرسٹریٹڈ اور بے چین دولہوں کے سروں پر فوری طور پر سجانے کے لیے ریڈی میڈ دستیاب ہوتی ہیں..

انہوں نے پگڑی سر پر فِٹ کی اور پھر پہلے والی پوزیشن میں آ گئے.. ہاتھ پھیلائے اور میری جانب لپکے..

"یہ کون ہیں؟" میں نے فوراً رفیق سے پوچھا۔

"یہ آپ کی جیپ کے ڈرائیور ہیں، عبدالصمد خان آف استور..."

اتنی دیر میں خاں صاحب ایک تیر کی طرح میرے نشانے پر وارد ہوئے اور مجھے گلے سے.. تقریباً زبردستی لگا لیا اور اتنی دیر تک لگائے رکھا کہ حاضرین کو ان کی نیت پر شبہ ہونے لگا.. میں نے بمشکل انہیں اپنے آپ سے الگ کیا.. دیوسائی کے کسی ریچھ

کے ''چھے'' سے نجات حاصل کرنا یقیناً نسبتاً آسان ہو گا..

''یار ادھر سکردو میں نجف نے بولا کہ اُدھر منی مرگ جا کر ایک پسنجر کو اٹھاتا ہے تو ہم نے بولا.. دفع کرو ہم اپنی ملازمت سے چھٹی نہیں کر سکتا.. وہ بولا... پسنجر.. ٹیلی ویژن والا تارڑ ہے تو ہم نے اس کا منہ چوم لیا کہ ہم تو ابھی ملازمت سے استعفیٰ دیتا ہے اور ادھر اپنے معشوق سے ملنے جاتا ہے...''

''معشوق'' کے اس خطاب پر میرے ساتھیوں نے مسکراتے ہوئے میرے جانب دیکھا اور جب دیکھا تو ایک عمر رسیدہ سفید بالوں والے شخص کو دیکھا جسے کوئی فاتر العقل شخص... یا جھیل کرومبر یا شاہ گوری یا.. ایک خان صاحب ہی ''معشوق'' قرار دے سکتے تھے.. میں اپنی کرسی پر بیٹھنے کو تھا کہ خاں صاحب پھر بے قابو ہو کر بولے۔ ''یار اپھر گلے ملو..''

میں تھوڑا سا ہراساں ہوا.. تھوڑا سا فلیٹر بھی ہوا کہ اس عمر میں بھی قدردان موجود ہیں لیکن میں دوبارہ ان سے گلے ملنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کیونکہ وہ تادیر گلے لگائے رہتے تھے.. ''ایک ہی بار کافی ہے..''

لیکن ان کا جوش ٹھنڈا نہ ہوا۔ ''یار آپ ٹیلی ویژن پر آتے ہو تو...''

اور ان عبدالصمد خان آف استور کو میرے ابروؤں کی ہر جنبش.. ہاتھوں کی حرکت، اونچے دانتوں کی مسکراہٹ اور ٹیلی ویژن پر باتیں کرتے ہوئے میرے بائیں جانب جھکاؤ کے بارے میں ہر تفصیل یاد تھی اور پسند تھی..

کسی مشہور مصنف نے کہا تھا کہ اگر انسان میں تھوڑا سا تخلیقی جوہر موجود ہو اور پھر وہ خوش نصیب ہو تو وہ اپنے حصّے کے بے وقوف پیدا کر لیتا ہے.. ایسے بے وقوف جنہیں تمہاری تحریر کے سوا اور کچھ اچھا نہیں لگتا.. وہ تمہاری تحریر کے رسیا اور نشئی ہو جاتے ہیں..

اور یہ خاں صاحب بھی ایک ایسے ہی بے وقوف تھے.. لیکن میری تحریر کے

نہیں.. ٹیلی ویژن پر میری تصویر کے..

سلمان نے میرے کان میں سرگوشی کی ''سر جی.. اپنے دفاع کا مکمل انتظام کر لیں.. اگر ایک خان صاحب آپ پر لٹو ہو جاتے ہیں تو بے عزتی خراب ہو سکتی ہے.. ذاتی تجربے سے کہہ رہا ہوں..''

بہر حال میں نے خاں صاحب کے ساتھ تھوڑی سی بے رُخی برتی اور سنجیدگی سے چائے پینے میں محو ہو گیا..

چائے کا آخری گھونٹ بھرا ہے تو ریچھ آ گئے..

اس لیے کہ رفیق راجپوت ایک عرصے سے پَر تول رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ریچھوں کا تذکرہ شروع ہو جائے.. اس کی حیاتی میں اہم ترین شے ریچھ تھے.. مجھے یقین ہے کہ جب اس نے اپنی دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا ہو گا تو وہاں ایک خوبصورت خاتون کو پا کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا ہو گا کیونکہ وہ سرخ جوڑے میں ملبوس ایک دیوسائی کی ریچھنی کی توقع کر رہا ہو گا..

رفیق نے ایک شاٹ گن اٹھائی اور اس میں ایک گولی کی بجائے ایک کیپسول جوڑ کر کے مجھے تھما دی۔ ''تارڑ صاحب ہم دیوسائی میں گھومتے ہیں اور جب کوئی ریچھ دکھائی دے جائے تو اس کا پیچھا کرتے ہیں... کبھی پیدل، کبھی ہیلی کاپٹر پر اور کبھی جیپ پر اور پھر جب وہ ہماری زد میں آتا ہے تو اس گن سے اسے شوٹ کرتے ہیں.. اس کیپسول میں بے ہوش کر دینے والا مادہ ہوتا ہے اور ریچھ شوٹ ہونے کے کچھ لمحوں بعد لڑکھڑا کر گر جاتا ہے..'' وہ ہاتھ اٹھا کر ایک ڈرامائی انداز میں بولا.. ''جیسے جولیس سیزر نے رومن اسمبلی میں ہاتھ اٹھا کر فرینڈز.. کنٹری مین اور رومنز کہا تھا۔ ''تارڑ صاحب.. حاضرین.. ان چند لمحوں میں جب ریچھ بے ہوش ہونے والا ہوتا ہے.. وہ انتہائی خطرناک ہو جاتا ہے.... اور اگر ہم پیدل ہوں تو پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ شوٹ کرنے کے بعد ہم اپنے بچاؤ کے لیے کونسے ٹیلے کی آڑ میں ہو جائیں گے..''

"اس بے گناہ مخلوق کو آپ کیوں گولیاں مارتے ہیں.. توبہ توبہ.." شاہد نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "بڑا گناہ ہوتا ہے۔"

"سوری سر.. گولی نہیں مارتے.."

"آپ نے شُوٹ کا لفظ استعمال کیا ہے.. ہمیں بھی انگلش آتی ہے۔"

"کیپسول سے شُوٹ کرتے ہیں سر... اور جب ریچھ مکمل طور پر بے ہوش ہو جاتا ہے.. تو ہم اس کے گلے میں یہ کالر ڈال دیتے ہیں۔" رفیق راجپوت نے ایک ایسے کالر کی نمائش کی جو عام طور پر ریڑھ کی ہڈی کے مریض اپنے گلے میں لگاتے ہیں۔ "اور اس کالر میں ایک چھوٹا سا ریڈیو ٹرانسمیٹر نصب ہوتا ہے.. یہ دیکھیں.... اور پھر ریچھ ہوش میں آنے لگتا ہے تو ہم اسے آزاد کر کے کیمپ میں واپس آجاتے ہیں.. اور یہاں بیٹھ کر ہم اس ریچھ کی موومنٹ کا حساب کتاب رکھتے ہیں کہ.. وہ ایک دن میں کتنا سفر کر رہا ہے.. کہاں گیا ہے.. اگر بہت دیر تک ایک جگہ بیٹھا ہوا ہے تو کہیں بیمار تو نہیں.. کہیں ایسے علاقے میں تو نہیں چلا گیا جہاں غیر قانونی شکاری اس کی تاک میں ہیں.. اور جب برفوں کا آغاز ہوتا ہے تو وہ کن راستوں پر چلتا ہوا اپنی سرمائی نیند پوری کرنے کے لیے کونسی غاروں میں جاتا ہے.."

"یہ کالر تو ذرا دکھائیے.." سلمان نے کہا..

"دیکھئے.." رفیق نے اشتیاق سے کالر اسے تھما دیا..

سلمان نے کالر اپنے گلے کے گرد فٹ کیا تو وہ ذرا ڈھیلا تھا۔ "شکریہ میرے سائز کا نہیں۔"

"تو ریچھ کونسی غاروں میں جاتا ہے رفیق صاحب؟" حسن صاحب اپنی بیگم کو بھول کر اب ریچھوں میں دلچسپی لینے لگے تھے..

"ہمالین براؤن بیئر اکتوبر کے وسط میں دیوسائی سے اتر کر شیلا کے علاقے میں جو غاریں ہیں، ان میں جا کر سوتا ہے۔"

"کتنی دیر کے لیے سوتا ہے؟" خالد نے فوراً پوچھا۔

"وہ اپریل کے مہینے تک.. جب برف پگھلنے لگتی ہے اور دیوسائی میں پہلی ہریاول پھوٹتی ہے تب تک مسلسل سوتا رہتا ہے۔"

"اور چھ مہینے سوتا رہتا ہے؟"

"جی ہاں..."

"کھاتا پیتا کچھ نہیں.." خالد ندیم پریشان ہو گیا..

"نہیں..."

"بھوکا رہتا ہے.. اس کے پیٹ میں گُڑگُڑ نہیں ہوتی.. زندہ کیسے رہتا ہے؟"

"اس کی کھال کے نیچے چربی کی جو دبیز تہہ ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ پگھلتی رہتی ہے اور خوابیدہ حالت میں اسے توانائی دیتی ہے اور زندہ رکھتی ہے.. اور جب وہ چھ ماہ کی نیند کے بعد موسم بہار میں شیلا کی غاروں سے باہر آتا ہے تو قابل فہم طور پر بے حد ناتواں ہوتا ہے اور اتنا کمزور ہو چکا ہوتا ہے کہ اسے چلنے میں بھی دشواری ہوتی ہے.. یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اسے ہماری طرف سے دیکھ بھال کی اشد ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اسے کوئی بھی شکاری آسانی سے مار سکتا ہے۔"

"نہ یہ تو حرام ہے.. سائیں.." انصاری بولا۔ "اس کے شکار کا فائدہ؟"

رفیق ذرا شرما گیا۔ "سر... میرے پاس کچھ تصویریں ہیں.. اب آپ نے پوچھا ہے تو میں دکھا دیتا ہوں.."

اس نے ہمیں کچھ تصویریں دکھائیں جو ہمارے لیے تو ایک معمہ تھی.. یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس شے کی ہیں۔

"جناب پاکستان میں اور خاص طور پر دوست ملک چین میں کچھ حکیم حضرات ہیں جو ریچھ کی چربی کو کُشتوں میں استعمال کرتے ہیں.. اور اس غریب کا وہ حصہ جو نسل بڑھانے کے کام آتا ہے، اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرتے ہیں کیونکہ ان کی تحقیق کے

مطابق اس کا سفوف پھانکنے سے ستر برس کا بوڑھا بھی ٹن ٹن کرنے لگتا ہے.. اس لیے ریچھ کو مارتے ہیں..''

اس شہوت انگیز انکشاف نے سب سے زیادہ مجھے پُرامید کیا.. کہ ابھی کچھ ریچھ باقی ہیں جہاں میں..

''آپ نے اُدھر ہماری خیمہ بستی میں فرمایا تھا کہ رات کے کھانے پر.. ریچھ یہاں بھی آتا ہے۔ آپ کے کیمپ میں..؟''

''بالکل آتا ہے...'' رفیق اپنی آہنی کرسی سے اٹھا.. ذرا چہل قدمی کی.. زمین کو غور سے دیکھتے ہوئے.. اور پھر ایک بظاہر عام سے گوبر کو ایک پیس آف آرٹ کی طرح احتیاط سے سنبھالتا ہمارے پاس واپس آ گیا۔ ''یہ دیکھئے جناب.. یہ ہمالین بیئر کی ڈراپنگ ہے۔''

انصاری... ہنسنے لگا اور سلمان کے فربہ زانو پر ایک تھپڑ لگا کر کہنے لگا۔ ''رفیق صاحب.. لِید کا یہ جو گولہ سا ہے تو کسی بھینس یا گائے کا بھی تو ہو سکتا ہے..''

''بھینس یا گائے تو ادھر زندہ نہیں رہ سکتیں جناب..'' رفیق نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ذرا یہ دیکھئے..'' اس نے لِید کو نہایت احتیاط سے انار کی طرح دو ٹکڑے کیا۔ ''یہ دیکھئے، اس میں وہ گھاس ابھی تک موجود ہے جو ریچھ نے کھائی تھی اور جناب یہ موٹی لید ہے۔ دوسرے تمام جانوروں کی لِید اتنی گھنی نہیں ہوتی.. باریک ہوتی ہے۔''

حضرات... جمائیاں لینے لگے.. آخر ریچھ گفتگو کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے..

اور میں اس انتظار میں رہا کہ رفیق راجپوت ریچھ کی چربی اور اس کے خصوصی حصّوں کی مزید نشر و اشاعت کر کے میری خوابیدہ امنگوں کو پھر سے جگا دینے والے کسی نسخے.. کسی کُشتے کا ذکر کرے گا... لیکن وہ ظالم یہ رستہ ہی بھول گیا.. اور یکدم چپ بھی ہو گیا..

اس لیے چپ ہو گیا.. کیونکہ بڑے پانی کے کناروں پر چلتا ایک بلند قامت

شخص.. کاؤ بوائے ہیٹ تلے ایک ہینڈسم چہرہ لیے شخص کیمپ کی طرف آتا تھا.. اس کے چہرے پر سفر کی دھول نہ تھی۔ اگرچہ وہ ایک طویل مسافت کے بعد یہاں پہنچا تھا.. اس لیے کہ دیوسائی کی بلندیوں پر جہاں سے وہ اترا تھا، دھول نہ تھی.. اس کی کاؤ بوائے لاپروائی کے پیچھے پیچھے ایک پورٹر تھا جس کی کمر پر ایک سرخ رنگ کا رُک سیک لدا ہوا تھا..

وہ قریب آیا تو رفیق کھڑا ہو گیا.. ''جناب یہ.. حلیم صاحب ہیں.. ہمارے پروجیکٹ منیجر.. اس کیمپ کے انچارج... دو روز کے لیے دیوسائی کے پہاڑوں اور وادیوں کے اندر گئے ہوئے تھے تا کہ نئے ریچھوں اور عقابوں وغیرہ کو دریافت کر سکیں۔''

اس کا چہرہ ذرا بجھ سا گیا جیسے کسی بھی افسر کو دیکھ کر ایک ماتحت کا چہرہ بجھ جاتا ہے۔

حلیم.. ہالی وڈ کی کسی فلم میں سے.. کسی کاؤ بوائے بار میں سے.. شائد ہیمنگوے کے ناول ''سنوز آف کلی منجاروز'' کے گریگوری پیک میں سے.. ڈیمی مور کے ''اِن ڈیسنٹ پروپوزل'' کے رابرٹ ریڈ فورڈ میں سے.. ان کے کسی خواب میں سے باہر آ رہا تھا.. اور ہماری جانب چلا آ رہا تھا..

ذرا لمبوترا چہرہ.. دراز قد.. ایک جین میں کسا ہوا.. کوہ پیمائی کے بوٹوں میں جکڑا ہوا.. ایک کاؤ بوائے ہیٹ میں.. ایک سفید ٹی شرٹ میں.. جس پر دیوسائی کا ایک ریچھ بنا ہوا تھا..

میرے ہاتھوں میں ابھی تک ریچھوں کو بے ہوش کرنے والی شاٹ گن تھی.. اگر ریوالور ہوتا تو میں اسے اپنی انگلیوں میں گُھما کر... ہونٹ ٹیڑھے کر کے.. اسے دعوت مبارزت دیتا... ڈرا...

اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوہستانی سفر کی بدن دکھانے والی مشقت کے باوجود.. اور وہ تھکا ہوا تھا.. جب اس نے دور سے اپنے کیمپ میں ''غیر ملکیوں'' کی رونق دیکھی تھی تو وہ خوش ہو گیا تھا۔

جیسے صحرا کے اندر ایک ویران کارواں سرائے ہو..

یا خان پور ڈیم کے کنارے وہ حویلی ہو.. جسے اس کے مکین چھوڑ چکے ہوں..
اس لیے کہ ڈیم کے پانی اونچے ہو کر اس کے درودیوار کو مسمار کر رہے ہوں اور اس کی
بلند چھتوں، رنگین شیشوں کے اور گل بوٹوں سے مزین آتش دانوں کے ڈھے جانے
کے دن قریب ہوں تو ویران حویلی کی کسی کھڑکی میں سے ایک کشتی نظر آئے.. تو اس
حویلی کے درودیوار خوش ہوتے ہیں کہ کوئی تو آیا.. اس ویرانے میں کوئی تو آیا..

ایسے.. حلیم کا چہرہ خوش تھا..

اس نے اپنا مختصر رُک سیک اتارا! کاؤبوائے ہیٹ اتار کر اپنے گھنے بالوں کو
جھٹکا.. اور مسکرانے لگا..

تعارف کے بعد اس نے اپنے سفر کے قصے بیان کیے.. اور ہم نے اپنے.. اس
کے قصوں میں کچھ نئے ریچھ اور عقاب تھے اور ہمارے قصوں میں برجی لا کی برفباری
اور دیوسائی کی رات میں گمشدگی تھی...

"میں اوپر گیا تھا.. سِگدنالے کے ساتھ ساتھ.. اور میں نے ایک بڑی تنہائی
اور تاریکی میں.. دیونوٹھک کی چوٹی پر رات بسر کی تھی... دیونوٹھک کا مطلب ہے.. وہ
چوٹی جس پر دیو رہتے ہیں.."

"کسی دیو سے بھی ملاقات ہوئی؟"

"نہیں.." حلیم اپنے بوٹ اتارتے ہوئے ذرا مسکرایا۔ "لیکن میرا یہ سفر
رائیگاں نہیں گیا.. میں نے تین آئی بیکس سپاٹ کیے.. میں نے ایک بہت بڑا کرگس
دیکھا جو ایک ہڈی میں سے گودا نکال کر کھا رہا تھا.. اور دو نئے ریچھ دیکھے.."

"سر.. نئے ریچھ.." رفیق جو بجھا ہوا تھا، آتشِ شوقِ ریچھاں میں جل اٹھا۔

"بالکل انجانے اجنبی اور برینڈ نیو بیئر؟"

"ہاں وہ دونوں ہمارے ریکارڈ پر موجود نہیں تھے.. بالکل نئے.."

"مبارک ہو سر..." رفیق نے مسرت سے مغلوب ہو کر ہاتھ ملے.. "اور
کس کس سے ملاقات ہوئی؟"

"پرانے ریچھوں میں سے پانچ چھ کے ساتھ دوبارہ ملاقات ہوئی.."

"آپ نے آگے بڑھ کر ان سے دست پنجہ لیا.. گلے ملے.. کیسے ملاقات
ہوئی.." خالد ندیم بے حد ایکسائیٹ ہو رہا تھا..

"میں نے انہیں بہت دور سے دیکھا.. اور انہیں پہچان لیا کہ وہ پرانے ریچھ
ہیں اور ہمارے ریکارڈ پر ہیں.."

دیوسائی کی سرد شام میں گھاس کی زردی مدھم پڑتی جاتی تھی اور پہلی بار بڑے
پانی کے بہاؤ کا شور سنائی دینے لگا تھا..

"تارڑ صاحب.. آپ بہت دیر سے اس شاٹ گن کو تھامے بیٹھے ہیں.. اسے
فائر کریں..." رفیق کہنے لگا..

میں نے شاٹ گن کا رخ سلمان کی جانب کر دیا...

"نہ نہ.. سر جی میں تو آپ کا اپنا پرائیویٹ ریچھ ہوں۔ بھلا مجھے بے ہوش
کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے بندوق کی نالی پرے کرتے ہوئے کہا اور پھر یہ
ثابت کرنے کے لیے کہ وہ ہمارا من پسند اور پیارا ریچھ ہے.. اپنی کرسی سے اٹھا اور
مسخری کرتا ہوا.. اور ہو ہو کرتا ہوا ایک مختصر ریچھ ناچ پیش کرنے لگا..

ہم سب ہنسنے لگے اور اسے بیٹھ جانے کے لیے کہا..

رفیق پر ان مسخریوں کا کچھ اثر نہ ہوا.. وہ اپنے ریچھوں میں ہی قید رہا اور مجھ
سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "سر.. ذرا ادھر دیکھیں.. ہم نے نشانہ پکانے کے لیے وہ
سامنے ایک بورڈ آویزاں کر رکھا ہے جس پر ایک گول دائرے کا ٹارگٹ بنا ہوا ہے..
آپ اسے نشانے میں لا کر فائر کریں.. ذرا کوشش کریں سر..."

وہ ٹارگٹ ہم سے تقریباً بیس میٹر کے فاصلے پر ایک خالی ڈرم پر آویزاں تھا..

میں نے ایک آنکھ میچ کر شاٹ گٹ کی دوربین میں دیکھا.. ایک پھرکی
گھمائی اور ٹارگٹ فوکس میں آگیا.. میں نے لبلبی دبادی.. ایک دھچکا لگا اور دوربین کے
اندر جو سرخ دائرہ دکھائی دیتا تھا، وہ اوندھا ہو کر گر گیا..

اس ٹارگٹ کے گرنے سے راستہ صاف ہوا اور دیوسائی کی شام میں جو زرد
گھاس کا پھیلاؤ اب بجھتا تھا، وہ سارا کا سارا فوکس میں آگیا..

اگر اس ٹارگٹ کی بجائے میرے سامنے ایک ریچھ ہوتا تو وہ بھی اسی طرح
اوندھا ہو کر گر جاتا..

یہ محض ایک مفروضہ تھا..

جیسے فوج کی مشقوں میں نو آموز سپاہی بُھس بھرے پُتلوں کے بدن میں
سنگینیں اتار کر یہ سمجھیں کہ دشمن کا بدن بھی اتنا ہی آسان ہو گا..

اپنے کیمپ میں بیٹھے ہوئے ایک ٹارگٹ کو ہِٹ کرنا ایک کھیل تھا.. اور
دیوسائی کی بڑی ویرانی کے اندر جا کر ایک بھورے ہمالیائی ریچھ کو نشانہ بنانا ایک سنجیدہ
اور خطرناک کاروبار تھا... اس لیے کہ جب ایک آزاد اور بے خوف جانور آپ کے
سامنے آتا ہے تو اس کی تمام تر دہشت اور درندگی آپ کے بدن میں بھی در آتی ہے
اور بندوق کی لبلبی پر جمی انگلی لرزنے لگتی ہے.. آنکھوں کے آگے ستارے ناچنے لگتے
ہیں.. اور آپ ستاروں کے ناچ میں مبتلا ہو کر کانپنے لگتے ہیں اور اتنی دیر میں وہ جانور
جست لگا کر آپ کو شکار کر لیتا ہے..

حلیم.. استور کا رہنے والا تھا.. ایک اہم اور معروف خاندان کا فرد تھا..
خاندان کا چشم و چراغ اس لیے نہیں کہوں گا کہ یوں لگتا ہے جیسے موصوف کی ایک چشم
ہے اور دوسری چراغ ہے.. ایک عرصے سے اسلام آباد میں رہائش رکھتا تھا.. قائد اعظم
یونیورسٹی سے ایم فِل کی ڈگری حاصل کی.. بلیو ایریا کی ڈالروں سے بھری ملازمتوں کی
بجائے اپنے علاقے میں لوٹ آنے کا گھاٹے کا سودا کیا.... اور کوئی پچھتاوا نہ تھا..

"تارڑ صاحب.. یہ میرا وطن ہے.. اسلام آباد میرا شہر ہے.. اور اس میں بہت
کشش ہے.. لیکن ادھر بڑا پانی کے کنارے جب ہمارے کیمپ میں شام اترتی ہے تو ایک
لالٹین کی روشنی میں.... میں دن بھر کی روئداد لکھتا ہوں.. آج میں نے کون سے جانور
دیکھے.. ان کی کونسی عادتیں نئی تھیں... وہ دیوسائی کے ویرانے میں کیسے ملتے تھے..
کیسے حرکت کرتے تھے.. اپنے بچّوں کے ساتھ ان کا کیا روّیہ تھا.. ان کے ساتھ یہ کیسے
کھیلتے تھے.. اگرچہ میں یہاں بہت تنہا ہوتا ہوں.. اور رات کے وقت اپنے سلیپنگ
بیگ میں لیٹا اپنے اسلام آباد اور اپنے دوستوں کو بہت مِس کرتا ہوں... لیکن یہ میرا
وطن ہے.. اگر میں اس کے قدرتی حُسن اور اس حُسن میں حرکت کرتے ہوئے.. ان
جانوروں.. پرندوں.. مچھلیوں.. زمین پر رینگنے والے جانوروں کا تحفظ نہیں کروں گا..
تو اور کون کرے گا... کیونکہ میرے لوگوں کو تو یہ احساس نہیں.. وہ نہیں جانتے کہ
ایک روز یہ سب کے سب ختم ہو جائیں گے اور ان کے حوالے اور تصویریں صرف
تحقیق کی کتابوں میں رہ جائیں گے... اسی لیے میں نے اپنے پی ایچ ڈی کے تھیسِس
کے لیے.. براؤن ریچھ کو چنا ہے اور شائد مجھ سے پیشتر دنیا میں کسی اور نے اس
موضوع کا انتخاب نہیں کیا.."

بڑے پانی.. جو وائلڈ لائف کیمپ کے پہلو میں رواں تھے.. وہاں سے آرہے
تھے جہاں ایک پل کے پہلو میں دھوپ ڈھلتی تھی اور مزید زرد ہو کر ہماری خیمہ بستی کو
ایک ڈھلتے ہوئے سحر میں مبتلا کرتی تھی..

بڑا پانی.. ایک سرحد تھا..

ادھر کا دیوسائی.. جہاں سے ہم آئے تھے.. سکردو میں تھا.. اور ادھر جو دیوسائی
تھا.. بڑا پانی کے پار.. جدھر ہم نے جانا تھا.. وہ استور کے علاقے میں تھا..

"اور ہاں... کیا رفیق نے آپ کو دیوسائی کے ریچھوں کے بارے میں کچھ بتایا
ہے؟" حلیم نے نہایت سادگی سے سوال کیا..

"کچھ بھی نہیں بتایا جی..." سلمان بولا۔ "انہوں نے تو ریچھوں کا نام تک نہیں لیا.... حالانکہ ہم ریچھوں میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں.."

"رئیلی؟" حلیم حیران ہوا اور میں نے دیکھا کہ رفیق کا چہرہ اتر گیا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو بڑے مزے سے جھوٹ بول رہے ہیں اور مجھے صاحب کے سامنے شرمندہ کر رہے ہیں..

"نو.. ناٹ رئیلی.." میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "رفیق نے ہمیں دیوسائی کے ریچھوں کے بارے میں اتنا کچھ بتایا ہے کہ ہم آسانی سے ایک ریچھ انسائیکلوپیڈیا لکھ سکتے ہیں۔"

"ویسے تارڑ صاحب... کیا آپ پہلے سے ریچھوں کے بارے میں کچھ جانتے تھے؟"

"صرف یہی... کہ میں جب مال روڈ لاہور پر لکشمی مینشن کے فلیٹ نمبر 17 میں رہائش پذیر تھا اور اپنی معصومیت کھو رہا تھا تو اکثر جنرل پوسٹ آفس کے سامنے والی عمارت پر ایک بہت بڑا سائن بورڈ دیکھتا تھا.. اس پر جلی حروف میں "مری بیئر از دی بیسٹ" آویزاں نظر آتا تھا.. اور یہ سائن بورڈ ہماری چھت پر سے بھی دکھائی دیتا تھا اور سکول جاتے ہوئے بھی ہم اسے غور سے پڑھتے تھے.. اور میں ہمیشہ حیران ہوتا تھا کہ مری کا ریچھ ہی کیوں بہترین ہوتا ہے.. میاں چنوں یا کالا شاہ کاکو کا ریچھ کیوں بہترین نہیں ہوتا.... اسی طرح انگلستان میں بھی اکثر مقامات پر "چلڈ بیئر از دی بیسٹ" کا ترجمہ بھی منجمد ریچھ ہی بہترین ہوتا ہے، کرتا تھا.. یہ تو بہت بعد میں کھلا یہ جناب یہ ریچھ کسی اور ٹائپ کا ہے اور جَو کے پانی سے تخلیق ہوتا ہے اور ذائقے میں قدرے تلخ ہوتا ہے اور اگر آپ کی مونچھیں ہیں تو ان پر جھاگ کی صورت میں براجمان ہو جاتا ہے اور یہ BEAR نہیں BEER ہے.."

حلیم ہنسنے لگا۔ "خیر آپ اتنے بھولے بھی نہیں ہو سکتے.."

"یقین کریں ایک زمانے میں ہم اتنے ہی بھولے تھے.. ہمارا عہد ہی بھولپن کا تھا۔

"بہر حال ادھر کا جو بیئر ٹھنڈا اور منجمد ہونے کو ہوتا ہے تو وہ فوراً شیلا کی باروں میں جا کر نیند میں گم ہو جاتا ہے.."

"میں نے بتایا ہے سر.." رفیق فوراً بولا.. اور ذرا اٹینشن ہو گیا..

"کیا آپ نے.." حلیم، رفیق سے مخاطب ہوا۔ "دیوسائی کے چھبیس ریچھوں کا تارڑ صاحب سے تعارف کروایا ہے؟.."

"نہیں جی.." میں نے فوراً کہا۔ "حرام ہے جو کسی ایک ریچھ سے انہوں نے ملاقات کروائی ہو.. اور کسی ایک ریچھ نے اپنی دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہو کر... ہاؤ ڈو یو ڈو تارڑ صاحب کہا ہو.."

حلیم نے میرے اس فنّی کومنٹ کو در گزر کیا کیونکہ وہ اب تک جان گیا تھا کہ ہم مسخرہ لوگ ہیں۔ "سر.. پورے دیوسائی پر صرف چھبیس ریچھ باقی بچے ہیں.. جو ہمارے ریکارڈ پر ہیں.. اور ہم ان کا خیال رکھتے ہیں.. ان کا پیچھا کرتے ہیں.. اور ہم نے ہر ریچھ کو نام دے رکھا ہے.. ان میں سے اہم ترین کا نام "بگ بوائے آف کالا پانی" ہے.. یہ بگ بوائے کالا پانی کی ندی کے آس پاس رہتا ہے.. اگر آپ کل گُل تری روڈ پر بُنی مرگ کی جانب جائیں گے تو یہ عین ممکن ہے کہ وہ آپ کو کسی ویران گھاس کے میدان میں لڑھکتا نظر آ جائے.. پھر "بگ بوائے آف بڑا پانی" بھی ہے..."

"سر میں نے ابھی ابھی تارڑ صاحب کو اس کی ڈرائنگ دکھائی ہے.." رفیق نے فوراً کہا..

"جی ہاں یہ ریچھ رات کے وقت ہمارے کیمپ کا چکر بھی لگاتا رہتا ہے.. اور پھر ایک "سٹیمپ بوائے آف کالا پانی" ہے.. اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ پاکستان پوسٹل ڈیپارٹمنٹ نے جنگلی حیات کے بارے میں جو ٹکٹ جاری کیے تھے، ان میں سے ایک پر اسی ریچھ کی تصویر ہے.. مشہور ریچھ ہے۔"

"اچھا اچھا.. ہمارے لیڈر تارڑ صاحب کی طرح.. ایک سلیبرٹی ہے.. مشہور

شخصیت ہے..''

میرے ایک بدتمیز ساتھی نے... اور میرا کونسا ساتھی تھا جو بدتمیز نہ تھا. لقمہ دیا..

''نہیں صاحب..'' حلیم بدستور سنجیدہ تھا.. ''ہم بھلا ایک ریچھ کا تارڑ صاحب سے کیونکر مقابلہ کر سکتے ہیں..''

''ویسے کروا کے دیکھیں.. ریچھ ہار جائے گا..''

''اور جناب ان بہت بڑے بھالوؤں کے علاوہ ایک اور بھالو ہے جو ہمیں بہت مرغوب ہے.. اور یہ حقیقت ہے کہ جس دن وہ نظر آ جائے، وہ دن بہت اچھا گزرتا ہے.. وہ شیطان نمبر ایک کہلاتا ہے..''

''یہ کس نے پکارا سویرے سویرے..'' انصاری چونک گیا..

''واہ جی حلیم صاحب... اس دنیا میں ریچھوں کے سوا رکھا ہے..'' شاہد نے داد دی۔ ''لیکن آپ تو ذاتیات پر اتر آئے ہیں..''

لیکن حلیم صاحب اب لاپروا اور بے پرواہو چکے تھے اور ریچھ بخار میں رفیق سے بھی آگے جا چکے تھے۔ ''تو یہ شیطان نمبر ایک نہایت شوخ اور چنچل ریچھ ہے.. کبھی سامنے آ جائے تو مسخری کرتا ہے.. کرتب دکھاتا ہے اور اداکاری کرتا ہے۔''

''ہمارا لیڈر.. ہمارا لیڈر..'' بدتمیز ساتھیوں نے شور مچا دیا..

''اسی طرح ایک اور ریچھ ''شیطان نمبر دو'' کہلاتا ہے.. یہ ذرا پاگل ہے اور اس کا کوئی اعتبار نہیں کہ کسی ایک وقت میں بہت فرینڈلی ہو گا اور پھر فوراً خطرناک ہو جاتا ہے.. اور جناب نہایت دل پھینک اور فلرٹ قسم کا ریچھ ہے...''

''ہمارا لیڈر.. ہمارا لیڈر..'' پھر شور مچ گیا..

''اس شیطان نمبر دو کا علاقہ وہ ہے جو کالا پانی اور بڑا پانی کے عین اوپر ہے؟ پھر ایک بھوت ریچھ ہے، اس لیے کہ وہ کم نظر آتا ہے اور جب نظر آتا ہے تو یکدم کہیں

سے ظاہر ہو جاتا ہے.. اور ''چالاک ریچھ'' ہے صرف اس لیے کہ اس ریچھ کو ہم آج تک اپنی گن کا نشانہ نہیں بنا سکے.. ہمیشہ جُل دے جاتا ہے.. اور ہاں دیوسائی میں ایک میگی بھی گھومتی ہے..''

''کس کے ساتھ گھومتی ہے؟''

''میگی یعنی پرنسس مارگیٹ....''

''نہیں.. اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ریچھنی..''

''جناب عالی اب ریچھنیوں کا تذکرہ ہی چلتا رہے تو مناسب ہو گا..'' میاں صاحب نے پہلی بار دلچسپی لی.. یہ امر حیرت ناک ہے کہ ''یاک سرائے'' کے سفر کے دوران بھی وہ یاکوں میں نہیں یاکنیوں میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے..

''ایک ریچھنی کا نام... جولی آنٹی ہے۔''

''ہماری بھی آنٹی ہیں..'' انصاری نہایت انکساری سے بولا۔ ''سر جی بزرگوں کا احترام لازم ہے.. لیکن یہ آنٹی کیوں ہیں؟''

''اس لیے کہ نہایت عمر رسیدہ ہیں..''

''ہمارا لیڈر.. ہمارا لیڈر..'' پھر شور بپا ہو گیا..

''یہ جولی آنٹی پورے اٹھائیس برس کی ہیں.. ایک ریچھ یا ریچھنی کے لیے یہ نہایت طویل عمر ہوتی ہے.. ہم ان کا بہت احترام کرتے ہیں اور بہت خیال رکھتے ہیں کہ وہ ادھر اُدھر بھٹک نہ جائیں.. کسی شکاری کے ہتھے نہ چڑھ جائیں..''

''لیکن حلیم صاحب..'' میں نے ایک سکول بوائے کی طرح انگلی کھڑی کر کے کہا۔ ''یہ دیوسائی پاکستان میں ہے تو یہ سارے کے سارے ریچھ محب الوطن پاکستانی ہیں اور اُس نظریۂ پاکستان پر صدقِ دل سے یقین رکھتے ہیں جس کے بارے میں ابھی تک یہ طے نہیں کیا جا سکا کہ یہ ہے کیا.. تو اس کے باوجود آپ نے ان کے نام گورے اور گوریوں پر رکھے ہوئے ہیں.. کفار کے نام رکھے ہوئے ہیں.. ان میں سے

کوئی ایک ریچھ یا ریچھنی.. معراج دین.. گل پٹھان یا جونیجو کیوں نہیں ہوسکتا.. زیب النساء..
گلشن بی بی.. یا عابدہ پروین کیوں نہیں ہو سکتی..“

”کیوں نہیں ہو سکتا.. یا ہو سکتی ہے.. لیکن ہمارے دل بہت چھوٹے چھوٹے
ہیں.. جانوروں کے لیے عشق کا جذبہ ہم میں نہیں ہے.. ہرگز نہیں ہے.. ہم اگر کسی
ایک ریچھ.. کسی گورے ریچھ کا نام نواز شریف رکھ دیں.. کسی پُر تکبر اگرچہ ذہین ریچھنی
کو بے نظیر کا نام دے دیں.. تو اسے ایک قومی بے عزتی قرار دے کر ہمیں نوکریوں سے
فارغ کر دیا جائے گا... یہ جو نام ہیں... میگی یا جولی.. تو یہ دنیا کے نامور سائنسدانوں اور
جنگلی حیات کے ماہرین کی بیویوں اور بیٹیوں کے ہیں.. اور وہ لوگ بڑے فخر سے اور
التجا کرتے ہوئے درخواست کرتے ہیں کہ دیوسائی میں اگر کوئی نئی ریچھنی دریافت ہو تو
براہ کرم اسے ہماری پیاری بیٹی یا بیوی کا نام دیجیے گا۔“ حلیم کے مردانگی سے بھرواں
چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”ہماری تو یہ خواہش ہے کہ اگر کوئی
نیا ریچھ دریافت ہو جائے تو ہم اسے تارڑ ریچھ کا نام دیں.. لیکن آپ تو نہیں مانیں گے۔“

”کیوں نہیں مانیں گے..“ میں نے خوش ہو کر اپنی پوری بتیسی کی نمائش کی
جس کے بیشتر دانت بید مجنوں کی طرح لرزتے تھے اور یہ قوی امکان تھا کہ میں ایک دو
برس میں مکمل طور پر پوپلا ہو جاؤں گا۔ ”آپ بے شک کسی بھی مناسب ریچھ کو تارڑ
ریچھ کا نام دے سکتے ہیں.. یہ میرے لیے ایک اعزاز ہوگا لیکن پہلے ریچھ سے پوچھ لیجیے
گا کہ بتا تیری رضا کیا ہے..“

”جناب آپ آئندہ برسوں میں دوبارہ ادھر آئیں تو آپ دیوسائی کے ایک
ریچھ ہوں گے..“ حلیم بے حد شکر گزار ہو گیا۔ ”اور... اگر ہمیں کوئی نوجوان ریچھ مل
جائیں تو کیا آپ اجازت دیں گے کہ ہم ان کے نام آپ کے بچوں کے ناموں پر رکھ دیں..
مثلاً سلجوق ریچھ.. سمیر ریچھ اور عینی ریچھنی وغیرہ.. اگر آپ اجازت دیں تو..“ حلیم
یقیناً میرے سفرناموں کے حوالے سے میرے بچوں کے ناموں سے واقفیت رکھتا تھا۔

”اجازت ہے..“ میں نے مغل اعظم کی گھمبیرتا کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”لیکن حلیم بھائی آپ بُرا نہ مانیے گا.. جب سے ہم نے بڑے پانی کی شکل دیکھی ہے،
ریچھوں کے علاوہ ہم نے کچھ اور نہیں سنا.. ہم ریچھوں سے لبریز ہو چکے ہیں.. کیا ہم کسی
اور موضوع پر گفتگو نہیں کر سکتے؟“

”بالکل کر سکتے ہیں... ہم ریچھوں کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے، ان کی
خوراک کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں.. جناب ایک تو یہ ناشتے میں گھاس کھاتا ہے..
اور پھر بڑے پانی کے بہاؤ کے ساتھ نیچے جا کر ایک ایسے حصے میں تھوتھنی جھکا کر مشاہدہ
کرتا ہے جہاں پانی رکاوٹ کی وجہ سے تھمتے ہیں.. اور پھر یہ ندی میں پتھر گراتا ہے..
ایک چھوٹا سا ڈیم تخلیق کرتا ہے.. اور مچھلیوں کو گھیرے میں لے لیتا ہے.. انہیں
ٹریپ کر لیتا ہے.. اپنا بھاری پنجہ پانی میں لٹکا کر اپنی ضرورت سے زیادہ خوراک کو ضائع
نہیں کرتا.. صرف اتنی مچھلیاں اچھالتا ہے جتنی وہ کھا سکتا ہے.. زیادہ ہرگز نہیں..“

”ریچھ صرف مچھلیاں کھاتا ہے؟“

”نہیں.. اس کی دوسری پسندیدہ خوراک سیٹیاں بجانے والے مارموٹ ہیں..“

”خالد ندیم.. آپ بھی ایک مونچھوں والے مارموٹ ہو.. ریچھوں سے بچ جاؤ..“

حلیم کا بیان جاری تھا۔ ”تارڑ صاحب آپ جانتے ہیں کہ مارموٹ بے حد
کھلنڈرا.. شریر اور خرگوش نما جانور ہے.. وہ اٹکھیلیاں کرتا ہے.. دونوں پاؤں پر کھڑے ہو
کر سیٹیاں بجاتا ہے اور اس طور جب اسے براؤن ہمالین بیئر دکھائی دیتا ہے تو وہ اسے
جان بوجھ کر چھیڑتا ہے.... اور اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ریچھ انتہائی خوشگوار موڈ میں
شائد کسی ریچھنی سے ملاپ کے چاؤ میں دیوسائی کی گھاس پر لڑھکتا ہوا جا رہا ہے تو
مارموٹ کسی لفنگے کی طرح سیٹیاں بجا کر اسے تنگ کرتا ہے.. اور وہ غصے میں آ جاتا ہے
اور سب کچھ بھول کر اس بدتمیز جانور کے پیچھے پڑ جاتا ہے.. مارموٹ فوراً اپنے بِل میں
گھس جاتا ہے تو یہ ریچھ اس بِل کو دیوانہ وار اپنے پنجوں سے کھودتا چلا جاتا ہے تا آنکہ

اس کے اندر دبکا ہوا مارموٹ اس کے سامنے آجاتا ہے اور وہ اسے چیر پھاڑ دیتا ہے اور کھا جاتا ہے۔"

"بے چارے مارموٹ کو کھا جاتا ہے.." خالد نے بے چارگی سے کہا جیسے اسے کھایا جا رہا ہو..

"جی جناب.. مارموٹ کا گوشت اس کی پسندیدہ غذا ہے... اور جناب یہ جو ریچھ کے بارے میں داستانیں ہیں کہ جب یہ موج میں ہوتا ہے تو ناچنے لگتا ہے.. یا کسی لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے تو اسے اٹھا کر اپنی غار میں لے جاتا ہے تو یہ صرف داستانیں ہیں، ان میں کوئی حقیقت نہیں.. اور ریچھ..."

"سر جی.." سلمان نے یکدم کہا۔ "ریچھ بہت ہو گئے ہیں.. اب کچھ اور نہیں ہو سکتا.. جیسے دخترِ اقبال نے حضرت علامہ کا فارسی کلام اور مسلسل غزلیں سننے کے بعد ایک جمائی لے کر فریدہ خانم سے کہا تھا.. ابّاجی بہت ہو گئے ہیں، اب کچھ اور سنائیں.. تو اسی طرح.. دیوسائی کے ریچھ بہت ہو گئے ہیں"

اب ہم کچھ اور سننا چاہتے تھے..

"ٹھیک ہے سر.." حلیم مسکرا رہا تھا.. "ہم ریچھوں کو ترک کرتے ہیں اور اس شاندار پرندے کی طرف آجاتے ہیں جو بڑے پانی پر چونچ نیچے کیے پانیوں میں سُراغِ مچھلی کی جستجو کرتا ہے.. پانیوں میں گرتا ہے.. ڈبکی لگاتا ہے اور اکثر اوقات اپنے جسم سے بھی بڑی ایک مچھلی چونچ میں دبائے باہر آتا ہے تو اس پرندے کو "گریٹ بلیک ہیڈڈ گل" کہتے ہیں.."

"گَل.. تو غالباً سمندری پرندے کو کہتے ہیں.. اور ایک لِونگ سٹون سی گل بھی تھا.."

"لیکن یہ گَل.. دیوسائی کے پانیوں کا پرندہ ہے... اور پھر ان گھاس کے میدانوں پر سینگوں والا لارک بھی پرواز کرتا ہے جس کا تذکرہ انگریزی شاعری کی ہر

دوسری لائن میں ہوتا ہے لیکن وہ یہیں دیوسائی میں ہوتا ہے... اس کے علاوہ ممولا بھی ملتا ہے، زرد اور سفید رنگوں کا.. اور ویگ ٹیل ہوتی ہے.. پدّیاں.. چھوٹی چڑیاں.. آپ بور تو نہیں ہو رہے؟"

"ہرگز نہیں.." سب نے کورس میں کہا.. اگرچہ سب لوگ دیوسائی کے پرندوں اور جانوروں کے لگاتار تذکرے سے عاجز آچکے تھے..

"تارڑ صاحب، ایک پرندہ جو دنیا کے کسی اور میدان یا صحرا میں نہیں ملتا.. یہاں ملتا ہے۔"

"رئیلی.."

"یعنی ناردرن ہبی.. چھوٹا عقاب.. گولڈن ایگل.. میں نے دیوسائی کے دور افتادہ علاقوں میں پوشیدہ.. گھات میں بیٹھے ہوئے ایسے غیر قانونی شکاریوں.. پوچرز کو گرفت میں لیا ہے جو ان سنہری عقابوں کو قابو کر کے باہر کے ملکوں میں سمگل کر کے لاکھوں روپے کماتے ہیں.."

"نہایت شرمناک حرکت ہے.." کسی نے جمائی لے کر کہا..

"آپ نے کبھی داڑھی والا گدھ دیکھا ہے؟" حلیم پرجوش ہو کر بولا..

عوام الناس کے لیے ریچھ اور چرند پرند بہت ہو چکے تھے۔ اب وہ کسی کلین شیوڈ یا داڑھی والے عقاب میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے اس لیے چپ بیٹھے رہے..

"کیا یہ حیرت ناک تاریخی واقعہ نہیں ہے کہ اس داڑھی والے عقاب کا تذکرہ تزکِ بابری میں آیا ہے.. بابر نے بہ چشم خود اسے دیکھا تھا.. اور یہ عقاب بھی دیوسائی میں پایا جاتا ہے.."

"اچھا تو پانی پت کی جنگ کے بعد بابر صاحب ادھر تشریف لے آئے تھے، دیوسائی میں؟ انہیں سانس کی پرابلم نہیں ہوئی تھی.." سلمان ایک سُست سی انگڑائی لے کر کہنے لگا..

"ادھر تبّت کا بھیڑیا بھی پایا جاتا ہے.."

"تبّت کا بھیڑیا ہے تو ادھر تبّت میں رہے، یہاں کیا کرنے آجاتا ہے.."

"ایک قسم ہے بھیڑیئے کی.." رفیق نے معصومیت سے وضاحت کی۔

اس لمحے.. بڑے پانی پر.. ایک شام اتری..

جیسے مقدس صحیفے اترتے ہیں..

جیسے بن آہٹ ایک سیاہ بلی دیوار سے جست لگا کر صحن میں کودتی ہے..

اور اس شام میں.. کیمپ کے ایک خیمے میں.. ایک لالٹین روشن ہوئی۔

"آپ کل سویرے منی مرگ جا رہے ہیں؟" حلیم نے پوچھا..

"جی..."

"ہم لے کر جائے گا.." صمد خان صاحب بہت دیر بعد بولے..

"کس راستے سے جائیں گے؟"

"آپ بتائیں۔"

"یہاں سے منی مرگ جانے کے لیے دو راستے ہیں.. ایک تو معمول کے مطابق دیوسائی روڈ پر... شیوسر جھیل تک.. وہاں سے اتر کر چلم چوکی میں.. اور پھر برزل پاس کے پار.. اور دوسرا راستہ بہت کم لوگ اختیار کرتے ہیں.. عین ممکن ہے کہ وہاں ابھی برف ہو.. آپ کالے پانی کے پار جا کر دائیں ہاتھ مڑ جاتے ہیں.. گلتری روڈ کی طرف.. یہ راستہ ویران ہوتا ہے، ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہے.. لیکن علاقہ بہت خوشنما ہے اور گھاس کے وسیع میدان اور ندیاں ہیں.. بگ بوائے کا بھی گھر انہیں میدانوں میں شائد کہیں نظر آجائے.. یہ راستہ بلند ہو کر مرتفعے چوکی پر اتر جائے گا اور وہاں سے آپ چھوٹے دیوسائی کا نظارہ بھی کر سکیں گے.. وہاں سے منی مرگ چلے جائیں گے۔"

"نقشہ بنا دیں.." کسی نے کہا..

حلیم نے میز پر جھک کر دیوسائی کی بجھتی شام میں لکیریں کھینچیں.. ان پر نام لکھے.. نقشہ بنا دیا..

میں اس نام کے طلسم سے آزاد نہ ہوتا تھا..

منی مرگ... ایک چھوٹی سی موت.. فنا کر دینے کی حد تک خوبصورت کوئی مقام..

قُربت مرگ میں محبت... منی مرگ!

"آپ آج رات کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے.. ہمارے پاس.. ٹین پیک خوراکیں ہیں.. سُوپ اور سوغاتیں ہیں۔"

"اور جناب ہمارے پاس مرغی ہے.." میاں صاحب نے عینک سنبھالی۔

"بڑے پانی کی دو غیر قانونی مچھلیاں ہیں.. حلوہ ہوگا.. پراٹھے ہوں گے.. کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے جناب عالی.."

حلیم نے بہت احتجاج کیا.. بہت آہ و زاری کی کہ آپ مہمان ہیں لیکن.. ہمارا بندوبست ان سے بہتر تھا، اس لیے ہم سراسر انکاری ہو گئے..

"چلیے ہم حاضر ہو جائیں گے.. اپنی کوئی ڈش لے کر.. لیکن کل صبح.. منی مرگ روانہ ہونے سے پہلے... آپ ہمارے ہاں کیمپ میں آئیں گے اور پھر ہم آپ کو ذرا اوپر دیوسائی کے تین ایسے پیالہ نما میدانوں میں لے کر چلیں گے جو بہت کم سیّاحوں نے دیکھے ہوں گے.. ان میدانوں میں ہمارے ریچھ رہتے ہیں.. وہ ہمیں دیکھیں گے اور ہم ان کو دیکھیں گے.. کیا خیال ہے؟"

"ریچھ خیال ہے.." سلمان ہڑبڑا کر بولا۔ "میرا مطلب ہے اچھا خیال ہے۔"

حلیم نے میرے دل کی بات بوجھ لی تھی.. میں ریچھوں کو ان کے قدرتی ماحول میں گھومتے پھرتے دیکھنے کا تمنائی تھا..

شام حاوی ہو رہی تھی..

ہم سب کے چہروں پر شام حاوی ہو رہی تھی.. اور دیوسائی کی ٹھنڈک میں ہم سکڑتے جاتے تھے..

یہ بڑے پانی بھی عجیب پانی تھے.. نہ سنائی دیتے تھے نہ دکھائی دیتے تھے.. لیکن ان کے بہاؤ میں جو نیلگوں کرچیاں ٹوٹتی تھیں ان کی کرچ کرچ.. بہت مدھم سُروں.. نامعلوم سی آہستگی میں.. سنائی دیتی تھی اور سردی برداشت سے آگے ہوتی جاتی تھی..

”کل سویرے ہم ریچھوں کے پاس ہوں گے...“

”وہ وہاں ہوں گے..“

”ہوں گے...“

”بڑے پانی کی رات میں ایک الاؤ جشن اور میری امّی کے توے کے پیندے میں سے پھوٹنے والے شرارے تارے“

”رات دے باراں وجے...
آپے میری نیندر کھلے...
پتہ وی کھڑ کے تے میں کول بوہے دے کول کھلو کے...
ہولی ہولی کہنی آں... کون اے؟
تارڑ اے... ساڈھا لیڈر اے..
رات دے باراں وجے...“

دور سے آوازیں آتی تھیں کہ رات کے بارہ بجے...
ابھی تو صرف نو بجے تھے رات کے اور یہ ٹیم ممبران اپنے گلے پھاڑ پھاڑ کر الاپتے تھے کہ رات کے بارہ بجے...
شادی بیاہ کے موقعوں پر گایا جانے والا یہ پنجابی گیت... تالیوں اور ڈھولک کی تھاپ پر گایا جانے والا یہ گیت بڑے پانی کے کنارے دیوسائی کی رات میں کس خوشی

میں گایا جارہا تھا.. کیا یہ شادیٔ مرگ تھی.. منی مرگ تھی..

ہم دونوں سے دور... کچن ٹینٹ کی قربت میں... دیوسائی کے گھُپ اندھیروں میں... شیلا کی غاروں میں جہاں ریچھ سرمائی نیند سوتے ہیں، ان سے بھی زیادہ گھُپ اندھیروں میں.. اس شبِ دیجور میں ایک الاؤ بھڑبھڑ جلتا تھا.. شاہ حسین کا میلے والا سائیں کا مچ دھڑ دھڑ جلتا تھا اور اس کے شعلے عرش منور پر دستک دیتے تھے کہ میں ہولی ہولی کہنی آں... کون اے؟

میں اور حسن صاحب اس الاؤ سے ادھر اپنے خیمے کے باہر سرد ہو چکی گھاس پر براجمان تھے.. ہمارے عین نیچے بڑے پانی بہتے تھے.. گم صم اور تاریک.. نہ دکھائی دیتے تھے اور نہ سنائی دیتے تھے.. لیکن مکمل خاموشی بھی نہ تھی.. کبھی کبھار کوئی آبی سرگوشی سنائی دے جاتی.. ہوا تیز ہوتی تو کان سرد ہو کر ذرا لرزتے.. یا پھر ہمارے ساتھیوں کی ادھم آوازیں تھیں جو الاؤ کے گرد تالیاں پیٹتے تھے اور غلط وقت بتاتے چلے جاتے تھے کہ رات کے بارہ بجے.. اور ہم دونوں سرد ہو چکی گھاس پر شانت بیٹھے تھے.. من کی موج میں ہلکورے لیتے تھے..

ہم موج میں تھے اور مستی میں تھے.. یہ دیوسائی کی ہوا بھی تھی اور ہم اس سے مخاطب ہو کر کہہ سکتے تھے کہ اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردہ تست... اور ہمارا "گڈ بندوست" بھی تھا۔

"سر جی.. "اندھیارے کی گھُپ سیاہ میں سے سلمان کی آواز نازل ہوئی۔

"آپ کو ان حالات میں ڈسٹرب کرنا مناسب تو نہیں لیکن خالد صاحب جو اس وقت کچن ٹینٹ میں سُوجی بھُون رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تارڑ صاحب سے پوچھ کر آؤ کہ حلوے میں چینی کتنے چمچے ڈالنی ہے۔"

"تم دفع نہیں ہو سکتے؟"

"ہو سکتا ہوں بلکہ ہو جاؤں گا جب آپ مجھے چینی کے چمچوں کی تعداد بتا دیں

گے.. میں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں سر جی.. ویسے سر جی آپ نے... کیمپ میں جب آپ نے وہ ریچھوں کو بے ہوش کرنے والی گن کا رخ میری جانب کیا تھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے تھے سر جی.. اس کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ خطا ہو جانے کے قوی امکانات تھے.. تو کتنے چمچے؟"

"بھئی مجھے کیا پتہ کہ حلوے میں کتنی چینی ڈالتے ہیں؟"

"سر جی خالد صاحب کہہ رہے تھے کہ گجراتی حضرات یا تو دوسرے لوگوں کے مویشیوں اور جوتیوں کو ادھر ادھر کرتے ہیں اور یا میٹھے کے شوقین ہوتے ہیں۔ اس لیے تارڑ صاحب سے پوچھ کر آؤ۔"

خالد کا بیان کسی حد تک درست تھا..

گجرات کے آس پاس اور چناب کے کناروں پر رہنے والوں کے لیے "میٹھا" ایک مذہب ہے.. ایک زمانے میں باراتوں کی تواضع سب سے پہلے گھی سے نچڑتے حلوے سے کی جاتی تھی اور پھر پلاؤ پیش کر کے ان کا منہ نمکین کیا جاتا تھا.. اسی گجرات میں کوئی انگریز ڈپٹی کمشنر صاحب آیا تو کسان اس کی نہایت سفید رنگت دیکھ کر بے حد حیران ہوئے.. پوچھا کہ صاحب کو تنخواہ کتنی ملتی ہے.. بتایا گیا کہ پورے سو روپے ملتی ہے.. تو انہوں نے اپنی پگڑیاں درست کر کے کہا.. تبھی... سو روپے کا گڑ کھاتا ہو گا اسی لیے تو اتنا سفید ہے..

میرے اباجی... وفات سے چند روز پیشتر.. سوا چھ فٹ قد، نیلی آنکھوں، سفید رنگت اور چوڑے چکلے بدن کے باوجود بڑھاپے کی گرفت میں تھے.. ٹانگیں جواب دے چکی تھیں اور میں انہیں وہیل چیئر پر بٹھا کر نزدیکی مارکیٹ میں لے جاتا تھا.. جُوس پیش کرتا تھا اور ایک سگریٹ سلگا کر دیتا تھا اور وہ کہتے تھے.. رات میں آس پاس کی روشنیوں، ٹریفک اور زندگی کی گہما گہمی دیکھ کر حسرت سے کہتے تھے۔ "میں ایک کمرے میں لاچار لیٹا رہتا ہوں اور.. باہر تو بہار ہے.." تو ان دنوں ایک شام میں نے

انہیں کھانا کھانے میں مدد کی.. خالی برتن اٹھائے اور واپس گھر کے اپنے حصے میں آ گیا۔ میری بیگم کہنے لگی۔ ”میں نے حلوہ بنایا ہے.. اباجی شوق سے کھاتے ہیں، انہیں دے آئیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ تو کھانا کھا چکے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”ابھی دے آئیں.. ادھر تو بچے نہیں چھوڑیں گے.. وہاں فریج میں رکھ دیں، اباجی صبح کھا لیں گے“.. اور میں حلوے کی لبریز پلیٹ کو بہت آہستہ سے کہ.. پلنگ پر لیٹے اباجی ڈسٹرب نہ ہوں، ان کی آنکھ نہ کھل جائے... فریج میں رکھ رہا تھا کہ غنودگی میں ڈوبی ان کی آواز آئی۔ ”مستنصر کیا کر رہے ہو؟“

”حلوہ ہے اباجی.. آپ کھانا کھا چکے ہیں تو صبح کھا لیجئے گا۔“

”ادھر لاؤ..“

میں ان کے پاس لے گیا۔ انہوں نے اپنے بھاری تن و توش کو بمشکل پلنگ پر سیدھا کیا اور پھر نہایت پریم سے اور رغبت سے دھیرے دھیرے وہ تقریباً ایک کلو حلوہ نوش کر لیا.. اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”میٹھے کے بارے میں دو باتیں یاد رکھو.. میٹھا.. کسی بھی قسم کا ہو.. گُڑ.. حلوہ.. مٹھائی.. سوّیاں.. اس کے لیے بھوک کی ضرورت نہیں ہوتی، اسے کسی بھی وقت کھایا جا سکتا ہے اور دوسری بات یہ کہ یہ پہلے سے ہضم شدہ ہوتا ہے.. اس لیے میٹھے سے بدہضمی نہیں ہو سکتی.. اب مجھے سونے دو..“

تو خالد کا بیان گجراتیوں کی میٹھا خوری کے بارے میں درست تھا.. میں لاہور کا جم پل تھا لیکن میرے جینز تو سراسر گجراتی تھے اور چناب کے کناروں کے تھے.. ”اسے کہو کہ اتنی چینی ڈالے کے حلوہ کھاتے ہوئے ہونٹ مشکل سے جدا ہوں..“

”بڑی سیکسی بات کی ہے سر جی.. اور الاؤ روشن ہو چکا ہے تو آپ بھی آ جائیں۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”اور ہم حلیم اور رفیق کی آمد کے منتظر ہیں.. تم چلو۔“

وہ چلا گیا.. اندھیرے میں اس کا وجود ایک براؤن ہمالیائی ریچھ کی طرح

لڑھکتا ہوا چلا گیا..

”حسن صاحب..“

”جی سر..“

”ذرا چیک کیجئے کہ بڑے پانی ابھی ادھر ہیں کہ نہیں...“

حسن نے نہایت فرمانبرداری سے کان لگا کر سنا اور آہستگی سے بولا۔ ”سر... سنائی نہیں دیتے لیکن ادھر ہی ہوں گے.. آج دوپہر تو ادھر ہی تھے.. جا کہاں سکتے ہیں.. لیکن آپ کیوں پوچھتے ہیں..“

”میں اس دیوسائی کی مست رات میں تھوڑی سی سوئمنگ کرنا چاہتا ہوں.. ان کے پار جانا چاہتا ہوں.. آپ چلیں گے؟“

حسن ہراساں ہو گئے۔ ”اس وقت سر؟.. سر ان میں تو مچھلیاں بہت ہوں گی اور وہ گُدگدی کریں گی..“

”سوچ لیں حسن صاحب.. یہ رات پھر نہ آئے گی۔“

”اگر آپ مجھے یقین دلا دیں کہ بڑے پانی کے پار ایک پی سی او ہے جہاں سے میں اپنی بیگم کو لاہور فون کر سکتا ہوں تو سر.. میں ابھی چھلانگ لگا سکتا ہوں“.. حسن کی خوشدلی اور بیگم کے لیے معصوم محبت مجھے حسد کی آگ میں جلا کر راکھ کرتی تھی اور میں مسکرائے چلا جاتا تھا..

”تارڑ صاحب..“ اب ایک اور کردار اندھیرے میں سے نمودار ہوا اور ہمارے سروں پر کھڑا ہو گیا.. ”میاں صاحب پوچھ رہے ہیں کہ تارڑ صاحب سے پوچھ کر آؤ کہ مرغی فُل فرائی کرنی ہے یا اس کا شوربہ بنانا ہے..“

”جو اُن کے جی میں آئے..“

”اور وہ کہہ رہے ہیں کہ پوچھ کر آؤ کہ جو مچھلیاں ہیں، انہیں کیسے تلنا ہے؟“ یہ انصاری تھا۔

"ایسے تلنا ہے کہ.. لیکن بے چاری مچھلیوں کو کیوں تلنا ہے.. بھئی انہیں واپس بڑے پانی میں چھوڑ دینا ہے تاکہ وہ تیر سکیں.."

"بالکل سر..."

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ اتنی دیر پانی سے باہر رہنے کی وجہ سے وہ بے چاری تیرنا بھول چکی ہوں۔" حسن بے حد فکر مند ہوا۔ "اور ندی میں ڈال دیں تو وہ ڈوب جائیں۔"

انصاری ذرا خفیہ طریقے سے ہنسا..

ہم نے اس کی پروانہ کی.. ہم بے پروا تھے..

"سر جی.. ادھر الاؤ کے گرد بڑا جشن ہو رہا ہے.. آپ بھی آجائیں۔"

"وہاں تم یہی گانا گا رہے ہو ناں کہ.. رات کے بارہ بجے؟"

"ہاں جی.."

"تو ہم رات کے بارہ بجے ہی آئیں گے.. ابھی تو ساڑھے نو بجے ہیں۔"

وہ اندھیرے میں خوش خوش چلا گیا..

"تارڑ صاحب سارے سوال آپ مجھ سے پوچھتے ہیں.. میں بھی کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

"ارشاد..."

"کیا آپ واقعی اس لمحے بڑے پانی کے پار جانے کے موڈ میں ہیں..؟"

"میں موڈ میں تو ہوں لیکن میں پار نہیں پہنچ سکتا.. میں تیرنا نہیں جانتا.. اتنے سرد پانیوں میں تو اتنی رات گئے اترنے والا پہلے قدم پر ہی منجمد ہو جائے گا.. اور ذرا آگے جائے گا تو آپ کو مچھلیاں گدگدی کرنے لگیں گی.. میں پار نہیں پہنچ سکتا.. پار دکھائی تو بہت کچھ دیتا ہے جو اپنے پاس بلاتا ہے.. مہینوال کی کٹیا ہے.. ہیر کا رانگلا پلنگ ہے.. صاحباں کا شہوت بھرا بدن ہے.."

"آپ کو دکھائی دیتا ہے؟" حسن صاحب حیرت زدہ ہوئے اور بہت ہوئے..

"نہیں حسن صاحب.. پار تو کچھ بھی نہیں.. یہ سب تو سیراب ہے.. طویل فاصلے ہیں.. آدھی دنیا راستے میں حائل ہے.. آواز بھی رک رک کر آتی ہے.. بس یوں سمجھ لیجئے کہ پار.. صرف ایک مِنی مرگ ہے.. ایک چھوٹی سی موت ہے.. قُربت مرگ میں محبت ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں.."

الاؤ کی جانب سے سرخوشی اور مستی کے الاپ آتے تھے.. ہم دونوں خیمے سے باہر گھاس پر بیٹھے نہ دکھلائی دینے والے پانیوں کو دیکھتے تھے..

ہم پر دیوسائی کی سحر انگیزی کا اثر ہو چکا تھا.. دنیا کے بلند ترین میدان کی خنک رات میں ہم سہمے ہوئے دو کبوتر تھے.. ہم پر جادو چل چکا تھا.. ایک کبوتر بڑے پانی کے پار ایک پی سی او دیکھتا تھا.. اور دوسرا کبوتر.. لمحۂ موجود کی مستی میں کچھ بھی نہ دیکھتا تھا.. اور جو کچھ وہ دیکھنا چاہتا تھا، وہ ممنوع تھا..

اس شبِ سیاہ میں... وائلڈ لائف کیمپ کی جانب سے ایک چینی اژدھا اترتا چلا آرہا تھا اور اس کی دونوں آنکھوں میں الاؤ روشن تھے... ان کی روشنی میں زرد گھاس ننگی ہوتی تھی... وہ کسی گھاٹی کی اوٹ میں ہوتا تو تاریکی لوٹ آتی.. لہرا کر اونچا ہوتا تو اس کی آنکھیں دو آسیب زدہ سُورجوں کی طرح اندھیرے کی گپھا کو عریاں کر دیتیں.. آنکھیں چُندھیا جاتیں..

یہ جیپ الاؤ کی قربت میں آکر رک گئی.. ہیڈ لائٹس بجھ گئیں..

حلیم.. رفیق اور خطرناک خان عبدالصمد خان نیچے اترے.. وہ آج کی شب ہمارے مہمان تھے۔

رات کے بارہ بجے تو... ہم دونوں اٹھ کر آگ کے پاس جا بیٹھے..

الاؤ کے گرد.. بھنگڑا ڈالتے ہوئے.. ایک ریڈ انڈین وار ڈانس کرتے ہوئے.. خالد، سلمان اور انصاری..

اور الاؤ بھڑک کر عرشِ منّور کے دروازوں کو سوختہ کرتا تھا..

ہمارے چہروں پر جل بجھ کر انگارے اور شرارے برساتا.. ہماری پہچان کرواتا تھا..

ایسے الاؤ میری کوہ نوردیوں کی یکتا کوہستانی تنہائیوں میں کئی بار روشن ہوئے تھے..

فیئری میڈو میں.. آسمان کو قریب آنے دو..

ٹاپ میدان کی تاریکی میں.. سیاہی میں بھی نانگا پربت کی نمایاں ہوتی سفید برہنگی میں..

جب میں اور سُمیر شل مکھی یعنی سو چہروں والی نانگا پربت کے دامن میں رہنے والوں کی زبانی "پچھل پریوں اور جنّوں کی داستانیں سنتے تھے..

پائیو کی شب میں.. مشعلوں کی روشنی میں.. اولے اولے.. مُجرا اِن پائیو..

وادیٔ سوختر آباد میں سنو ٹائیگرز کی جلتی آنکھوں میں.. جو الاؤ جلتے تھے..

سنو لیک پر برف کے سفید الاؤ میں..

یا پھر میری امی جب مٹی کے چولہے پر سے توے کو آگ سے اتارتی تھیں تو توے کے پیندے پر ستارے جگمگاتے تھے..

وہ اسے روٹیاں پکانے کے بعد الٹا کر ایک جانب رکھتی تھیں تو میں اس توے کی سیاہ پشت کو حیرت سے تکتا جاتا تھا کہ اس پر پُھل جھڑیاں چھوٹتی تھیں.. جگنو ٹمٹما کر بجھتے چلتے جاتے تھے.. اور ستارے شرارے چھوڑتے تھے اور میرے دیکھتے دیکھتے توے کا پیندا پھر سے سیاہ اور تاریک ہو جاتا تھا.. اور دیوسائی کے آسمان پر ویسے ہی ستارے جگمگاتے تھے جو میری امی جان کے الٹائے ہوئے توے پر جلتے بجھتے تھے..

لیکن ان ستاروں کو الاؤ کی روشن دہک سے پرے ہو کر دیکھنا پڑتا تھا کہ وہ اس کی بھڑک سے ہراساں ہو کر فرار ہو جاتے تھے.. گم ہو جاتے تھے اور دکھائی نہیں دیتے تھے..

اور زندگی کا کوئی ایک الاؤ تھا.. جو میرے بدن کو جلاتا تھا.. جھلساتا تھا..

رات کے بارہ بجے..

میں نیند سے بیدار ہو جاتی ہوں..

ایک پتّے کی سرسراہٹ بھی سنائی دے تو..

تو میں دروازے سے لگ کر.. اس کے ساتھ لگ کر..

ہولے ہولے پوچھتی ہوں.. کون ہے؟

تو کون ہے؟

کیا شاہ حسین ہے.. جو درد وچھوڑے کا حال اپنی ماں سے کہنے آیا ہے..

یا رانجھا جوگی بن کر در پر آیا ہے.. نیں میں جانا جوگی دے نال..

کہیں کھڑی شریف کا میاں محمد تو نہیں اور اسے دیوسائی میں شام ہو گئی ہے..

شام پئی بن شام محمد گھر جاندی نیں ڈرناں..

فرید بھی تو ہو سکتا تھا.. وچ دیوسائی دے نازک ناز دیاں جٹیاں تو نہیں رہندیاں..

لیکن روہی اور دیوسائی اصل میں ایک تھے..

دونوں ویرانے تھے.. ایک گرمی کا مارا ہوا.. دوسرا سردی کا ٹھٹھرا ہوا..

دونوں میں بہار چندروز کے لیے آتی تھی..

روہی بارش میں زندہ ہو کر اپنی پیلوں پکاتا تھا.. جھاڑیاں سرسبز ہوتی تھیں اور ٹوبے بھرتے تھے اور اونٹ مست ہوتے تھے..

اور دیوسائی میں برف پگھلتی تھی تو گُل بوٹے پھوٹتے تھے..

دونوں کی بہار چندروزہ تھی..

میں پھر ہولے ہولے پوچھتی ہوں.. کون ہے؟

کہیں قرۃ العین طاہرہ تو ادھر نہیں آنکلی.. کُوچہ بہ کُوچہ.. کُو بہ کُو.. کُوکتی ہوئی..

میرا بھی تو ہو سکتی ہے..

کون ہے؟

شائد ٹی ایس ایلیٹ اپنی ویسٹ لینڈ میں آنکلا ہے.. دیوسائی سے بڑھ کر ویسٹ لینڈ اور کیا ہوگی..

لیکن سنو.. کسی نے غور نہیں کیا، توجہ نہیں کی.. کہ جو اس روشن الاؤ کی رات میں باہر کھڑا ہے.. دستک دیتا ہے.. وہ تارڑ ہے.. اور کہتا ہے، میں نے آوارگی میں زمانے کی سیر کی.. اب گھر آیا ہوں تو مجھے اندر آنے دو.. کارواں سرائے کے دروازے کھول دو.. میں بہت تھکا ہوا ہوں.. اور اپنی آخری شب یہیں بسر کرنا چاہتا ہوں.. اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں..

"رات کے بارہ بجے..."

اور باہر کوئی نہ تھا.. صرف میں تھا جو دستک دیتا تھا..

علی مدد... مٹی کے تیل کی بوتل کو ایک خُم کی طرح بجھتے ہوئے الاؤ پر لنڈھاتا تھا تو وہ پھر سے بھڑک اٹھتا تھا.. شعلے لپکتے جاتے تھے.. عرش پر دستک دیتے تھے.. دروازہ کھولو.. میں اپنی آخری شب بسر کرنا چاہتا ہوں اور پھر ہمیشہ کے لیے کوچ کر جاؤں گا..

"رات کے بارہ بجے.."

عباس... ایک بے قابو سنو مین کی طرح زور زور سے تالیاں بجا رہا تھا.. نہ ردھم کا خیال کرتا تھا نہ گیت کی لے کا.. ایک ریچھ چہرے کے ساتھ تالیاں پیٹتا جاتا تھا..

ہمارے بلتی پورٹر الاؤ کے گرد رقص کرتے تھے... جیسے گئے زمانوں میں ہوں، اپنے آپ میں گم...

آگ کی جلتی بجھتی روشنی میں وہ بھی کبھی جلتے تھے اور کبھی تاریکی میں بجھ جاتے تھے.. الاؤ یکدم بھڑک اٹھتا تھا.. اور تب بھڑکتا تھا جب اس پر مٹی کے تیل کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا.. اور مجھے وہ فضول سا فلمی گیت یاد آتا تھا کہ.. شعلہ جو بھڑکے دل میرا دھڑکے.. درد جوانی کا ستائے بڑھ بڑھ کے.. یہاں شعلہ تو بھڑکتا تھا لیکن وہ ولولے جوانی کدھر گئی...

حلیم اور رفیق راج بُھوت الاؤ کے کناروں پر آلتی پالتی مارے حیرت میں ہیں تکتے تھے.. سنّاٹے میں آئے ہوئے تھے کہ کیسے کیسے لوگ یہاں آجاتے ہیں.. کہ ابھی گیارہ بجے ہیں اور یہ مسلسل یہی گا رہے ہیں کہ رات کے بارہ بجے..

"تارڑ صاحب..." حسن نے زرد گھاس میں پوشیدہ سُوپ کا مگ میری جانب کھسکایا۔ "اس میں آپ کی سردی دور کرنے کے لیے کچھ گرمی ہے.. ایک روزِ ابر ہے.. ایک شب ماہتاب ہے.."

روزِ ابر میں اداسی نہ تھی، ایک سرمستی تھی..

اور شب ماہتاب میں بدن کے اندر تک سفر کرنے والی کرنیں تھیں..

انصاری چیخ چیخ کر "رات کے بارہ بجے" گا رہا تھا اور ایک نیلے ڈرم کو نہایت بے سُرے انداز میں زدوکوب کئے چلا جا رہا تھا..

میاں صاحب مانگے مار رہے تھے..

میں دروازے کے ساتھ لگ کر ہولے ہولے کہتا ہوں، کون ہے؟

خود ہی پوچھتا ہوں کہ کون ہے؟.. تو خود ہی کیسے جواب دوں کہ.. میں ہوں!

ڈنر سرو ہو گیا...

گرم چپاتیاں... مرغی بلکہ بقول میاں صاحب مُرغی... بڑے پانی کی تلی ہوئی سنو کارپ.. اور حلوہ.. میرے دل کو لبھانے والا.. اتنے شدید میٹھے والا کہ ہونٹ چپک چپک جائیں..

الاؤ بجھنے لگا کیونکہ ہماری لکڑی کا سٹاک ختم ہو گیا تھا.. دیوسائی پر ماچس کی ایک تیلی بنانے کے لیے بھی لکڑی نہیں ملتی.. نیچے سے لانی پڑتی ہے.. الاؤ بجھنے لگا..

"ہمارے کیمپ سے فوراً لکڑی لے کر آؤ تاکہ یہ الاؤ جاری رہے۔" حلیم نے اپنے ایک اسسٹنٹ سے کہا.. وہ فوری طور پر اٹھا اور جیپ کی مہیب لائٹس آن کر کے

کیمپ کی طرف چلا گیا۔ جب لوٹا تو اس جیپ میں ایسی خشک اور راکھ ہو جانے کی تمنا میں لکڑیاں اور ٹہنیاں تھیں کہ الاؤ پر گریں تو ایک آہ کی طرح جل اٹھیں...

"رات کے بارہ بجے..."

اور جب واقعی رات کے بارہ بجے.. رقص کرنے والے تھک گئے۔ گانے والے اونگھنے لگے اور باتیں ختم ہو گئیں.. اور علی مدد پھر سے بجھنے والے الاؤ پر مٹی کا تیل چھڑکنے کو تھا تو میں نے اسے روک دیا.. "نہیں علی مدد.."

"ابھی تیل ہے صاحب.. آگ لگے گا۔"

"نہیں اس الاؤ کو سرد ہو جانے دو.. کیونکہ اس نے دیوسائی کے آسمان کے ستاروں کو نیچے آنے سے روک رکھا ہے.. ان کو نیچے آنے دو.. جیسے وہ فیئری میڈو کی شب میں نیچے اترتے تھے.."

اس نے ہاتھ روک لیا..

سلگتی ٹہنیاں تیل کے چھڑکاؤ کے بغیر کب تک سلگتی جاتیں.. چنگاریاں مدھم ہوئیں..

راکھ ہونے لگیں، خاک ہو گئیں.. اک آتشِ رفتہ ہوئیں اور ہم سب گھپ اندھیرے میں چلے گئے..

اور تب آسمانِ دیوسائی پر جو لاکھوں دیئے ٹمٹماتے ہوئے اس الاؤ کے بجھنے کے منتظر تھے.. وہ اترنے لگے..

ایک گھٹاٹوپ اندھیارے میں شراروں کی طرح برسنے لگے..

ہم پر گرنے لگے..

دیوسائی کے گنبد میں جو ٹمٹماتی روشنیاں تھیں.. انہوں نے اپنے مقام ترک کئے اور نیچے ہم پر گرنے لگیں..

"ہم ریچھوں سے ملاقات کرنے جا رہے تھے"

ہم ریچھوں کو دیکھنے جا رہے تھے..

ان سے ملاقات کرنے جا رہے تھے..

رات الاؤ بجھا.. پھر خواہش کی تکمیل کے بعد ایک بدن کی طرح ہولے ہولے سرد ہوا.. اور جب تاریک ہوا تو ہم پر اتنے ڈھیر سارے ستارے شراروں کی طرح برسے کہ ہم اپنے بدن کے ہر حصّے پر ان کے داغ محسوس کرتے تھے.. وہ ہماری جیکٹوں کو جلا کر ہمارے بدنوں کو داغتے تھے..

ہم ان کی روشن بارش سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے بمشکل اپنے خیموں تک پہنچے.. لیکن وہ اتنی تیز روشنی والے تھے کہ خیموں کے کپڑے کو بھی چھیدتے تھے اور اندر آتے تھے..

دیوسائی کے ستارے شائد ہر شب برستے تھے.. زمین پر اترتے تھے.. کچھ قیام کرتے تھے اور جب دن آتا تھا تو سورج کی روشنی میں کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ سب، ان کے انبار انہی راستوں پر اٹھتے ہیں، واپس جاتے ہیں جن پر سفر کرتے وہ پچھلی شب زمین پر اترے تھے.. تو وہ دن کی روشنی میں اپنے آسمانی گنبد کو لوٹتے تھے.. اور وہاں سے اس گنبد بے در میں.. بہت سارے در تھے.. جگہیں خالی تھیں.. چھید

تھے.. جیسے لاہور کے شیش محل کے نقش و نگار میں وہ جگہیں خالی پڑی ہیں.. ان کی شکل کی شبیہ خالی پڑی ہے اور وہ شکل موجود نہیں.. ہیرے، قیمتی پتھر اور جواہر جہاں جڑے تھے، اکھاڑ لیے گئے اور اب وہاں ان کی ناموجودگی کا گھاؤ موجود ہے.. جیسے ایک جڑاؤ جھمکے کے نگ کھو جاتے ہیں اور ان کے گہرے داغ باقی رہ جاتے ہیں.. تو اسی طور آسمان کے گنبد میں بھی خالی آماجگاہیں تھیں، سوراخ اور جگہیں تھیں جو پچھلی شب ستارے چھوڑ گئے تھے.. اور اب دن کی روشنی میں وہی ستارے واپس آتے تھے.. تمام ہیرے جواہر.. قیمتی پتھر اور نگ واپس آتے تھے اور اپنے اپنے مقام میں.. پھر سے جڑتے جاتے تھے اور آسمان کا شیش محل مکمل ہو جاتا تھا.. لیکن صرف ایک روزِ روشن کے لیے.. رات ہو گئی تو انہیں پھر سے زمین پر گر جانا تھا..

لیکن ابھی.. الاؤ بجھنے کے بعد جب ہم خیموں میں چلے آئے تھے تو وہ ان کے کپڑے میں چھید کرتے ہمارے بدنوں پر گرتے تھے..

وہ میرے خیمے کے اندر.. وہ ستارے سارے کے سارے خیمے کے پردے کو اپنی لو سے جلا کر اندر آتے تھے اور میرے سلیپنگ بیگ پر دمکتے ہوئے سفید اولوں کی طرح گرتے تھے.. یہاں تک کہ میرا سرخ سلیپنگ بیگ ان سے بھر گیا..

میں نے سلیپنگ بیگ کو سمیٹ کر خیمے سے باہر جھٹکا کہ اس دمکتی جلتی بجھتی چراغاں سے نجات ہو.. لیکن جب میں نے سرخ سلیپنگ بیگ کو خیمے کے اندر بچھایا تو وہ چند لمحوں میں پھر سے بھر گیا.. سفید ہو گیا..

خیمے میں اتنے سوراخ تھے کہ ان میں سے دیوسائی کا پورا آسمان نظر آ رہا تھا.. جیسے میں کھلی فضا میں لیٹا ہوا ہوں.. میرے اوپر کچھ نہیں سوائے ایک بہت وسیع نیلے خیمے کے جس میں سے چراغ ہیں جو لڑھکتے ہوئے مجھ پر گرتے ہیں..

گاؤں میں.. قدیم وقتوں میں.. شب برات میں.. میں "بُرج" بناتا تھا.. گڈی کاغذ اور دھاگے کے ساتھ ایک جھروکا سا بناتا تھا اور پھر اس جھروکے کے درمیان میں

ایک چھوٹا سا دیا جلا کر رکھتا تھا.. تھوڑی دیر بعد ہوا گرم ہوتی تھی اور وہ "بُرج" آہستہ آہستہ بلند ہونے لگتا تھا.. تاریک آسمان میں اٹھتا چلا جاتا تھا.. تب شب برات ایسی ہوتی تھی.. درجنوں "بُرج" آسمان پر ڈولتے تھے اور پھر آہستہ آہستہ نیچے آنے لگتے تھے..

دیوسائی کی رات میں بھی یہ بُرج آہستہ آہستہ نیچے آتے تھے..

میرے خیمے پر گرتے تھے..

یہ ایک ایسی ہی رات تھی..

شائد آپ یقین نہ کریں کہ ایک ایسی رات بھی ہو سکتی ہے.. لیکن یہ ایک ایسی ہی رات تھی..

اور اب ہم ریچھوں کو دیکھنے جا رہے تھے..

سویر ہوئی.. سورج کی پہلی کرن کے تیر نے ہی مجھے گھائل کر دیا کہ خیمے میں سوراخ بہت تھے.. میں سلیپنگ بیگ میں سے سکڑ کر باہر آیا.. خیمے کی زپ کو کھولا اور رینگتا ہوا زرد گھاس پر آ گیا..

خیمہ بستی ویران پڑی تھی.. جیسے آسیب زدہ ہو.. سب خوابیدہ تھے... کچن ٹینٹ.. ہمارے تین خیمے.. پورٹر.. سب سو رہے تھے..

اگرچہ ٹھنڈک بہت شدید تھی.. لیکن میں ابھی پرسوں برجی لاء جھیل کی برفباری کی رات میں.. نکتہ انجماد سے نیچے.. ایک رات بسر کر چکا تھا۔ اس لیے میرے لیے یہ شدید سردی بادِ نسیم کا ایک جھونکا تھی.. اور میں ایک ٹی شرٹ میں.. جو سمیر تارڑ کی وارڈروب میں سے چرائی گئی تھی اور جس پر کسی امریکی پاپ گروپ کے نہایت بے ہودہ باریش چہرے تھے.. باہر آ گیا..

جہاں پچھلی شب الاؤ بھڑکتا تھا.. وہاں زرد گھاس پر کچھ راکھ تھی.. ادھ جلی

لکڑیاں تھیں.. میں اس راکھ کے قریب اس لیے نہ گیا کہ میں جانتا تھا کہ جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا... اب اسے کریدنے سے فائدہ..

میں اپنے آپ میں سکڑتا.. ٹھٹھرتا.. خیمہ بستی ابھی تک خوابیدہ تھی.. میں بڑے پانی کے کناروں پر جا بیٹھا.. دیر تک اس سویر میں بیٹھا ان کی روانی پر نظریں جمائے بیٹھا رہا.. پھر ایک اور واہمہ سا وارد ہونے لگا.. جیسے ستاروں نے خیمے کے پردے میں چھید کئے تھے.. میرے سلیپنگ بیگ کو بھرا تھا.. ایسا ایک اور واہمہ وارد ہونے لگا.. اس واہمے میں بڑے پانی جو میری نگاہوں میں تھے... شفاف برف کی طرح ہوئے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے.. ٹھہر گئے.. ان کی روانی منجمد ہو گئی.. ایک کرسٹل کے فانوس کی طرح ساکت ہو گئے اور ان کی تہہ میں جتنی ریت تھی، پتھر اور کنکر تھے، وہ برہنہ ہو گئے.. اور ان پانیوں میں جتنی بھی سنو کارپ مچھلیاں تھیں، وہ جہاں تھیں وہیں معلق اور سکوت میں ٹھہر گئیں جیسے وہ بغیر پانیوں کے ہو گئی ہوں، تیر نہ سکتی ہوں اور ان کے منہ کھلے تھے... جیسے کیپٹن زبیر نے اپنی ایک فلائٹ کے دوران جھیل شیوسر کو پانیوں سے خالی دیکھا تھا... صرف اس کے پیالہ نما وجود کو دیکھا تھا.. ایسے کوئی ایک لمحہ کوئی ایک واہمہ اس سویر میں تھا جب میں اپنے خیمے سے باہر.. بڑے پانی کے کناروں پر سردی سے سکڑتا بیٹھا تھا اور وہ ٹھہر گئے تھے تاکہ مجھے اپنے پتھر، سنگریزے اور سنو کارپ مچھلیاں دکھا سکیں.. لیکن یہ لمحہ آنکھ جھپکتے ہی گزر گیا.. اس کا منجمد سحر صرف ایک پل کا تھا اور دوسرے پل میں بڑے پانی کے سکوت کرسٹل ریزہ ریزہ ہو کر پھر سے رواں ہو گئے... پتھر، کنکر، ریت.. اس کے بہاؤ کی گہرائی میں چلے گئے اور مچھلیاں جو معلق اور ساکت تھیں، حرکت میں آئیں اور پانیوں میں تیرتی ہوئی دور نکل گئیں..

"تارڑ صاحب.. آپ کل صبح 10 بجے سے پہلے پہلے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کیمپ پہنچ جائیے گا.. پھر ہم اپنے ریچھوں سے ملنے کے لیے جائیں گے۔" حلیم نے کہا تھا..

لیکن.. ہم بہت درماندہ اور تھکن میں تھے.. ہر کسی نے اپنی بساط سے بڑھ کر رقص کیا تھا، گیت گائے تھے.. تالیاں بجائی تھیں اور اپنے آپ کو مئے لالہ فام کے بغیر ہی مخمور کیا تھا..

چنانچہ ہم قدرے تاخیر سے حلیم کے کیمپ میں پہنچے..

دھوپ اتنی تیز تھی کہ نظر بھر کے دیکھا نہ جاتا تھا..

زرد گھاس اتنی روشن تھی کہ ہم اسے دیکھتے تھے تو اس کا سنہری پن ہمیں اندھا کرتا تھا..

لیکن بڑے پانی اتنے نیلگوں تھے کہ ان میں ہم اپنے لباس رنگ سکتے تھے.. اور ان کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ سفید پرندے اڑان کرتے تھے..

رفیق راجپوت.. ایک کیموفلاج جیکٹ اور میچنگ ٹراؤزر میں بہت ڈیشنگ لگ رہا تھا اور دمکتا تھا..

حلیم... دلیپ کمار یا ذرا ماڈرن ہو جائیں تو رابرٹ ڈی نیرو کے سٹائل میں اپنے بال ماتھے پر بکھیرے ایک سفید ٹی شرٹ اور جیکٹ میں... ہمارا انتظار کرتے تھے..

اور وہاں عبدالصمد خان بھی تھا.. اپنی دولہا پگڑی کو سر پر جمائے.. اپنی نیم سفید ریش کو سہلاتا.. اور وہ مجھے تشویش میں مبتلا کرتا تھا کہ صرف مجھے دیکھتا تھا اور اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا تھا..

دو جیپیں.. ہم سب سے بھری ہوئیں.. قدرے تاخیر سے.. جب کہ سورج بلند ہو کر دیوسائی کے گھاس بھرے میدانوں کے ہر تنکے اور برف بھری ہر بلندی کو برہنہ کرتا تھا... دو جیپیں.. خاصی تاخیر سے وائلڈ لائف کیمپ میں سے باہر نکلیں..

اگرچہ اجازت تو نہ تھی کہ اس جنگلی حیات کے بچاؤ کیمپ سے پرے کوئی بھی میکانکی ذرائع نقل حمل حرکت کرے.. یہ ممنوع تھا.. یہ میدان انجن کی آواز سے تقریباً ناآشنا تھے.. لیکن ہمارے پاس وقت کم تھا.. اگر ہم پیدل سفر کرتے تو گھاس کے ان تین

میدانوں تک پہنچتے پہنچتے ہمیں شام ہو جاتی، اس لیے ہمارے ساتھ خصوصی رعایت کی گئی اور... اب ہم جیپوں میں سوار وہاں جا رہے تھے..

اور بقول حلیم دس میں سے نو فیصد امکان تھا کہ ہم کسی ایک بھالو کو اپنی وسیع سلطنت میں لڑھکتا ہوا دیکھ لیں گے..

جیپیں بڑے پانی سے اٹھیں تو دیوسائی کے میدانوں اور ٹیلوں اور گھاس کو راستہ بنایا..

وہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہ تھا..

گھاس کے میدانوں میں وہ پہلے راستے بناتی.. ہونکتی.. شور مچاتی.. آلودگی پھیلاتی دیوسائی کے ان حصوں میں بلند ہوتی.. اترتی تھی.. جو ہر ایک کی نگاہ سے پوشیدہ تھے..

بڑا پانی ابھی تک ساتھ دے رہا تھا..

بڑے پانی.. ایک رنگ رنگیلے.. نیلے رنگیلے.. خزاں سے بھسم اور وان گوگ کی دیوانگی کے سوا کسی ذی ہوش اور نارمل ذہن میں نہ آنے والے زرد گھاس کے ٹیلوں میں سے بڑے پانی یوں راستہ بناتے تھے جیسے ایک نیلا تیزاب... خزاں کے سنہری پتوں کو جلاتا پگھلاتا ہے ان میں راستہ بناتا ہے..

بڑے پانیوں کی نیلاہٹ پر دو سفید پرندے اترتے تھے.. گھات لگاتے تھے اور پھر کبھی پرواز موقوف کر کے ان پر مزے سے تیرتے تھے..

ان میں سے ایک پرندے نے پرواز کرتے ہوئے اپنے آپ کو ساکت کیا.. پانیوں پر ایک پتھر کی طرح گرا.. ان کے اندر گیا.. اور اتنی دیر زیر آب رہا کہ ہم نے سمجھ لیا کہ پروں کی یہ پوٹلی تو اب غرق ہو چکی... وہ ایک سفید پتھر کی طرح ندی کی تہہ میں بے جان ہو چکا ہو گا... لیکن وہ پرندہ یکدم پانی کی سطح میں سے نمودار ہو کر باہر آ گیا... گیلے بدن کو جھٹکتا.. پَر پھڑپھڑاتا.. پانیوں کی قید سے آزاد ہو کر باہر آ گیا.. اپنی چونچ میں اپنے وزن سے کہیں بھاری ایک مچھلی کو دبائے.. باہر آ گیا..

اس کا ساتھی پرندہ ابھی تک... بڑے پانی کے نیلے شیشے پر ایک سفید دھبے کی طرح اس کے بہاؤ کے ساتھ بہتا جا رہا تھا اور مزے کر رہا تھا..

"صاحب یہ بیاں رینگ ہے.." عباس نے اپنے موچی دانت نکال کر کہا۔

"ہماری زبان میں اس پرندے کو یہی بولتے ہیں۔"

ہمیں کیمپ سے نکلے کچھ دیر ہو چلی تھی..

گھاس کے تین میدان ابھی بہت دور تھے..

پھر ہم بڑے پانی سے جدا ہو کر دیوسائی کے اندر چلے گئے.... جیپوں کے ٹائر ایسی گھاس پر آنے لگے جو ان کے بوجھ سے دبتی تھی تو ایک سٹیٹ آف شاک میں چلی جاتی تھی کہ یہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے.. اسے تجربہ نہ تھا.. کہ بوجھ تلے دب جانا کیسا ہوتا ہے..

دیوسائی کی صبح میں.. ایک ولی اللہ کی نیت ایسی صاف اور کھری ہوا میں سانس لیتے کچھ وقت گزر چکا تھا جب... جیپیں رک گئیں.. ایک بلند ٹیلے پر جا کر رکیں اور خاموش ہو گئیں... ان کے انجن خاموش ہوئے تو دیوسائی کی وسعت بولنے لگی..

ہم نیچے اترے..

ہمارے سامنے... ایک تھر.. ایک چولستان.. تکلا مکان.. ایک صحرائے گوبی تھا.. اگرچہ ریت کا نہ تھا.. گھاس کا تھا.. زرد گھاس کا تھا..

ایک پیالہ نما... اتنا وسیع پیالہ کہ اس کے کنارے کسی بھی مشروب سے چھلک نہ سکتے تھے... ہم بے شک اس میں اپنی چاہتوں اور محبتوں کی جتنی بھی شراب انڈیل دیتے.. بھنگ بھر دیتے.. تب بھی وہ پیالہ چھلک نہ سکتا تھا.... اور یہ گھاس کا پیالہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سے کوئی ایک چنگیز خان.. کوئی تموجن اپنے اپنے گھڑ سواروں سمیت گھاس کے کسی ٹیلے سے اتر کر ہم پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔

اور یہ صرف ایک پیالے کا بیان ہے.. پہلو بہ پہلو تین بڑے بڑے پیالے

تھے.. تین باؤلز تھے.. جن کا نظارا سامنے پھیلتا چلا جاتا تھا.. کوئی ایک درخت، کوئی ایک چھوٹی سی جھاڑی.. کچھ نہ تھا.. صرف گھاس تھی جو ہوا سے جھکی جھکی جاتی تھی اور دور تک جاتی تھی.. ہوا کی سرسراہٹ کے سناٹے میں اگر کچھ تھا تو ہم تھے.. ہم رہے... اور ہمارے سامنے زرد گھاس کا ایک صحرا ہوا سے کروٹیں بدلتا رہا.. یا پھر ان پیالوں کے اٹھتے کناروں کی قربت میں کچھ پتھر تھے اور اوپر سفید بے رحم آسمان تھا اور یا دیوسائی کی نیلی چٹانوں پر برفوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا..

دوربینیں باہر آگئیں..

میں ایک پتھر پر بیٹھا... ٹریکنگ سوٹ کی ڈھیلی پتلون میں.. سرخ ٹی شرٹ میں.. جس پر باریش اور بیہودہ موسیقاروں کی شکلیں تھیں.. اور ایک پیلی پی کیپ میں.. ایک پتھر پر بیٹھا دوربین آنکھوں سے لگائے وہاں دیکھتا تھا جہاں تینوں پیالہ نما میدان ٹیلوں سے اترتے تھے..

حلیم.. سفید ٹی شرٹ اور کاؤبوائے ہیٹ میں.. ہم سے لاتعلق.. دوربین کی مدد سے اپنے ریچھ تلاش کرتا تھا..

ان میدانوں میں کم لوگ پہنچتے تھے..

یہ "محفوظ" علاقے تھے..

یہاں اجازت نہ تھی..

میری آنکھیں دکھنے لگیں دوربین میں غور کرتے کرتے.. گھاس پر دھیرے دھیرے سفر کرتے کہ کہیں کوئی براؤن وجود خوابیدہ یا لڑھکتا ہوا نظر آجائے لیکن کچھ نظر نہ آیا.. گھاس کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں..

گھاس کے بے انت سنہری پن میں کوئی ایک پتھر نظر آتا تو میرا دم رک جاتا، میں اس کی سیاہی پر نظریں جمائے اتنی دیر تک اسے دیکھتا کہ وہ ایک براؤن ہمالین بیئر میں بدل جاتا.. آہستہ سے اُٹھتا اور تھوتھنی ہلاتا چلنے لگتا.. لیکن پھر ساکت ہو کر پتھر ہو جاتا..

"حلیم صاحب.. آپ کے ریچھ کہاں ہیں؟"

"وہ ابھی نظر آئیں گے۔" حلیم آنکھوں سے دوربین ہٹائے بغیر بڑبڑاتا "وہاں.. جہاں گھاس کے کچھ گوشے نظر آرہے ہیں.. پتھروں کی قربت میں.. وہاں میں نے ابھی ابھی محسوس کیا ہے کہ کچھ ہے"

"کیا ہے؟" میرے کسی ساتھی نے دوہائی دی..

"کیوں ہے؟" کسی نے ہڑبڑا کر پوچھا..

"ریچھ کے بارے میں یہ کیا پوچھنا کہ کیوں ہے.. اگر ریچھ ہے تو بس ہے.. اگر نہیں ہے تو نہیں ہے۔"

"نہیں ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ کچھ ہے۔"

سب لوگوں نے جو با دوربین تھے یا بن دوربین تھے، اپنی نظروں کو اس سپاٹ پر مرکوز کر دیا جہاں شنید تھی کہ کچھ ہے..

یہ عجیب ایکسائٹ منٹ تھی کہ وہاں کچھ ہے..

ہمیں چونکہ بتایا گیا تھا کہ دیوسائی میں ریچھوں کی تعداد پندرہ سولہ سے بڑھ کر ماشااللہ چھبیس تک جا پہنچی تھی.. اس لیے ہم سب اپنی دوربینوں میں ان پورے چھبیس ریچھوں کو دیکھنا چاہتے تھے.. ہم پچیس ریچھوں پر بھی قناعت کرنے والے نہ تھے.. تو ہی ناداں تھا جو چند ریچھوں پر قناعت کر گیا..

ایک زرد گھاس کا عظیم صحرا.. ویرانہ.. ایک بیاباں.. جہاں شائد آج تک کسی نے کیمپ نہیں کیا تھا.. اپنا خیمہ نصب نہیں کیا تھا.. اس ٹیلے سے اتر کر اگر میں اس ایک پیالے کے درمیان میں جا کر اپنا سلیٹی رنگ کا خیمہ لگالوں اور آج کی شب یہیں بسر کروں تو... یہ کیا ہو گا؟ شب کی تاریکی میں سرسراہٹیں اور وسعت میں مخل ایک خیمہ کیا ہو گا.. اُس زرد ویرانے میں.. جس پر دیوسائی کی برف پوش بلندیاں جھک کر دیکھتی

تھیں اور یہ دیکھتی تھیں کہ ان گھاس بھری وسعتوں میں کوئی خانہ بدوش تو خیمہ زن
نہیں.. کوئی فاتر العقل آوارہ گرد ادھر رات گزارنے کے لیے تو نہیں رک گیا.. اگر
کوئی ہے تو ہم اسے بتا دیں کہ یہاں رات ہوگی تو درجۂ حرارت نکتہ انجماد سے گرتا ہے تو
گرتا چلا جاتا ہے.. رات ہوگی تو بھورے ریچھ اور تبتی بھیڑیئے تمہارے خیمے کو
تھوتھنیوں سے سونگھنے لگیں گے اور شائد تمہیں ایک مارموٹ سمجھ کر خیمے میں داخل
ہو کر تمہیں بھی سونگھیں.. وہ چاہے تمہیں کھانے کے لائق نہ سمجھیں لیکن تم ان کے
سونگھنے سے ہی دہشت کے مارے فوت ہو جاؤ گے.. اور اگلی صبح اس کے آسمانوں پر
اڑان کرتا گولڈن ایگل نیچے دیکھے گا تو ایک بے جان خیمے کو دیکھے گا..

"حلیم صاحب.. ہمارے ریچھ کہاں ہیں.."

وہ تھوڑی دیر پہلے آپ کے ریچھ تھے، اب ہمارے ریچھ ہو گئے تھے.. ہم ذرا
ریچھ فرینڈلی ہو گئے تھے..

"میں خود حیران ہوں کہ وہ کہاں ہیں.." زرد پیالوں کی وسعت پر حلیم کی
دوربین دور دور تک جاتی تھی۔ "میں نے عرض کیا تھا کہ ہمیں دس بجے سے پہلے پہلے
یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا.. اور اب گیارہ بج رہے ہیں۔"

"گویا ریچھ ایک خاص ٹائم ٹیبل کے تحت نمودار ہوتے ہیں؟"

"ہاں..."

جب حلیم نے "ہاں" کہا تو دیوسائی کے زرد گھاس پیالوں میں اس کی آواز
دور تک گئی.. جیسے ایک جام جمشید پر جھکے مستقبل کا حال جاننے کی خواہش کرنے والے
کا سانس اس جام پر بکھرتا ہے.. یا مرزا غالب اپنے جام سفال سے گویا ہوتے ہیں کہ تو اگر
شکستہ بھی ہوتا ہے تو ہم بازار سے ایک اور لے آئیں گے.. یا پھر ہزاروں برس پیشتر
کوئی ساسانی شاہ اپنے سونے کے جام میں سے سر نکالتے سنہری بھینسوں سے پوچھتا ہے
کہ تم میرے بعد کس کو دیکھو گے... اور وہ صدیوں تک کسی کھنڈر میں مدفون رہتا ہے

اور اس پر کوئی بلوچ جھکتا ہے کہ یہ چمکتی ہوئی شے کیا ہے.. اور اسے اس ساسانی شاہ کے
بعد میں بھی دیکھتا ہوں.. اسلام آباد میں..

میں بھی تو دیوسائی کے پیالوں پر جھک کر پوچھ سکتا تھا کہ تم تو ہزاروں برس
بعد بھی یونہی گھاس سے زرد ہو گے.. تو تب تمہیں کون دیکھے گا...

"ہاں.." حلیم نے کہا تھا اور صدیوں پہلے کہا تھا اور اب وہ کہتا تھا "ہمارے
بھالو سویرے سویرے نکلتے ہیں، ان میدانوں میں گھاس چرتے ہیں اور پھر جب سورج
کی شعاعیں تیز ہو کر ان کے وجود کو بے آرام لگتی ہیں تو وہ کسی پتھر کے سائے میں لیٹ
کر قیلولہ کرنے لگتے ہیں.. میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ سویرے سویرے
ادھر آجائیں.. آپ نہیں آئے.. لیکن کیا پتہ کوئی بھالو جاگ جائے اور ہم اسے دیکھ لیں"

ایک بلند ٹیلے پر.. حلیم اور رفیق اپنی دوربینوں میں گم اس ایک ریچھ کو تلاش
کرتے تھے..

اور وہاں.. کوئی بھی ریچھ نہ تھا..

اگرچہ ہم میں سے کسی نے چونک کر کہا تھا کہ میں نے بہت دور کوئی سیاہ سی
جنبش نوٹ کی ہے.. لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا..

ریچھ گھاس نوش کرنے کے بعد خوابیدہ ہو چکے تھے..

ہم سب ایک مایوس اور دل گرفتہ فلم یونٹ کی طرح اس لینڈ سکیپ کو دیکھتے
تھے جہاں ہم بہت دور سے شوٹنگ کرنے کے لیے پہنچے تھے.. اور وہاں شوٹ کرنے
کے لیے کچھ بھی نہ تھا..

کوئی ایک ریچھ.. زرد گھاس کے بے انت صحرا میں..

کوئی ایک ناتواں سا بھالو... ہماری عزت نفس کو بچانے کے لیے...

کچھ بھی نہ تھا..

صرف ہم تھے.. ایک ٹیلے پر.. دو تین دوربینیں تھیں جن میں ایک ریچھ بھی

ظاہر نہیں ہوا تھا.. زرد پیالوں سے پرے.. برف میں ڈھکی چوٹیوں کے دامن میں..
گھاس کے میدانوں میں.. ہم سب ریچھ تلاش کرتے تھے...

اور وہ وہاں نہیں تھے..

ہم نے ایک عرصہ ریچھوں کی جستجو میں گزارا..

ان کو تلاش کرتے کرتے اپنی آنکھیں نابینا کر لیں..

لیکن وہ وہاں نہیں تھے..

خوابیدہ تھے.. پتہ نہیں کہاں.. کن پتھروں کی اوٹ میں..

میں دیوسائی میں ایک پھول کے لیے آیا تھا.. اور وہ مرجھا چکا تھا..

ایک بادل کی چاہت میں آیا تھا.. اور آج وہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا..

اور ایک ریچھ کے لیے آیا تھا.. اور میرے نصیب میں وہ ریچھ بھی نہ تھا..

اگر دس میں سے نو مرتبہ وہ دکھائی دے جاتا تھا اور مجھے وہ دکھائی نہیں دیا تھا تو یہ صرف نصیب کی بات تھی..

قسمت کی بات تھی..

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ ریچھ ہوتا..

بلکہ وصال ریچھ تو شائد صحت کے لیے مضر ہوتا ہے..

تو.. یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ دیدارِ ریچھ ہوتا..

جیپوں کے انجن سٹارٹ ہوئے تو دیوسائی کے تینوں پیالے کانچ کی طرح ٹوٹنے لگے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ریزہ ریزہ ہو گئے... اور ایسے پیالے بازار سے نہیں ملتے تھے کہ اور لے آئیں گے...

"کالا پانی کے پار گلتری روڈ پر"

بڑے پانی کے کنارے ہماری خیمہ بستی زمیں بوس ہونے لگی..

جب زرد گھاس پر میرا خیمہ سمیٹا گیا.. وہ پہلے ایک گھر تھا، اس میں جان تھی، ایک آوارہ گرد کی جان تھی.. جب اس کے راڈ اس کے بدن سے کھینچ لیے گئے تو وہ زمیں بوس ہوا، بے جان ہوا اور لپٹ لپٹا کر ایک گول تھیلے میں بند ہو گیا..

کوئی بھی خیمہ جب ایک مقام پر پیک ہوتا ہے، سمیٹ کر تھیلے میں بند کیا جاتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ اب وہ کہاں کھلے گا.. اس کے پردے کے سامنے کونسا آسمان ہوگا.. اس آسمان پر کونسا بادل ہوگا.. اس پر مینہ برسے گا یا برفباری ہو گی.. یا دھوپ ہو گی جو اس کے تن کو جلا ڈالے گی.. اور نہ ہی وہ کوہ نورد جانتا ہے جس کا وہ گھر ہوتا ہے.. ایک بستی ہوتی ہے جسے وہ کاندھے پر اٹھائے پھرتا ہے اور جہاں من کی موج ہوتی ہے وہاں اسے آباد کر لیتا ہے..

اور ایک خیمہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اگر وہ پیک ہو رہا ہے تو شائد اس برس نہیں اب وہ اگلے برس کھلے گا... یا شائد کبھی بھی نہیں کھلے گا.. کہیں سر بلند نہیں ہو گا..

اس میں قیام کرنے والا کوہ نورد جانے اگلے برس کہاں ہو... کس حال میں ہو.. ہو یا نہ ہو.. اور پھر... بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا..

حسینوں کے خطوط بھی.. تصویر بتاں بھی.. اور ایک خیمہ بھی..

اوراس خیمے میں بہت سی راتیں بھی ہوں گی.. کچھ چاند کی راتیں.. ایک ایسی رات جس میں سارے ستارے روشن اولوں کی طرح اس پر برسے تھے اور اس کے کپڑے میں چھید کر دیئے تھے.. ایسے چھید جو اس میں لیٹے ہوئے آوارہ گرد کو ہی نظر آتے تھے..

ہماری جیپ نے جب زرد گھاس کے میدان میں سے ہمیں اور ہمارے سامان کو اپنے اندر جگہ دی اور بڑے پانی کے پُل پر اپنے چاروں ٹائروں کا بوجھ ڈالا.. تو پُل کے تختے ایک لچک میں آئے.. بوجھ تلے ان کا وجود سہارنے اور نہ سہارنے کے درمیان لچکا اور اس میں سے ہلکے خوشی کے درد ایسی ایک آواز آئی.. اور پھر شکستگی کی آخری حد پر جا کر خاموش ہو گئی..

پُل کے ان تختوں کے درمیان میں سے بڑے پانی کی شیشہ نیلاہٹ نظر آتی تھی..

ہر تختے کے بعد ایک خلاء آتا تھا جس کے نیچے بڑے پانی بہتے دکھائی دیتے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے لکڑی کا ایک تختہ ہے اور پھر شیشہ نیلاہٹ کا ایک تختہ..

ہم دیوسائی کے پیالہ نما تین میدانوں سے اپنی خیمہ بستی کو واپس آئے تو بہت رنجیدہ اور دل گرفتہ واپس آئے کہ.. دیدار ریچھ ہماری قسمت میں نہ تھا..

ایسے دل گرفتہ جیسے کرسمس کی شب میں شدید برفباری میں آپ ایک کھمبے تلے کھڑے اپنی گرل فرینڈ کے منتظر ہوں اور وہ نہ آئے.. آپ جھیل کرومبر کے وصال کی خاطر صدیوں کا سفر طے کر کے وہاں پہنچیں اور وہ.. وہاں نہ ہو..

البتہ ہمیں رخصت کرتے ہوئے حلیم نے ہماری دلجوئی کی تھی "آپ منی مرگ سے واپسی پر سکردو لوٹتے ہوئے اسی روڈ سے گزریں گے تو ایک شب کے لیے رک جائیے گا.. میرا وعدہ ہے کہ میں آپ کو ریچھ ضرور دکھاؤں گا... بلکہ آپ کی غیر موجودگی کے دوران اگر کوئی ریچھ دکھائی دے گیا تو میں اسے شاٹ گن سے بیہوش

کر کے آپ کے لیے سنبھال لوں گا.. میرا وعدہ ہے۔"

یہ تو طے ہو چکا تھا کہ اب ہم منی مرگ تک پیدل سفر نہیں کریں گے بلکہ اُس جیپ میں قدم رنجہ فرمائیں گے جو ہمیں سکردو واپس لانے کے لیے منی مرگ جا رہی تھی.. یعنی خاں صاحب عبدالصمد خان کی جیپ.. اور ہم نے اس سفید ریش کج کلاہ ڈرائیور کے ساتھ اپنے راستے کا تعین کچھ اس طرح کیا تھا کہ آج ہم بڑے پانی سے روانہ ہو کر ایک اور معروف ندی کالے پانی کے پار جا کر سیدھے چلم چوکی کی طرف سفر نہیں کریں گے بلکہ بائیں جانب گلتری روڈ پر مڑیں گے جو ہمیں ایک درّے کے پار چھوٹے دیوسائی میں لے جائے گی.. ہم مرتضےٰ چوکی پہنچ کر شعبان ٹاپ کراس کریں گے اور منی مرگ پہنچ جائیں گے.. رات وہاں بسر کریں گے.. اور کل وہاں سے کوچ کر کے درّہ بروغل کے پار چلم چوکی پہنچ کر ایک مرتبہ پھر دیوسائی پر آئیں گے.. اور جھیل شیوسر کے کناروں پر سفر کرتے ہوئے سکردو کے راستے میں پھر بڑے پانی میں صرف اس لیے رات کریں گے تا کہ اگلی صبح... دیدارِ ریچھ..

تو راستوں کا تعین کچھ یوں کیا گیا..

جیپ بڑے پانی کے پل پر سے اٹکتی، اس کے تختوں کی آہ وزاری سے بے نیاز پار اتر گئی.. پار ہوئی تو شمش کٹ ٹاپ پر چڑھنے کی کوشش میں ناک آسمان کو کر لی..

میں اور میاں صاحب جیپ کی فرنٹ سیٹ پر اپنی بزرگی کی دھاک سے بیٹھے ہوئے تھے اور پیچھے کل سامان سمیت اور اس میں جا بجا پھنسے ہوئے ہمارے ساتھی تھے اور علی تھا.. اور علی مدد تھا.. اور عباس تھا..

بقیہ پورٹروں کو رخصت کر دیا گیا تھا..

اگرچہ ہمیں علی مدد گائڈ کی اب ہرگز ضرورت نہ تھی.. لیکن ہم نے تھوڑا سا لحاظ کر دیا.. البتہ علی مدد ہمارے لیے بیش قیمت تھا.. زبردست باورچی تھا اور ایک خیال رکھنے والا ہمدرد شخص تھا.. اور عباس اس لیے ہمراہ تھا کہ ہمیں سکردو کا یہ موچی بہت

پسند تھا.. ہماری پیدل مسافتوں کے دن بڑے پانی پر ڈھل چکے تھے کہ اب ہم جیپ میں سوار تھے..

شمش کٹ ٹاپ پر پہنچے تو سامنے ایک اور دیوسائی تھا.. کراں تا بہ کراں پھیلا ہوا زرد گھاس کا حیرت بھرا ایک اور زرد صحرا.. ایک اور دیوسائی..

دیوسائی ایک نہ تھا.. کئی تھے..

ہر ٹیلے... ہر درّے.. ہر موڑ کے دوسری جانب ایک اور دیوسائی تھا..

دیوسائی ایک ایسا سچ تھا.. جہاں ایک پردہ اٹھتا تھا تو اس کے پیچھے ایک اور سچ نظر آنے لگتا تھا.. ایک اور پردہ ہٹتا تھا تو اس کے عقب میں سے ایک اور دیوسائی نظر نواز ہوتا تھا اور بے انت.. اور بے بہا پھیلاؤ ایک اور حیرت کدے میں بدلتا تھا..

عبدالصمد خان میری اُلفت میں جتنا بے دریغ ہوتا تھا اتنا ہی احتیاط پسند.. اختیار کے ساتھ دریغ کے ساتھ جیپ ڈرائیو کرتا تھا..

جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے وہ ایک مکمل پروفیشنل تھا.. ہم سے بات کرتا تھا لیکن نظر روڈ پر رکھتا تھا" تارڑ صاحب.. ابھی تو دیوسائی پر ٹورسٹ لوگ آنے لگا ہے.. لیکن دس بیس برس پہلے کا بات ہے کہ صرف گلتری کا لوگ سکردو جانے کے لیے اور اشیائے خوردونوش خریدنے کے لیے دیوسائی کراس کرتا تھا اور مرتا تھا.. کچھ گھوڑوں پر آتا تھا اور باقی پیدل آتا تھا اپنے گھی، نمک اور آٹا کے لیے... ادھر سے جس نے راولپنڈی جانا ہوتا تھا تو گھوڑے پر جاتا تھا.. صرف بکر ّوال ہے جو پنجابی لوگ ہے جو ہمیشہ سے آتا ہے.. مظفر آباد- کیل- منی مرگ اور قمری کے راستے چھوٹا دیوسائی میں پہنچ کر اوپر آتا تھا.. ادھر ہمارے علاقے میں، استور میں تو ایک پرانا کہاوت تھا کہ جس کا قسمت برا ہو وہ دیوسائی پر جاتا ہے.."

"آپ استور کے ہیں؟"

"بے شک" صمد خان نے سٹیئرنگ ایک ہاتھ اٹھا کر اپنا کج کلاہ سیدھا کیا

"ہاں.. استور ہی تو شہر تھا.. یہ سکردو تو یارا دو نمبر مال ہے.. تمہیں پتہ ہے کہ پہلے سرینگر ے جتنا ٹریفک آتا تھا تو استور میں آتا تھا.."

اہلِ استور اور سکردو کے رہنے والوں کا آپس میں ہمیشہ جھگڑا رہا ہے..

دیوسائی.. جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں.. بڑے پانی تک استور کی عملداری میں ہے اور اس کے پار سکردو کا علاقہ ہے..

استور والوں کو یہی دکھ ہے کہ جب بھی دیوسائی کی بات ہوتی ہے تو سکردو کا ذکرہ آتا ہے اور استور کو بھلا دیا جاتا ہے.. ایک زمانے میں استور اِن علاقوں کا مرکز تھا.. سرینگر اور پورے کشمیر کے لوگ جب ادھر آتے تھے تو استور میں ہی اترتے تھے.. پھر پاکستان بن گیا.. سکردو میں جہاز اترنے لگا.. جیٹ اترنے لگا تو اس کی اہمیت بڑھ گئی اور استور جو ایک نہایت دشوار درہ نما روڈ کی تنگنائیوں میں سے گزر کر سامنے آتا تھا، لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا گیا..

صرف ہماری جیپ تھی جو دیوسائی پر جھکے سفید اور سرمئی بادلوں کے اندر تک سفر کرتی تھی..

صرف ایک کچی روڈ تھی اور صرف ہم اس پر سفر کرتے عظیم وسعتوں کے اندر سفر کرتے تھے..

"صاحب ہم نے صرف آپ کے لیے چھٹی لیا.. ورنہ ادھر گلگت میں ہمارا اباجان آیا ہوا تھا اور ہم اس کو چھوڑ کر صرف تمہارے لیے ادھر آ گیا..."

خان صاحب کی شباہت سے یہ قطعی طور پر مترشح نہیں ہوتا تھا کہ ان کے والد صاحب بھی ابھی تک قید حیات میں ہیں "کتنی عمر ہے اباجان کی ماشاءاللہ.."

"یارا کچھ پتہ نہیں.." خاں صاحب جیپ روڈ کی اونچ نیچ پر نظریں جمائے رہے "پر اتنا پتہ ہے کہ ہم سے بڑا عمر کا ہے.."

"تو آپ کا ابا.. ادھر گلگت میں آتا تھا.. پھر کیا ہوا؟"

"یار اس نے استور واپس جانا تھا تو استور روڈ بلاک ہو گیا.... ہم نے بہت کہا کہ ابا جان ادھر ٹھہرو.. انتظار کرو.. روڈ کھلے گا تو تم کو ایک اچھا والا جیپ میں بٹھا کر استور بھیجے گا لیکن.. یار ایہ جو پرانا لوگ ہے یہ انتظار نہیں کر سکتا... یہ کہتا ہے کہ کل تو کیا معلوم آتا کہ نہیں آتا تو... آج ہی سفر شروع کرو... تو وہ گلگت سے پیدل ہی استور روانہ ہو گیا.. ہم نے روکا تو ہم کو گالیاں نکالا.."

"بابا جی.. گلگت سے پیدل روانہ ہو گئے استور کے لیے.." میاں صاحب نے بے یقینی میں پوچھا..

"روکتا تھا تو گالیاں نکالتا تھا.. ہم کیا کرے ابا جان ہے.."

"لیکن ان کی عمر کتنی ہے؟" پھر پوچھا گیا..

"یار اکچھ حساب نہیں.. پچاس کا ہو گا.. سو کا ہو گا.. کچھ پتہ نہیں"

جیپ روڈ کے آس پاس کہیں کہیں پتھروں کے کچھ ڈھیر نظر آتے تھے. ٹیلے تھے.

"یہ جو پتھر ہے تو ادھر کا نہیں.. ادھر لا کر رکھا گیا ہے.. ادھر کا ایک راجہ تھا.. اس کا جتنا سپاہی جنگ میں مارا گیا.. ان سب کا گنتی کیا اور پھر اتنا پتھر گنتی کر کے ادھر روڈ کے کنارے رکھا یادگار کے طور پر.."

گویا ہر پتھر ایک سپاہی تھا.. ایک مردہ تھا..

جیپ کا اگلا حصہ جو ونڈ شیلڈ کے پار اُچھلتا اور بے قابو ہوتا تھا یکدم سادھو ہو کر شانت ہو گیا اور جیپ یکدم نیچے اترتی گئی..

اور نیچے.. دو ڈھلوانوں کے درمیان کالے پانی بہتے تھے..

ہم نے سنا تھا کہ کالے پانی... رُوسیاہ ہیں.. اتنے سیاہ فام ہیں کہ دکھائی نہیں دیتے اور اگر پُرجوش ہوں تو جیپ کو پار نہیں جانے دیتے..

لیکن یہ سب کہاوتیں تھیں..

اگرچہ ان میں سچائی تھی.. اگر کالے پانی زور میں ہوں تو جیپیں رک جاتی ہیں

ان کے دھیما ہونے کا انتظار کرتی ہیں لیکن آج وہ اطمینان سے بہتے تھے.. ہماری جیپ ان میں اتری.. کہیں اس کی تہہ کے پتھروں پر پھسلتی، کہیں زور لگاتی پہیے گھماتی.. اور کہیں آلودگی پھیلاتی دھواں چھوڑتی.. وہ پار چلی گئی..

کالے پانی کے نالے سے بلند ہو کر ہم دائیں جانب ہوئے اور نیچے گہرائی میں بہتے ہوئے اس بلیک واٹر کے متوازی سفر کرنے لگے..

پھر وادی مزید وسیع ہوئی اور ہم اس سیاہ ندی کی سطح پر آ کر سفر کرنے لگے..

اور ہمارے آس پاس کیا منظر تھا..

میں کالے پانی پر اُمڈی ہوئی اس دیوسائی وادی کا کیا ذکر کروں.. اس کی وسعت اور تنہا گھاس کے قریب میدانوں کی دلکشی کا کیا تذکرہ کروں.. وہ بلندیوں اور حیرتوں کے ایسے باب تھے جن کا ہر ورق جب پلٹا جاتا تھا تو اس پر دل کو روک دینے والا ایک اور ہی منظر ہوتا تھا..

کالے پانی اس تنہا وادی کی ویرانی میں بہتے تھے..

اور حلیم کے بقول یہی وہ ٹھنڈک بھری ویران وادی تھی جس میں "بگ بوائے آف کالا پانی" رہتا تھا.. اور اس نے خاص طور پر ہمیں ہدایت کی تھی کہ یہاں سے گزرتے ہوئے اس ویرانہ ہریاول کے وسیع فریب کو بہت غور سے دیکھیں شائد بگ بوائے اس لمحے وہاں گھاس پر لوٹنیاں لگا رہا ہو..

اسی لیے ہم نے چلتی جیپ میں سے نظریں اُدھر کیں.. بہت ہی غور سے دیکھا.. اپنی آنکھوں کو دوربین کیا لیکن ہم نے سوائے دیوسائی کی ویران اور بلند تنہائی کے اور کچھ نہ دیکھا..

خاں صاحب ذرا آہستہ ہوئے.. گیئر بدلا.. جیپ ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی.. دیوسائی روڈ میں سے دائیں جانب ایک ذیلی کچا راستہ نکلتا تھا..

"خاں صاحب.. کیا بات ہے؟"

"اگر تو ہم سیدھا جاتا ہے تو شیوسر جھیل کے کنارے سے چلم چوکی میں اترتا ہے، اور اگر ہم دائیں جانب جیپ موڑ کر اس راستے پر جاتا ہے تو یہ گلتری روڈ ہے اور ہم چھوٹا دیوسائی میں جانکلتا ہے.. کدھر جائے گا؟"

"خاں صاحب.. بڑے پانی میں یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ ہم سیدھے چلم چوکی نہیں جائے گا.. ادھر سے مڑ کر گلتری روڈ پر جائے گا تو.. جائے گا۔"

"کیسے جائے گا؟"

"کیوں؟"

"ذرا راستے کو دیکھو یارا.. برفباری کے بعد ادھر سے کوئی جیپ نہیں گیا۔ ٹائر کا کوئی نشان نہیں ہے.. راستے میں برف کا کیچڑ ہو گا.. کیا پتہ بلاک ہو.. اور اگر ہم ادھر جیپ لے کر جاتا ہے تو صرف ہم ہو گا اس روڈ پر.. جیپ کو کوئی پرابلم ہوتا ہے تو ادھر سے کوئی گزرتا ہی نہیں.. تو کون مدد کرے گا.. رات ہو گا تو بس مر جائے گا.. تو اب آپ بول دو کہ کدھر سے جائے گا.."

"آپ بولو.."

"ہم نہیں بولے گا.. ہم ڈرائیور ہے.."

"جو کوئی بھی دیوسائی کو عبور کرتا ہے تو کدھر سے جاتا ہے خان صاحب؟"

"وہ سیدھا چلم چوکی جاتا ہے.. ادھر سے مڑ کر گلتری روڈ پر کوئی نہیں جاتا.."

"تو پھر جدھر اور کوئی نہیں جاتا.. ادھر چلو.. گلتری روڈ پر.."

"ٹھیک ہے.. ہم تو ڈرائیور ہے.."

خاں صاحب نے جیپ سٹارٹ کی.. سٹیئرنگ گھمایا.. دیوسائی روڈ کے صراطِ مستقیم کو چھوڑا اور بائیں جانب جو ایک مخدوش سا ٹریک تھا.. جس پر ابھی برف کے آثار تھے.. اس پر جیپ ڈال دی..

اس راستے پر.. جگہ جگہ پانی تھے.. برفوں کی پگھلاہٹ کے آثار تھے... کیچڑ تھا

اور گھاس تھی... اور مین روڈ سے ہٹ جانے کا خوف تھا..

جیپ کے ٹائر.. پھسلتے تھے.. رک جاتے تھے... بمشکل گھومتے تھے..

اگرچہ دیوسائی روڈ بھی ویران تھی... ہم تنہائی میں سفر کرتے تھے لیکن وہاں کچھ اطمینان تھا.. ہم ایک ایسے راستے پر تھے جو سکردو سے استور تک جاتا تھا اور ہم "محفوظ" تھے.. لیکن یہاں.. ہم بہت ڈر میں تھے.. نہیں جانتے تھے کہ کہاں ہیں.. کدھر سفر کرتے ہیں..

آس پاس.. پرفریب زرد گھاس کی وادیاں.. جہاں تک نظر جائے.. ایک بڑی وسعت اور چپ.. اور تیز ہوا اور تنہا ہم.. اور ہماری جیپ.. ایک نا آشنا راستے پر..

ہم اٹکتے ہوئے پھر سے بلند ہونے لگے..

ایک اور بلندی ہمارے سامنے تھی..

جیپ کے ٹائر گھومتے بہت تھے لیکن برف اور پانی میں پھنس کر لاچار ہوتے تھے.. ہم نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا...

"خاں صاحب.."

"یارا آپ بولو تو ہم واپس جاتا ہے.. مومن لوگوں کی طرح دیوسائی روڈ پر واپس جاتا ہے اور چلم چوکی پہنچتا ہے.. ادھر پھنس گیا تو کوئی مدد کو نہیں آئے گا... اور ذرا سامنے دیکھو.. ادھر ایک درّہ ہے.. کیا پتہ اس کا برف پگھلا ہے یا نہیں.. اگر نہیں پگھلا تو روڈ بلاک ہو گا.. پھر کدھر جائے گا.. تو آپ بولو مومن لوگوں کی طرح ادھر واپس جا کر دیوسائی روڈ کو واپس جاتا ہے.. تو کیا کرے.. ہم تو ڈرائیور ہے"

"ہم تو مومن لوگ نہیں ہے خاں صاحب.." میں نے کہا "بس آگے جاتا ہے اور دیکھتا ہے.. درّہ پر برف ہو گا تو واپس آ جائے گا.."

جب ہم ذرا اوپر ہوئے تو ٹاپ پر ایک میدان تھا..

عجیب خوش نظر میدان تھا.. جو کبھی دیکھا.. نہ سنا.. اور اب ہم دیکھتے تھے.. ایک

کنوارا اَن چُھوا گیلا سرسبز گھاس کا میدان جس میں کہیں کہیں سرخ پتوں والی جھاڑیاں تھیں اور گزشتہ برفباری کے سفید ڈھیر تھے.. بڑا "غدر" منظر تھا۔

"یارا جیپ روک لو.."

"کیوں؟"

"خاں صاحب یارا اس میدان میں سے یونہی گزر جانے سے یہاں نہ رکنے سے بڑا گناہ ہوتا ہے.."

"گناہ ہوتا ہے تو ہم روکتا ہے" خاں صاحب نے جیپ روک دی..

جیپ رکی تو جو ویرانی اور ٹھنڈک ٹھٹک کر دور کھڑی تھی ایک پل میں آئی اور ہمیں گھیر لیا.. ہم اس کے نرغے میں آگئے.. دیوسائی کی وادیوں سے بھی بلند سطح پر ایک میدان میں.. جہاں آسمان جھکا ہوا تھا.. بلند نہ تھا اس منظر کا ایک نیلا حصہ تھا..

. صرف جیپ روڈ تھی جو اس میدان کو مجروح کرتی تھی لیکن وہ بھی ایک عرصے سے استعمال میں نہیں آئی تھی اس لیے اس کی مٹی پر گھاس رینگتی ہوئی اسے ڈھکنے کو تھی اور برف تھی..

جیپ رکی تو اس میدان کی بے پناہ تنہائی، ویرانی اور خوبصورتی کے طلسم نے ہمیں گرفتار کرنے کو اپنا جال پھینکا.. اور ہم اس کے نرغے میں آگئے..

میرے ساتھی بکھرنے لگے اس میدان میں..

خاص طور پر وہ حضرات جو جیپ کے پچھلے حصے میں سامان میں ٹھنسے بیٹھے تھے اور چلتی جیپ میں دیوسائی کی سرد ہواؤں کو سہتے چلے آئے تھے..

اب وہ کیمرے کھولے.. اس منظر کی ہوس میں آنکھیں کھولے اس بے بہا بلند اور سبز میدان میں گھومنے لگے.. وہ سب کے سب اس لمحے مالک تھے اس بلند سرسبز تنہائی کے.. جہاں تک صرف وہ پہنچے تھے..

ہمارے گڈریے.. خاں صاحب نے جب اپنی بھیڑوں کو یوں بکھرتے دیکھا

تو مجھ سے مخاطب ہوا "یارا منی مرگ ابھی بہت دور ہے۔ راستے میں رات ہو گیا تو کیا کرے گا.. ادھر کیا دیکھتا ہے.. چلو.."

"چلو.." میں نے پھر کہا اور خاں صاحب نے جیپ سٹارٹ کر دی..

اور سب لوگ.. اور ان میں میں بھی شامل تھا.. جو شائد یہاں بس چکے تھے آباد ہو چکے تھے اس بلند تنہائی کی ٹھنڈک اور ویران اجاڑ میں.. اس غارت گر ہوش منظر نے.. انہوں نے اور میں نے اپنے آپ کو بہت ناپسند کیا کیونکہ میں نے ہی حکم دیا تھا کہ... چلو!

"چھوٹا دیوسائی اور سبحان اللہ.. سبحان اللہ"

جیپ.. نیلی جیپ حرکت میں آئی اور ہم اس میدان کے دوسری جانب اترنے لگے..

لیکن اب کوئی راستہ نہ تھا.. برف اور گھاس نے اسے ملیامیٹ کر دیا تھا.. اس لیے جیپ کبھی تو دیوسائی کی وسعت میں بے مہار چلنے لگتی.. گھاس کو روندتی اپنی موج میں جدھر چاہتی ادھر کا رخ کر لیتی اور کبھی کبھار جب راستے کے نشان دکھائی دیتے تو واپس اس پر آ جاتی..

جیپ بلندی سے نیچے آ گئی..

جیپ روڈ کے پہلو میں.. دائیں جانب ایک اور وسیع اور سپاٹ اور سنہری گھاس سے اٹا ہوا میدان تھا جس کے آخر میں قطار اندر قطار برف پوش چوٹیاں تھیں اور ان پر جو آسمان تھا وہ عجیب رنگ کا آسمان تھا.. میں اسے بیان اس لیے نہیں کر سکتا کہ میں نے ایسے عجیب رنگ کا آسمان پہلے دیکھا نہ تھا.. آپ کہیں گے کہ ہر بار یہ شخص یہی کہتا ہے کہ ایسا منظر یا ایسا بادل پہلے نہیں دیکھا تھا.. تو میں کچھ نہیں کر سکتا اگر میں نے ایسے عجیب رنگ کا آسمان پہلے نہیں دیکھا تھا تو... جھوٹ بولوں کہ دیکھا تھا..

چلیے میں اسے بیان کرنے کی سعی کرتا ہوں..

اس میدان اور برف آلود چٹانوں پر جو آسمان تھا وہ مٹیالا اور نیم سیاہ تھا.. کہیں

ہلکے سلیٹی رنگ کا ہوتا تھا اور اس میں سے جو روشنی اترتی تھی وہ بھی نیم سیاہ تھی.. گذرتی نہ تھی.. اس آسمان پر جو بادل تھے وہ گھپ اندھیرے تھے اور ان میں سے ایک عجیب روشنی نازل ہوتی تھی جو برف پر پڑتی تو اس کی سفیدی کو مٹیالا کرتی اور جب وہ نیچے میدان پر بچھتی تو اس کی زردی کو سیاہی میں بدلتی.. یہ ایک عظیم جادوگر کے کرشمے تھے.. ایک بڑے طلسم کے معجزے تھے اور یقین میں نہ آتے تھے.. ایک ایسا منظر تھا ویران، تنہا اور عجیب رنگوں والا کہ اسے کوئی منکر دیکھتا تو ایمان لے آتا.. اور اگر ایمان والے کے سامنے آتا تو وہ.. منکر ہو جاتا.. یہ ایک ایسا منظر تھا..

جیپ برف کے آثار میں پھنستی ہوئی بمشکل گزرتی تھی اور دھچکوں سے آگے جاتی تھی.. روڈ پر کیچڑ تھا اور پانی بھی.. کہیں یہ دونوں مل کر دلدل میں بدلتے تھے اور پھر جیپ ایک ہی مقام پر اٹک کر زور لگانے لگی.. ہانپتی ہوئی، ملیریا بخار میں مبتلا ایک مریض کی طرح کانپتی ہوئی چاروں ٹائر گھمانے لگی.. اور ایک ہی جگہ پر تادیر گھماتی گئی..

"یارا اترو..." خان صاحب نے اپنی ڈرائیوری کا پورا زور صرف کرنے کے بعد کہا "ہم کہتا تھا کہ اس روڈ پر نہ آؤ.. ادھر سے ابھی ٹریفک چالو نہیں ہوا.. جیپ پھنس گیا ہے.."

ہم سب یارا اتر گئے..

ایک نیلی جیپ... جو کسی نقشے پر نہ تھی.. دیوسائی کے اندر کہیں گم تھی..

عبدالصمد خان نے اپنے سنہری کلاہ کی پرواہ کیے بغیر... جہاں کہیں کوئی چھوٹا موٹا پتھر نظر آیا وہ اپنی جھولی میں بھرا اور جیپ کے ٹائروں کے قدموں پر ڈھیر کر دیا.. وہ بہت دیر تک اس مشقت میں مشغول رہا اور پھر جیپ میں بیٹھ کر اسے دلدل میں سے باہر کرنے کی کوشش کی.. لیکن پتھروں کے آسرے کے باوجود چاروں ٹائر ایک ہی مقام میں گھومتے چلے گئے..

خاں صاحب نے طیش میں آ کر زمین پر تھوکا اور کہنے لگے "یارا آپ اِدھر

اُدھر سیر سپاٹا کرتا ہے.. تماشا دیکھتا ہے.. اُدھر سے خشک مٹی لے کر آؤ اور کیچڑ میں ڈالو.. ورنہ اِدھر ہی رات ہو جائے گا.."

اگر ادھر رات ہو گیا تو کیا ہو گا..

اگرچہ وہی ہو گا جو منظور خدا ہو گا.. لیکن یہ بھی ہو گا کہ خیموں اور خوراک کے بندوبست کے باوجود ہم یہاں کئی دن پڑے رہیں.. ادھر سے کسی اور جیپ کا گزر تو نہیں ہونا تھا.. زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ ہم کسی پورٹر کو پیدل سکردو روانہ کریں اور وہ وہاں سے مدد لے کر آئے.. تو کتنے دنوں میں آئے..

خاں صاحب اب اپنی جھولی میں مٹی بھر بھر کر لانے لگے..

ہم سب بھی اسی کام میں جُت گئے..

بلکہ میں نے اور میاں صاحب نے تو بس مٹھی بھر مٹی ڈالی اور پھر اپنی بزرگی کا ٹرمپ کارڈ دکھا کر جیپ مقام سے ذرا اوپر کی جانب چلے گئے.. ذرا اوپر جا کر نیچے دیکھا تو دیوسائی کی وسیع دنیا میں ہماری جیپ ایک نیلے دھبّے کی طرح دکھائی دے رہی تھی اور ہمارے ساتھی کچھ مکوڑے سے نظر آنے لگے جو گھاس میں رینگ رہے تھے..

ہم دونوں گھاس پر بیٹھ کر... ایک ڈرے ہوئے دل کے ساتھ.... کہ جانے جیپ اس دلدل میں سے باہر آتی ہے یا نہیں.. انتظار کرنے لگے..

کہیں میرے اندر آس کا ایک ایسا دِیا ٹمٹماتا تھا جو یہ کہتا تھا کہ یہ جیپ پھنسی رہے.. اور اس میدان میں ہم خیمے نصب کریں.. اور بہت دن ٹھہریں.. یہ کیا ضروری ہے کہ ہم مُنی مرگ جائیں..

جس گھاس پر ہم بیٹھے تھے وہ لمحہ بہ لمحہ سرد ہوتی تھی..

اور پھر ایک مدت کے بعد ہمارے کانوں میں ایک خوش کن آواز آتی ہے..

جیپ کے سٹارٹ ہونے اور پھر دلدل میں سے باہر آ کر رواں ہونے کی آواز آتی ہے..

اور فاصلے کی وجہ سے بہت دیر کے بعد ہم تک آتی ہے..

جیپ رواں ہو کر اوپر ہم تک آ جاتی ہے اور ہمیں بٹھانے کے لیے رکتی ہے "یارا جلدی بیٹھو.. ابھی منی مرگ بہت دور ہے" خان صاحب نے تقریباً ڈانٹ کر کہا..

میں اور میاں صاحب گرتے پڑتے بیٹھ گئے "منی مرگ کدھر ہے خاں صاحب؟"

"وہ جو سامنے بڑا پہاڑ ہے اس میں ایک روڈ ہے.."

"روڈ ہے؟" ہمیں تو اس پہاڑ میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا..

"ہاں.. روڈ ہے.. تو ہم ادھر سے اتر کر اس پر چڑھے گا.. پھر نیچے اترے گا تو چھوٹا دیوسائی آئے گا.. وہاں سے شعبان ٹاپ کے اوپر جائے گا.. اسے کراس کرے گا تو پھر منی مرگ دکھائی دے گا.. یارا جلدی کرو"

اب ہم منظروں سے ذرا خوفزدہ ہو گئے.. انہیں دیکھنے کی چاہت نہ رہی کہ ایک ہراس ہم میں بھر گیا... کہ ابھی منی مرگ بہت دور ہے.. مختصر موت کی وہ وادی ابھی طویل فاصلوں پر ہے.. دیوسائی سے آگے.. چھوٹے دیوسائی سے پرے.. درّہ شعبان کو ابھی عبور کرنا ہے اور پھر... منی مرگ..

ہم نیچے گئے.. ایک تیز نالے کو بمشکل عبور کیا اور پھر اس بڑے پہاڑ کے اوپر آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے چڑھنے لگے..

جب آپ ایک شکل کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہیں.. جیسے بڑے پانی کی سنو کارپ زرد گھاس پر تڑپتی تھی... اور پھر وہ شکل شب و روز کے تسلسل میں روزانہ کی ایک تصویر بنتی ہے.. دن رات سامنے رہتی ہے.. آپ راتوں کو سوتے ہیں، دن کو اکٹھے بیدار ہوتے ہیں تو وہی شکل جس کے لیے آپ تڑپتے ہیں.. ایک روٹین میں بدل جاتی ہے.. چارم اور چاہت میں کمی ہو جاتی ہے... کچھ ایسے ہی ہم دیوسائی کی شکل دیکھنے کے لیے بہت تڑپے تھے لیکن اب ہم اسے بہت دیکھ چکے تھے.. شب و روز اس کی رفاقت میں بسر کر چکے تھے اور وہ ایک روٹین میں بدل چکی تھی..

جیپ اس بڑے پہاڑ پر ذرا بلند ہوئی.. مزید بلند ہوئی.. اور پھر وہ بہت بلند

ہوئی.. اتنی بلند کہ اس کے بعد کوئی اور بلندی نہ تھی..

اور تب جیپ کی ونڈ شیڈ میں چھوٹے دیوسائی کا ایک منظر میرے سامنے کھلا..

اور کیسا سبحان تیری قدرت والا منظر کھلا..

چھوٹا دیوسائی ایک تصویر تھا..

ہم بلندی پر تھے اور وہ ہمارے سامنے ایک وسیع تصویر تھا.. اور اس تصویر میں ایک سرسبز وادی میں ایک لہریئے لیتی ندی کا وجود کسمساتا چاندی میں بدلتا بہتا تھا.. اس وادی میں کہیں کہیں بے آب و گیاہ خطے تھے اور کہیں گہری سبز رنگت والی ڈھلوانیں تھیں جن کے درمیان میں وہ ندی بہتی تھی.... اس بلندی سے ندی کا بہاؤ تھما ہوا لگتا تھا.. اور اس پر بے شمار برفوں کا جھکاؤ تھا..

میں گُنگ بیٹھا رہا..

متحرک جیپ کی ونڈ شیلڈ میں سے نظر آنے والے چھوٹے دیوسائی کو دیکھ کر میری زبان تالو سے چپک گئی اور میں نے صرف اتنا کہا "سبحان اللہ..."

کچھ دیر گُنگ رہا اور پھر کہا "سبحان اللہ"..

"ہاں جی.." میاں صاحب بھی بہت مشکل سے بولے "سبحان اللہ"

شائد میں نے زندگی بھر اتنی بار سبحان اللہ نہ کہا ہو جتنی بار چھوٹے دیوسائی کی پہلی جھلک دیکھنے پر کہا تھا.. میں اس کی شان میں کچھ نہ کہہ سکتا تھا.. صرف اسے دیکھتا تھا اور زیر لب سبحان اللہ کہتا چلا جاتا تھا..

ہم سے کہیں نیچے چھوٹے دیوسائی کی وادی تھی..

اور ہم ایسے پرندے تھے جو پرواز بھول کر اس پر نظر کرتے تھے.. اپنی چونچوں کو سختی سے بند کرتے تھے کہ وہ اس وادی کے حسن بلاخیز کے حیرت کدے کو دیکھ کر حیرت سے کھلتی تھیں.. ہم ابھی ان بادلوں کی ہمسائیگی میں تھے جن کے نیچے چھوٹے دیوسائی کی وادی تھی.. اور اس وادی کے گرد جو پہاڑ تھے ان پر برف کم تھی اور ہریاول

دھو میں مچاتی تھی اور اس کے درمیان میں ایک پگھلتی پارہ ندی تھی.. کوئی درخت کوئی جھاڑی نہ تھی صرف ہریاول بھری وادی اور ندی کے پانی تھے..

میرا تو دم رُکنے کو آ رہا تھا..

جیپ کی ونڈ شیلڈ پر وہ یوں تصویر ہوتی جیسے اس کے رنگ اس کے شیشے پر پینٹ کر دیئے گئے ہوں..

ایک شخص جس کا دم رک جائے.. وہ گُنگ ہو جائے تو وہ کیا کہہ سکتا ہے.. صرف سبحان اللہ.. سبحان اللہ..

ایک خاموشی تھی جو اتر آئی تھی..

نہ جیپ حرکت میں تھی نہ کوئی اور صدا تھی اور نہ ہوا کی آواز تھی.. وہ طلسم کدۂ قدرت ہماری نظروں کے سامنے تھا اور ہر شے تھمی ہوئی تھی..

چاند پر بھی اِسی زمین.. اسی چھوٹے دیوسائی کے حُسن کا پرتو پڑتا تھا تو وہ روشن ہو کر کرنیں بکھیرتا تھا اور نہ اس کے ٹیلے اور پتھر اس دنیا کے حسن دل پذیر کے سامنے ہیچ تھے..

مریخ پر بھی کیا رکھا تھا.. اگر ان سیاروں پر کوئی مخلوق ہوتی تو کب کی اس دنیا میں اُتر چکی ہوتی صرف چھوٹے دیوسائی کی وادی کو دیکھنے کے لیے.... اگر وہ مخلوق یہاں آئی نہیں تو ہو گی ہی نہیں..

جیپ کے پچھلے حصے میں رُک سیکوں اور سامان کے نیلے ڈرموں میں پھنسے میرے ساتھی جو پورے سفر کے دوران غُل مچاتے آئے تھے اب کچھ نہ کہتے تھے.. چھوٹے دیوسائی کے نظر آتے ہی چُپ اور شانت ہو چکے تھے..

دیوسائی.. اے دیوسائی.. اے چھوٹے دیوسائی..

پھر ہم اس منظر کی بلندی سے نیچے ہونے لگے..

اترائی شروع ہو گئی..

جیپ نے گیئر بدلا... لواری ٹاپ کے پار اترتے ہوئے جیسے درجنوں موڑ

آتے ہیں، بھول بھلیاں اور پیچیدہ راستے آتے ہیں ویسے ایک راستہ بل کھاتا ہوا نیچے جارہا تھا اور ہماری جیپ اس راستے پر کسی تردّد کے بغیر اترنے لگی..

نیچے.. وادی کے کناروں پر... ہمارے قدموں کے نیچے ایک ندی کے پہلو بہ پہلو.. چھوٹے دیوسائی کے دامن میں ایک کچی سڑک دکھائی دے رہی تھی اور وہاں دو بدرنگ کوٹھڑیاں تھی جن کی ہموار چھتوں کو ہم اوپر سے دیکھتے نیچے آرہے تھے..

"صاحب.. یہ مرتضٰے چوکی دکھائی دے رہی ہے... ادھر ہم تھوڑا ریسٹ مارے گا اور چائے پی کر منی مرگ کو چلا جائے گا"

اگرچہ گہرائی میں گرتی روڈ پُرپیچ بہت تھی لیکن عبدالصمد خان اپنی تمام تر شوخی اور الفت فراموش کر کے ایک پر تفکر چہرے کے ساتھ سٹیئرنگ کو اتنے انہاک کے ساتھ کنٹرول کر رہا تھا جیسے ناسا کے کنٹرول روم میں کوئی سائنس دان مریخ گاڑی اتار رہا ہو..

جوں جوں ہم نیچے ہوتے گئے چھوٹا دیوسائی اپنی کشش کم کرتا گیا.. وہ درّے کی چوٹی سے، آسمان کی رفعتوں سے ہمارے نیچے اپنی پوری وسعت میں ایک جہان کی طرح دکھائی دیا تھا اور اب ہم نیچے ہوتے تھے تو وہ جہان مختصر ہوتا جاتا تھا..

اس کے درمیان میں جو ندی اترتی تھی وہ ہمارے درّے اور اس چھوٹے دیوسائی کے درمیان میں جو وادی تھی اور اس میں جو ایک کچی سٹرک تھی وہ وہاں تک اتر کر ایک بڑے نالے میں شامل ہو رہی تھی.. نالے کی سفیدی اور شفافی کے کنارے جو ہریاول گھاس تھی وہ گیلی اور نچڑی ہوئی تھی اور آنکھوں میں سبزہ بھرتی تھی.. اسی نالے سے ذرا بلند سطح پر سڑک کے کنارے بے آباد لگتے کچھ بیرک نما کمرے تھے جن پر ٹین کی چھتیں تھیں اور انہیں تیز ہوا کی زد میں آکر اڑ جانے سے بچانے کے لیے ان پر بھاری پتھر رکھے ہوئے تھے..

جب ہم اور نیچے اترے.. آخری موڑ پر آئے، جہاں سے اتر کر ہم نے ہموار

ہو کر کچی سڑک پر اترنا تھا اور اس بیرک کے قریب اترنا تھا جس کا نام مرتضٰے چوکی تھا اور وہاں ہم نے کچھ دیر ٹھہر کر منی مرگ چلے جانا تھا تو وہاں اس آخری موڑ پر عبدالصمد خان نے ایک فکر مند چہرے کے ساتھ.. جیپ کے گیئر کو متعدد جھٹکے دیئے.. بار بار بریک پر زور ڈالا.. پھر گیئر کو ہر پہلو سے آزمایا.. اور پھر سٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام کر بل کھاتے اور نیچے اترتے گھومتے راستے پر جیپ کو سنبھالنے لگا..

میں نے محسوس کیا کہ جیپ پر اس کا اختیار نہیں ہے.. وہ اپنی مرضی سے اترتی جارہی تھی اور سپیڈ پکڑتی جارہی تھی..

"خاں صاحب.." میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا..

"چُپ رہو یارا.." اس نے نیچے گرتے راستے سے نظریں ہٹائے بغیر سٹیئرنگ کو تقریباً سینے سے لگائے غصے سے کہا..

میں چپ ہو گیا.. کوئی شدید گڑبڑ تھی.. اور میں جان گیا کہ گیئر آزاد ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی جیپ بھی آزاد ہو چکی ہے.. خان صاحب نے انجن آف کر دیا ہے..

پچھلے حصے میں سوار میرے ساتھی حسب معمول گانے گا رہے تھے اور شور مچا رہے تھے..

اور جیپ خان صاحب کے بس سے باہر اب صرف اللہ توکل نیچے اترتی جاتی تھی اور تیز ہوتی جاتی تھی.. کبھی وہ بے قابو ہو کر روڈ کے کناروں پر پہیے چڑھا دیتی اور کبھی کسی بڑے پتھر کو تقریباً گرتی ہوئی سیدھی ہو جاتی...... اس دوران پچھلے حصے والے ساتھیوں کو بھی شک سا ہوا کہ جیپ کی رفتار قدرے تیز ہے اور دائیں بائیں کناروں پر چڑھتی اترتی ہے اور وہ بھی خاموش ہو گئے..

یہ ایک ہولناک تجربہ تھا.. صرف خان صاحب کی کاریگری تھی جو حادثہ نہیں ہونے دے رہی تھی.. وہ سٹیئرنگ کو ہاتھوں میں جکڑے ہوئے اسے الٹنے سے روکتے

تھے..وہ اس کا رخ بدل سکتے تھے لیکن لمحہ بہ لمحہ بڑھتی سپیڈ پر ان کا کوئی اختیار نہ تھا..

ایک بے اختیار تنکے کی طرح بہتی جیپ بالآخر کچی روڈ پر اتری اور جیسے چابی ختم ہو جائے ایسے دھیرے دھیرے آہستہ ہوتی عین مرتضےٰ چوکی کے کمروں کے سامنے جا کر رک گئی..

''جیپ کے گیئر آزاد ہوتے ہیں اور مرتضےٰ چوکی''

''یارا آپ نیک لوگ ہو'' صمد خان نے اپنی پگڑی اتار کر پسینے سے تر ماتھے کو پونچھا ''جیپ کا گیئر بکس میں کچھ گڑ بڑ ہو گیا ہے.. گیئر بالکل فری ہو گیا تھا.. اگر اوپر ٹاپ پر ہوتا تو ہم سب ٹیم اللہ میاں کے پاس ہوتا.. یارا آپ نیک لوگ ہو جو آخری موڑ پر جیپ کا گیئر فری ہوا ہے۔''

''اب کیا ہو گا خان صاحب؟''

''پہلے نیچے اترو اور جیپ کو دھکا لگا کر ذرا آگے کرو.. چوکی کے برابر میں کرو روڈ سے ہٹا کر..''

ہمارے ایک ہی ہلّے نے جیپ مطلوبہ پوزیشن میں آگئی..

سامان اتارا جانے لگا..

مرتضےٰ چوکی کے کمروں کے سامنے ڈھیر کیا جانے لگا..

عبدالصمد خان فی الفور اپنا ٹول بکس کھول کر جیپ کے نیچے گھس گیا.. اگرچہ وہاں پچھلی برفباری کا کیچڑ تھا لیکن نہ اس نے اپنے کپڑوں کی پرواہ کی اور نہ اپنے کج کلاہ کی.. اور بے دریغ اس کیچڑ میں لیٹ کر جیپ کے پیٹ کا معائنہ کرنے لگا.. ہم نے مدد کی پیشکش کی تو وہ کہنے لگا، یارا یہ ہمارا کام ہے.. تم نہیں جانتا کیا کرنا ہے.. ادھر نجف خان کا غلطی ہے اس نے ہمیں خراب جیپ دیا.. آپ سیر کرو ہم کوشش کرتا ہے..

چنانچہ ہم سیر کرنے لگے..

یہ ایک عجیب اور اجنبی دیار تھا.. ایک کچی سڑک جو بڑے دیوسائی اور چھوٹے دیوسائی کی وادی کے درمیان میں تھی.. دور پہاڑوں میں سے آتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ریشمی ندی.. نیم سرخ اور کہیں کہیں زرد اور کبھی بے حد ہری گھاس کے میدان میں بہتی اس سڑک کے ساتھ ساتھ چلی آتی تھی..... مرتضےٰ چوکی کے چند کمروں کے نیچے ذرا گہرائی میں سے گزرتی دور چلی جاتی تھی..... بعد میں معلوم ہوا کہ کشمیر کے چکمہ محاذ تک چلی جاتی ہے..

دوپہر تھی.. دھوپ تیز تھی..

ہمیں اب پتہ نہ تھا کہ ہم یہاں کتنی دیر ٹھہریں گے اور کب منی مرگ کے لیے روانہ ہوں گے..

یہ مقام ایک گھوسٹ ٹاؤن کی طرح لگتا تھا..

شک ہوتا تھا کہ ہم وائلڈ ویسٹ کے کسی ایسے قصبے میں آنکلے ہیں جو اُجڑ چکا ہے.. ویران ہو چکا ہے.. اس کی مین سٹریٹ میں کانٹے دار جھاڑیاں بگولوں کی زد میں آکر اُڑتی اور اچھلتی پھرتی ہیں.. یہ جھاڑیاں لڑھکتی ہیں اور ویرانی ایک مہیب گونج کے ساتھ ہر سُو سرگوشیاں کرتی ہے.. اور یہاں چند آوارہ گرد ہیں جو شائد سونے کی تلاش میں پہاڑوں میں گئے تھے اور ناکام ہو کر اس بھوت بستی میں گھومتے ہیں کہ شائد یہاں کبھی کوئی سٹیج کوچ آجائے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دے.. اور وہ کوچ پر سوار ہو کر.. گھروں کو لوٹ سکیں..

البتہ وائلڈ ویسٹ اور مرتضےٰ چوکی میں ایک فرق تھا..

یہاں بدن کو بھسم کر دینے والی گرم ہوا نہیں چلتی تھی.. چھوٹے دیوسائی سے ٹھنڈک ہی ٹھنڈک اترتی تھی اور مرتضےٰ چوکی کے نیچے بہنے والے تیز نالے کی جانب سے خنکی کی لہریں اُٹھتی ہوئی آتی تھیں..

مرتضےٰ چوکی کے اندھے کمروں میں سے ایک شخص برآمد ہوا..

یہ محمد حسین تھا.. ایک معمولی سپاہی.. جس کے فرائض منصبی میں صرف یہ شامل تھا کہ انڈین بارڈر کو جانے والے کانوائے کے فوجی افسروں اور ساتھیوں کو چائے وغیرہ پلاؤ.. یا بارڈر سے لوٹ کر چھٹی پر جانے والوں کی کچھ خاطر کرو اور اگر انہیں کسی وجہ سے راستے میں رات ہو جائے تو انہیں کمبل اور چارپائی دو اور کھانا کھلاؤ.. یہ ایک ایمرجنسی یونٹ تھا.. یہاں کبھی کوئی ٹھہر جاتا تھا لیکن اکثر کانوائے اور جیپیں یہاں سے دھول اُڑاتی گزر جاتی تھیں..... اس کے ہمراہ امیر جان بھی تھا..

وہ دونوں ہم سویلین لوگوں کو وہاں گھومتے ہوئے دیکھ کر بے حد حیران ہوئے کہ یہ مخلوق کہاں سے آگئی ہے اور جب انہیں صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً ہمارے لیے چائے تیار کی اور بسکٹوں کے متعدد ڈبے کھول دیئے..

یہ سب کچھ ان کی ڈیوٹی میں نہیں ان کی خصلت میں شامل تھا..

ہم بیرکوں کے سائے میں بیٹھ کر چائے پینے لگے..

خان صاحب جیپ کے نیچے کیچڑ میں کیچڑ ہوتے اس کا پیٹ چاک کر کے خرابی کی جڑ تک پہنچنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف تھے..

مرتضےٰ چوکی.. چلم چوکی اور گلتری کی وادی کے درمیان میں کوئی مقام تھا..

کچی سڑک چلم چوکی سے برزل درّے کو عبور کر کے یہاں تک آتی تھی اور یہاں سے گلتری کی وادی اور چکمہ بارڈر تک چلی جاتی تھی..

"تارڑ صاحب.. اگرچہ ہم یہاں ایک حادثے کی وجہ سے پہنچے ہیں اور پھنس گئے ہیں لیکن یہ جگہ ناقابلِ قبول ہے.." انصاری نے کہا.. اور جب کبھی وہ کسی لڑکی یا منظر کے حوالے سے یہ کہتا تھا کہ وہ ناقابل قبول ہے تو وہ دراصل یہ کہتا تھا کہ قبول ہے قبول ہے اور اِسے چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا..

سوائے اس کی ویرانی کے.. یہاں ہر شے قابل قبول تھی.. چھوٹے دیوسائی

کا منظر... اس میں سے اترتی ندی اور چوکی کے نیچے جہاں وہ ندی، بڑے نالے میں شامل ہوتی تھی اور اس کے کنارے دلدل نما میدان میں ہری بھری گھاس اور ٹھنڈک میں بھیگتی سرد ہوائیں..

لیکن ہم ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے.. منی مرگ پہنچنا چاہتے تھے.. شام سے پہلے..

گلتری کی جانب سے.. بہت دور.. طویل فاصلے پر.. ندی سے ذرا اوپر جہاں پہاڑوں میں اسی روڈ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا تھا وہاں ہم نے ایک سبز رنگ کی جیپ دیکھی جو ساکت لگتی تھی.. لیکن وہ حرکت میں تھی بہت آہستگی کے ساتھ...

یہ ایک سٹیج کوچ تھی.. ویران قصبے میں گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں آنے لگیں.. آوارہ گرد چائے کی پیالیاں اور بسکٹ بھول کر کچے راستے پر آ کھڑے ہوئے.. اس کا استقبال کرنے کے لیے.. اسے روکنے کے لیے..

سبز رنگ کی جیپ قریب آنے لگی.. ہمارے قریب.. مرتضٰے چوکی کے کمروں کے سامنے کھڑے بے چارے آوارہ گردوں کے قریب آئی اور ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی..

ایک میجر صاحب برآمد ہوئے.. سمارٹ بھی اور سادہ بھی.. انہوں نے اپنی آنکھوں سے رے بین کا چشمہ ہٹایا.. مرتضٰے چوکی کے گرد کھڑے ہوئے اجنبی اور سویلین چہروں کا معائنہ کیا اور مجھے پہچان لیا.. فوری طور پر تو نہیں بلکہ میری شدید کوشش کے بعد انہوں نے مجھے پہچان لیا اور بے حد ملنسار ہوگئے..

میں نے انہیں اپنی ٹریجڈی کے بارے میں انفارم کیا..

"تارڑ صاحب میں.. محاذ پر ایک طویل ڈیوٹی کے بعد چھٹی پر واپس جا رہا ہوں.... آج رات تک استور پہنچوں گا.. میری جیپ میں ایک شخص کی گنجائش نکل سکتی ہے.. آپ اگر پسند کریں تو میرے ساتھ آ سکتے ہیں"

"تھینک یو.. لیکن میں تنہا نہیں ہوں.. کم از کم آٹھ مشٹنڈے میرے ہمراہ ہیں.. آٹھ رُک سیک ہیں.. دو نیلے ڈرم ہیں.. کچن ٹینٹ ہے.. دیگر سامان ہے.. اگر میں تنہا ہوتا تو آپ کی آفر قبول کر لیتا.. لیکن شکریہ.."

"دیکھو جوان.. کیا نام ہے تمہارا"... انہوں نے تَن کھڑے محمد حسین سے پوچھا..

"محمد حسین سَر..."

"تو محمد حسین.. صاحب کا خیال رکھنا.."

محمد حسین کو اگرچہ ہمارا خیال رکھنے کے لیے کسی فوجی اجازت کی ضرورت نہ تھی لیکن اب اسے ذرا آسانی ہوگئی تھی کہ صاحب کا خیال رکھنا ہے..

سبز جیپ سٹارٹ ہوئی اور درّہ برزل کی طرف چلی گئی..

"صاحب.. آپ ان میجر صاحب کا دوست ہے؟" محمد حسین نے نہایت معصومیت سے پوچھا..

"ہاں.. یہ ہمارا دوست ہے" میں نے محمد حسین پر اپنی شہرت کا مہیب سایہ ڈالنے کی کوشش نہ کی کیونکہ وہ ایک ایسا شخص تھا جو کسی انسان کو مصیبت میں دیکھ کر اس کے رینک یا شہرت کا خیال نہیں کرتا تھا.. صرف انسانیت کا خیال کرتا تھا..

"صاحب.." علی ایک سرگوشی میں بولا "جیپ تو ادھر دیر میں ٹھیک ہوگا.. تو دوپہر کا کھانا ادھر تیار کرلے گا.."

"ہاں بالکل.."

وہ ایک اور سرگوشی میں بولا "صاحب ان لوگوں کے پاس کمروں کے اندر ایک سٹو اور باورچی خانہ ہے انہیں بولو کہ ہم لنچ ادھر بنالے.. ایسے ہمارا کچھ تیل بچ جائے گا"

چنانچہ دوپہر کا کھانا محمد حسین کی مہربانی سے ایک اندرونی تاریک کچن میں تیار ہوا.. پراٹھے ہم نے بنائے اور وہ ہمارے لیے سٹور میں سے سبزیوں اور گوشت کے ٹین

لے آیا.. میں نے اتنا تکلّف نامناسب جانا تو وہ کہنے لگا "صاحب ہمارے پاس ٹِن بند خوراک بہت ہے.. آپ جتنا کھا سکتے ہو کھاؤ.. کچن کا سٹور آپ کے لیے ہے جو مرضی آئے پکاؤ، پرواہ نہیں.. اور اگر جیپ ٹھیک نہیں ہوتا تو بے شک ادھر رات کرو، پرواہ نہیں"

"نہیں محمد حسین جیپ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا اور ہم لنچ کے بعد منی مرگ چلا جائے گا.."

عبدالصمد خان ابھی تک جیپ کے نیچے کروٹیں بدل رہا تھا.. لنچ کے لیے بھی باہر نہ آیا.. ہم کمروں کے سائے میں ٹانگیں پھیلائے اونگھنے لگے..

"صاحب.." وہ پتہ نہیں کب کا ہمارے اوپر کھڑا تھا.. اس کی داڑھی بھی کیچڑ سے بھری ہوئی تھی "گیئر تو بہن.... بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا ہے.. ناکارہ ہو گیا ہے.. مرمت نہیں ہو سکتا"

"تو پھر؟"

"تو پھر یہ ہے کہ آج اگر ادھر سے کوئی جیپ گزرتا ہے تو میں اس پر استور جاتا ہوں اُدھر سے دیکھتا ہوں کہ گیئر بوکس ملتا ہے کہ نہیں.. نہیں ملتا تو اُدھر سے گلگت جاتا ہوں.. پھر واپس آتا ہوں اور جیپ کو ٹھیک کرتا ہوں اور پھر.. منی مرگ جائے گا"

"اور کتنا عرصہ لگے گا؟"

"تین دن تو لگ جائے گا.. گلگت جائے گا تو چار دن.. آپ کو ادھر مرتضےٰ چوکی میں ٹھہرنا ہوگا.."

یہ ایک نہایت دل شکن اور تشویشناک خبر تھی.. میرے ساتھیوں میں سے کسی نے ہائی کورٹ میں پیش ہونا تھا.. کسی نے بینک میں رپورٹ کرنا تھا کسی نے اپنی بیوی کے سامنے پیش ہونا تھا، اگلے تین چار دنوں میں.. اور سکردو میں نہیں.. لاہور میں..

ہم بری طرح پھنس گئے تھے..

ہم مرتضےٰ چوکی کی ویرانی میں آوارہ روحوں کی طرح بے مقصد بھٹکنے لگے..

اب کیا ہوگا؟..

ہم سب گلتری کی جانب سے آتی روڈ کو دیکھتے تھے کہ شائد کوئی خالی جیپ آجائے اور ہمیں ہمارے سامان سمیت کم از کم مرتضےٰ چوکی سے کہیں اور لے جائے..

ہم آس پاس کے منظر سے غافل بلکہ بیزار ہو گئے تھے.. جنگل چاہے کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو جال میں پھنسا ہوا جانور اسے انجائے نہیں کر سکتا..

ایک مدت گزر گئی..

پھر ایک جیپ نمودار ہوئی.. سب کی نظریں اُس پر فوکس تھیں.. وہ قریب آئی تو بچوں اور عورتوں سے پیک تھی.. ڈرائیور کی گود میں بھی ایک بچہ تھا.. کوئی گنجائش نہ تھی.. لیکن جب ڈرائیور کو ہماری صورت حال کا علم ہوا تو اس نے اسے ایک ذاتی چیلنج جانا کہ مرتضےٰ چوکی پر ایک جیپ خراب ہو اور وہ اس کی مرمت کر کے اسے رواں نہ کر سکے..

خوش اطوار تیکھی مونچھوں والا نوجوان.. اس نے اپنے مسافروں سے کہا کہ وہ مرتضےٰ چوکی کی روڈ پر سیر سپاٹا کریں اور خود جیپ کے نیچے گھس گیا.. تھوڑی دیر بعد سر نکال کر کہنے لگا "صاحب اپنا سامان بے شک لے آؤ.. گیئر ٹھیک ہو جائے گا.. فکر مت کرو"

ہم پھر سے پُرامید ہو گئے.. منی مرگ پہنچنے کے خواب دیکھنے لگے..

دوپہر ڈھلتی جاتی تھی اور چھوٹے دیوسائی سے اترنے والی ندی کا شور بلند ہونے لگا تھا..

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد وہ تیکھی مونچھوں والا جوانِ رعنا اپنے رعنا چہرے کو موبل آئل سے پینٹ کئے رینگتا ہوا باہر آیا اور کہنے لگا "صاحب صرف گیئر

کا مسئلہ نہیں ہے.. اس جیپ کا تو انجر پنجر ہل گیا ہے۔اس کے دن پورے ہو گئے ہیں..
یہ مرمت کے قابل نہیں"

اس انکشاف پر عبدالصمد خان نے ایک مرتبہ پھر نجف کے بارے میں خاصے فصیح و بلیغ خیالات کو ہوا دی کہ اس نے مجھے ایسی جیپ کیوں دی جو اپنے آخری دموں پر تھی..

"اب کیا ہو گا؟"

"اب تو کچھ نہیں ہو گا صاحب.." صمد خان شدید غصے میں تھا "یہ جیپ تو ختم ہو گیا.. آپ اب منی مرگ وغیرہ کیا جائے گا.. ادھر کسی نہ کسی طرح چلم چوکی پہنچو.. پھر ادھر سکردو واپس جاؤ پھر کے ٹو موٹل میں جا کر نجف خاں کو بولو.. کہ تمہارا جیپ مرتضےٰ کیمپ میں بیکار پڑا ہے اس کے لیے مکینک بھیجو...اب اور کیا ہو سکتا ہے"

"ہمارے پاس ٹیلی فون ہے جو صرف چلم چوکی سے بات کرتا ہے" محمد حسین کہنے لگا "ہم ان سے کہتا ہے کہ سکردو بات کرو کہ جیپ ناکارہ ہو گیا ہے.. دوسرا جیپ روانہ کرو"

"ادھر سے چلم چوکی کے لیے جیپ نہیں ملے گا؟"

"کل دوپہر گلتری کو دو جیپ گیا تھا۔ اگر آج وہ واپس آتا ہے اور خالی آتا ہے تو شائد آپ چلم پہنچ جاتا ہے.. نہیں تو آپ ادھر ٹھہرتا ہے ہمارے پاس"

ہمیں پہلی بار غریب الوطنی کا احساس ہوا.. پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ہم کہیں بھی نہیں جا رہے..

آج کی شب شائد ادھر مرتضےٰ چوکی میں ہی گزرے...

اور جونہی یہ احساس ہوا کہ رات ادھر آئے گی تو دوپہر ڈھلی اور شام آنے لگی..

میں نے چوکی کے کمروں سے ملحقہ ایک نسبتاً ہموار جگہ کو نگاہ میں رکھا جو روڈ

سے ذرا نیچے تھی اور نالے سے ذرا اوپر تھی.. وہاں خیمے نصب کئے جا سکتے تھے..

"علی.. سامان کھولو.. اور اُدھر ٹینٹ وغیرہ لگاؤ"

محمد حسین کا ردِّ عمل فوری تھا "نہیں صاحب.. یہ جگہ تو ہموار نہیں.. اور ندی کے آس پاس پانی اور دلدل ہے.. رات کو بارش آ گیا تو خیمہ ندی میں جائے گا"

"تو پھر ٹینٹ کدھر لگائیں؟"

"کیا ضرورت ہے صاحب.. ہمارے پاس افسر لوگ کے لیے دو کمرہ ہے.. پرانا اور ٹوٹا ہوا ہے.. فرش کچا ہے اور چھت ٹین کا ہے لیکن باہر سونے سے بہتر ہے.. اور ٹائلٹ بھی ہے.. ادھر آپ رات گزارو"

"مرتضےٰ چوکی کی کارواں سرائے میں رات اور ایک دشمن فوجی سے ملاقات"

شام آئی تو اس کے قدموں پر رات آ گئی..

ہم وہ بے سروساماں مسافر تھے جن کے لیے سٹیج کوچ نہ آئی تھی اور ایک گھوسٹ ٹاؤن میں ہم پر رات نے اپنی تاریکی اور سردی کا وار کر دیا تھا..

محمد حسین کے پاس اپنے اور امیر جان کے لیے ایک نیچی چھت والا کمرہ تھا جس کے فرش پر پرانی رضائیاں اور گدے بچھے ہوئے تھے۔ایک ناکارہ سا وائرلیس سیٹ تھا جس کا رابطہ چلم چوکی سے بھی نہیں ہو رہا تھا اور ایک کونے میں خوراک کے ٹین سجے ہوئے تھے.. یہ اس ویران تنہائی میں ایک کوزی اور سردی سے بچانے والا ماحول تھا.. اور ایک چھوٹی جنت سے کم نہ تھا.. اسے دیکھ کر مجھے گورے ٹو یاد آ گیا.. کنکورڈیا سے ہیلی کاپٹر نے مجھے بالتورو گلیشیر کے کناروں پر واقع اس چھوٹی سی فوجی دنیا میں پہنچایا تھا اور وہاں جو آپریٹرز کا کمرہ تھا اس میں بھی یہی اپنائیت اور عافیت کی کیفیت تھی..

"آپ بے شک ادھر سو جاؤ صاحب.."

"شکریہ.. لیکن میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ سوؤں گا.."

میں اس کی مہمان نوازی سے بے حد متاثر ہو رہا تھا.. یہ شخص نہ مجھے جانتا تھا

نہ پہچانتا تھا صرف ایک انسان کے طور پر میری عزت کرتا تھا.. وہ یہ جانتا تھا کہ اس ویرانے میں ان دو کمروں کے علاوہ کہیں بھی پہاڑوں ‘ندیوں اور میدانوں میں کوئی پناہ گاہ نہیں اس لیے مجھے ان گمشدہ لوگوں کی مدد کرنی چاہیے..

ایک کمرے میں فرش پر ترپال بچھا کر سلیپنگ بیگ کھول دیئے گئے..

دوسرے کمرے میں تین چارپائیاں تھیں اور روڈ کی جانب جو بند کھڑکی تھی اس کے ساتھ کی چارپائی پر جب میں نے اپنا سلیپنگ بیگ بچھایا تو وہ گویا دنیا کا سب سے انمول راحت کدہ بن گیا..

اور غسل خانہ جیسا بھی تھا مُلحقہ تھا اور کنڈی کی جگہ ایک رسی لٹکتی تھی جسے اندر بیٹھ کر آپ اپنی جانب کھینچے رکھتے تھے تو دروازہ بند رہتا تھا ورنہ ذرا سی ڈھیل دینے پر وہ آزاد ہو جاتا تھا..

تاریکی بہت گہری اور اندھی تھی.. البتہ کمرے میں ایک چوکور شگاف تھا جس میں سے چھوٹے دیوسائی کا ایک حصہ اب بھی مدھم سا دکھائی پڑتا تھا... آج دوپہر ہم اس کے حسن کے سناٹے میں آ گئے تھے اور پھر ورد کرنے لگے تھے..

ہم انتہائی خوش بخت رہے تھے.. اپنے ربّ کا شکر ادا کرتے تھے کہ جیپ کا گیئر درّے کی چوٹی پر آزاد نہیں ہوا تھا.. دیوسائی کے اندر کہیں ناکارہ نہیں ہوا تھا.. ہوا تھا تو مرتضےٰ کیمپ کے قریب پہنچ کر آزاد ہوا تھا.. ورنہ ہم کہاں ہوتے..

میں اپنے سلیپنگ بیگ میں محفوظ ٹانگیں پسارے اپنی تھکن اُتارتا تھا.. اپنے اوپر جو ٹین کی چھت کا سایہ تھا اس کے لیے اللہ کا شکر ادا کرتا تھا اور ٹانگیں پسارے پڑے کرتا تھا..

مرتضےٰ کیمپ کی کارواں سرائے نے ہمیں پناہ دے دی تھی..

ہم انتہائی خوش بخت رہے تھے..

ٹین کی چھت پر جیسے کسی نے پتھر پھینکا ہو.... میں نے چونک کر اوپر دیکھا..

پھر برسات شروع ہو گئی..

تیز بارش کے ہمراہ اولے برسنے لگے.. مرتضٰے کیمپ کی ویران رات میں شور مچ گیا.. اولوں کے انبار ٹین کی چھت پر پتھروں کی طرح مسلسل برسنے لگے... ان کے شور سے ہمارے کان بہرے ہو گئے.. سردی کی شدت میں یکلخت کئی گنا اضافہ ہو گیا.. ہم ان کے کہرام میں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن لاپرواہ تھے اور سلیپنگ بیگز میں ٹانگیں سکیڑے کہ سردی بڑھ گئی تھی اس طوفان کے شور وغل سے لطف اندوز ہو رہے تھے..

کمرے کا دروازہ پوری طرح بند نہیں ہوتا تھا اور چوکھٹ میں سے اولے اُچھلتے ہوئے اندر آتے تھے، جیسے زندہ آنکھیں ہوں اور اندر آکر دیکھتی ہوں کہ یہ کون ہیں؟ کسی بھی طوفانی شب میں اپنے گھر کے اندر عافیت میں.. یہ جانتے ہوئے کہ طوفان سے جو درخت گرتے ہیں میرا گھر ان سے دور ہے.. جو بارش بے پناہ ہے وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکتی... باہر جو تیز ہوائیں چلتی ہیں وہ میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتیں..

یہ وہی احساس تھا مرتضٰے چوکی کے اس اندھیرے کمرے میں.. ٹین کی چھت پر ایک آبشار کی طرح گرتے اولوں اور بارش میں.. عافیت کا اور بے پرواہی کا..

ہماری منصوبہ بندی کیا تھی اور ہم کدھر آ گئے تھے..

ہمیں منی مرگ میں ہونا چاہیے تھا اور ہم کدھر اور کہاں رات بسر کرتے تھے.. چھوٹے دیوسائی کے دہانے پر.. ایک کچی سڑک کے کنارے ایک بیرک میں... بارڈر سے آنے والے ایک راستے پر جو مرتضٰے چوکی سے گزر کر درّہ برزل کو جاتا تھا..

میں قطعی طور پر اس خیال سے دکھی نہیں ہوا کہ آج تو مجھے منی مرگ میں ہونا چاہیے تھا اور میں کہاں ہوں..

کوہ نوردی اور خانہ بدوشی میں منزل کا کچھ پتہ نہیں ہوتا.. کوئی حساب کتاب یا لگا بندھا شیڈیول نہیں ہوتا... اور یہی اس کی کشش ہے اور یہی اس کا طلسم ہے..

ہم رات کا کھانا بھی کھا چکے تھے..

آسودہ ہو چکے تھے اور کچھ وقت گزرا تو نیند میں جانے کو تھے جب برستی بارش کے شور میں مدغم ہوتا ایک اور شور ہمارے کمرے میں در آیا.. اور اس کے ساتھ ہی محمد حسین نے دروازہ دھکیلا... چھت میں سے ٹپکنے والے پانی کے لیے ہم نے ادھر ادھر جو برتن اور بالٹیاں تعینات کر رکھی تھیں ان میں کسی ایک کے ساتھ اندھیرے میں اس کا پاؤں ٹکرایا اور پھر اس نے لالٹین ہماری چارپائیوں پر بلند کر دی "صاحب ادھر بارڈر سے چھ ٹرک نیچے آیا ہے.. ان میں چند سپاہی ہیں اور ایک افسر ہے.. ہم ان کے لیے چائے وغیرہ بناتا ہے اور صاحب ٹرک وغیرہ خالی ہے آپ ان سے بولو کہ تم لوگ کو چلم چوکی لے جائے.. کل کچھ معلوم نہیں کہ گلتری سے کوئی جیپ آتا ہے یا نہیں.. آپ افسر سے بات کرو تو وہ آپ کو لے جائے گا"

یہ کہہ کر محمد حسین پھر باہر نکل گیا..

برستی بارش میں انجنوں کی مسلسل غراہٹ کا مہیب شور بلند ہوتا تھا اور بہت ساری آوازیں تھیں.. لوگ تھے جو کچھ کہہ رہے تھے..

مرتضٰے چوکی کے ویرانے میں بہار آ گئی تھی..

ان آوازوں میں محمد حسین کی آواز بھی تھی جو رپورٹ کرنے کے انداز میں کسی سے مخاطب تھا کہ صاحب ادھر کچھ پاکستانی بھائی کا جیپ خراب ہو گیا ہے اور وہ بے آسرا ہو گیا ہے اور رات کرتا ہے ان میں کوئی صاحب ہے جس کے بارے میں ہمارے میجر صاحب نے بولا تھا کہ خیال رکھو..

ہم پوری طرح بیدار ہو کر اپنی چارپائیوں پر بیٹھے بہت ساری توقعات کے ساتھ اس شور کو غور سے سنتے تھے..

پاک فوج کے یہ جوان اگر ہمیں رات کے اس پہر یہاں سے اٹھا کر چلم چوکی لے جائیں تو وہاں سے ہمیں سکردو جیپیں مہیا ہونے کا چانس تھا..

ہم بہت پر امید تھے... ہم مرتضیٰ چو کی قید سے نکل سکتے تھے..

دروازہ پھر کھلا اور ایک مختصر سے قد کا پتلا دبلا شخص کمرے میں یکدم داخل ہوا.. اندر ہماری ایک چھت سے ٹپکنے والے پانی کو جمع کرنے والی بالٹی سے ٹکرایا.. بمشکل سنبھلا اور چیخ کر کہنے لگا "پی سی او کہاں ہے؟"

"یہاں نہیں ہے جناب" کسی نے کہا۔

"کیوں نہیں ہے؟" اس نے اکڑوں کھڑے ہو کر نہایت رعونت سے کہا..

شائد وہ ہمیں سٹاف کے لوگ سمجھ رہا تھا..

"سر.. ہم تو پردیسی ہیں، ہم نہیں جانتے"

محمد حسین لالٹین اٹھائے اس کے پیچھے کھڑا تھا..

لالٹین کی ناکافی روشنی میں میں نے دیکھا کہ وہ ایک ہراساں، تھکا ہوا اور اپنی وردی سے بڑا بچہ تھا جو افسر بننے کی پوری کوشش کر رہا تھا..

میں نے اپنے آپ کو سلیپنگ بیگ کی گرفت سے آزاد کیا اور مؤدب ہو کر اپنا تعارف کرایا.. ٹیلی ویژن یا ادب کے حوالے سے نہیں بلکہ اسے صرف اپنے چھوٹے بھائی کرنل مبشر کا بتایا جو اسی آرم سے تعلق رکھتا تھا اور یہ بھی عرض کیا کہ جنرل سلیم اللہ اسلام آباد میں میرے منتظر ہیں تاکہ میں سیاچین جا کر پاکستانی فوج کے لیے ایک ٹیلیویژن شو کی میزبانی کر سکوں... تو میں اور میرے ساتھی بے حد شکر گزار ہوں گے اگر آپ ہمیں چلم چو کی تک لے جائیں..

کہتے ہیں فوج میں صرف دو افسر ہوتے ہیں.... ایک جنرل اور دوسرا ایک تازہ سیکنڈ لفٹین... اور یہ جوان اپنی افسری ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا..

باہر رات تھی۔ بارش اور تیز سرد ہوا تھی.. اور ہم بے آسرا تھے.. اور ہمیں اگر اس افسر کی منت سماجت بھی کرنی پڑتی تو ہم بخوشی کرتے..

لیکن.. اس نے ہماری مدد کرنے کی بجائے محمد حسین سے جواب طلبی کر لی کہ

یہ سویلین لوگ یہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں.. کس کی اجازت سے ٹھہرے ہوئے ہیں.. یہ کمرے تو افسروں کے لیے ہیں تو یہ یہاں کیوں ہیں.. اُس کے ردّعمل نے مجھے بہت دکھی کیا.. شمال میں جب کبھی فوج سے واسطہ پڑا وہ میرا گھر بن گئی... بھائیوں کی طرح میرا سواگت ہوا.. یہاں تک کہ کنکورڈیا سے واپسی کے لیے ایک ہیلی کاپٹر مہیا کیا گیا.. اور یہ میرا ہی نہیں ہر پاکستانی کوہ نورد کا تجربہ ہے... لیکن یہ نیم لفٹین شرافت یا شریف نام کا کسی اور مٹی سے بنا ہوا تھا..

"سر.." میں نے اسے مخاطب کیا "آپ مہربانی کریں اور اس شخص کی جواب طلبی نہ کریں.. اس نے ہماری مدد کر کے یقیناً رولز کی خلاف ورزی کی ہے.. ہم ابھی اپنا سامان اٹھا کر یہ کمرے خالی کر دیتے ہیں.. باہر بارش میں کہیں پناہ تلاش کر لیں گے لیکن پلیز آپ اس غریب کی جواب طلبی نہ کریں.."

تب اس احساس کمتری کے مارے ہوئے شخص نے ایک عجیب سا سوال کیا

"آپ مجھ سے پنجابی اور انگریزی میں کیوں بات کرتے ہیں.. اردو کیوں نہیں بولتے.. آپ جانتے نہیں کہ یہ ہماری قومی زبان ہے.. میں پنجابی وغیرہ نہیں سمجھ سکتا.."

میں دکھی بھی تھا اور تھکا ہوا بھی اور واقعی نہیں جانتا تھا کہ میں کونسی زبان میں بات کر رہا ہوں.. مصیبت کی گھڑی میں انسان کے ذہن میں جو آتا ہے کہہ دیتا ہے.. یہ شخص جانتا تھا کہ ہم ایک ویران رات میں اس کے محتاج ہیں اور اس کے خالی کمروں میں سوار ہو جانے کی شدید خواہش رکھتے ہیں.. اور اس کی کوئی محرومیاں تھیں جن کا بدلہ وہ ہم سے لے رہا تھا..

اب میں اسے کیا بتاتا کہ اردو زبان کے ساتھ میرا کیا رشتہ ہے.. میں چپ رہا.. کیونکہ میں اگر بولتا.. تو بہت کچھ بولتا.. لیکن چپ رہا کہ کہیں ہماری وجہ سے محمد حسین پر کوئی عتاب نازل نہ ہو جائے کیونکہ اس وقت وہ اختیار میں تھا..

وہ ہم سے کچھ کہے بغیر باہر چلا گیا..

کانوائے کی جیپیں اور ٹرک سٹارٹ ہو گئے.. اور شائد اس کے ماتحتوں میں سے کسی نے کہا سر ہمارے پاس بہت جگہ ہے.. تارڑ صاحب اور ان کے ساتھیوں کو چلم چوکی تک لے چلیں.. یہ اچھے لوگ ہیں..

اور اس کے جواب میں مجھے کوئی بُل شِٹ قسم کا لفظ سنائی دیا..

کانوائے چلا گیا..

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک پاکستانی سے نہیں ہندوستانی فوج کے افسر سے ملا ہوں..اور وہ بھی حالت جنگ میں!

میں اپنا سلیپنگ بیگ لپیٹنے لگا...

"کیا کرتے ہو صاحب.." محمد حسین واپس آ گیا..

"آج کی رات کے لیے بہت عزت ہو گئی ہے یار.."

"شرمندہ نہیں کرو صاحب..." اس نے منت کرتے ہوئے کہا..

تھوڑی دیر بعد بارش تھم گئی..

اولے گرنے بند ہو چکے تھے..

سردی بڑھ گئی..

لالٹین کی روشنی مدھم ہونے لگی..

مرتضٰے چوکی میں گہری نیند اترنے لگی۔

"ایک چمکتی لشکتی مچھلی کی بے وجہ موت اور جیپ کا انتظار"

اوپر مرتضٰے چوکی تھی..

اور نیچے... شاہ عالم چھوٹے دیوسائی سے اترنے والے شفاف نالے کے سرد پہاڑ میں صرف ایک جامنی رنگ کا جانگیہ پہنے، اپنے سفید اکہرے بدن کے ساتھ کنارے کے کسی ایک پتھر کی جانب احتیاط سے بڑھتا تھا، ایسے وہ دونوں ہاتھ بڑھائے جیسے اسے آغوش میں لینے کو ہو.. جیسے ایک منحنی پہلوان ایک سومو پہلوان کے فربہ اور وسیع وجود کی جانب احتیاط سے بڑھتا ہے ایسے وہ دونوں ہاتھ بڑھائے اس پتھر کی جانب تیز اور تند پانی کی روانی میں اپنا بدن کھینچتا ہوا بڑھتا تھا.. پتھر کی قربت میں پہنچ کر وہ سانس روکتا تھا اور پھر جھک کر دونوں ہاتھوں سے اس کے پانی میں ڈوبے ہوئے وجود کو ٹٹولتا تھا..

ندی کا ایک نیلا ربن تو درّہ برزل سے اتر کر اس وادی کے درمیان میں ہموار میدانوں میں بہتا چلا آتا تھا اور ذرا بلندی پر براجمان مرتضٰے چوکی پر نظر ڈالے بغیر گلتری کی جانب رواں ہو جاتا تھا.. اور دوسرا نالہ چھوٹے دیوسائی میں سے اتر کر اس میں شامل ہو جاتا تھا..

اور ہم اس کے دلدل نما گہرے سبز کناروں کی گھاس میں اپنے آپ کو

سنبھالتے پانی میں اترے ہوئے شاہ عالم پر نظر رکھے اس کے ساتھ ساتھ چلتے جاتے تھے کیونکہ اس نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں مچھلی کھلائے گا..

اور یہ سب کیا دھرا خالد ندیم کا تھا.. اس نے آج صبح نہایت خفیہ انداز میں مجھے بتایا تھا کہ سر جی چوکی کے عقب میں جہاں خالی ٹین اور ڈرم وغیرہ پڑے ہیں وہاں کوڑے کرکٹ میں میں نے کچھ کانٹے پڑے دیکھے ہیں جو یقیناً مچھلی کے ہیں.. ذرا پتہ کریں کہ یہ مچھلی کہاں سے آتی ہے.. سر جی ایک آدھ مچھلی یہاں مل جائے تو میاں صاحب اسے فرائی کریں اور سلمان کے پاس ابھی دو لیموں باقی ہیں انہیں میں مچھلی پر... یوں نچوڑ دوں تو ذرا سوچیں کہ چھوٹے دیوسائی کے دامن میں مرتضٰے چوکی میں کیسا کیسا لطف آجائے گا.. اور خالد کا یہ خاصا ہے کہ خوراک کھاتے ہوئے وہ اتنے چٹخارے نہیں لیتا جتنا اس کی توقع میں وہ خوش ہوتا ہے.. جیسے ایک سردار جی بیچ بازار میں گیسو بکھرائے نعرے لگاتے خوشی سے بے قابو ہوتے ناچ رہے تھے.. کسی نے پوچھا کہ سردار جی کیا ہوا ہے.. وہ کہنے لگے، میرا یار شراب لینے گیا ہوا ہے..

چنانچہ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ نیچے چھوٹے دیوسائی کے نالے میں مچھلی ہے اور اسے مقامی لوگ ہاتھوں سے پکڑ لیتے ہیں.. یہ شاہ عالم کا کہنا تھا..

"ہاتھوں سے کیسے پکڑتے ہیں.." میں نے اس کے کہنے پر اعتبار نہ کیا..

"ہاں جی.. ادھر جب ہم ٹین کا ڈبہ بند فوڈ کھا کھا کر جب بہت پریشاں ہوتا ہے تو پھر ندیں میں اُترتا ہے.. مچھلیں جوں ہین وہ پتھروں کے نیچے پانی میں آرام کرتا ہین تو ہم ہاتھ ڈال کر اسے پکڑ لیتا ہین.."

"ہاتھوں سے؟"

"ہاں جی.. ہاتھوں سے.."

"نہیں یار.."

"ہاں جی.."

خالد ندیم ایک زبوں حال فاقہ زدہ فقیر کی طرح اس کی طرف بڑھا اور اس کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر باقاعدہ گریہ کرتے ہوئے کہنے لگا "تمہارے بچّے جئیں.. ہمیں مچھلی پکڑ دو... ہم اسے فرائی کریں گے.. بیسن لگائیں گے.. لیموں نچوڑیں گے.. ہائے ہائے.. شاہ عالم تمہارے بچّے جئیں.."

"صاحب ہمارا تو شادیں نہیں ہواں.. تو بچّہ بھی نہیں ہواں.."

"تو اللہ کرے تمہارا شادی ہو جائے.. تمہارا بیاہ میڈونا سے ہو جائے.. مچھلی پکڑ دو"

"بہت چھوٹاں چھوٹاں مچھلیں ہوتا ہے صاحب.."

"بے شک اتنا ہو.." خالد نے اپنی چھنگلی کھڑی کر دی "پر مچھلی تو ہو گی.. پلیز شاہ عالم.."

چنانچہ اب شاہ عالم اپنے جامنی جانگیے میں ندی کے بہاؤ میں اپنے آپ کو کھینچتا ایسے چلتا تھا جیسے صحرا کی ریت میں دھنستے پاؤں نکالتا ہو اور پھر کسی پتھر کے قریب جا کر اس کی باٹم ٹٹولنے لگتا تھا.. اور مزے سے چلتا تھا حالانکہ ندی کے پانی ایسے یخ تھے کہ اگر ان میں ایک انگلی ڈبو کر باہر نکالی جائے تو پھر اسے ایک گنّے کی پوری کی طرح توڑا جا سکتا تھا کیونکہ وہ برف ہو جاتی تھی..

آج مرتضٰے چوکی میں سویر ہوئی..

اپنے آپ کو ایک خیمے کی بجائے ٹین کی چھت کے نیچے ایک پتھریلے کمرے میں چارپائی پر پاؤں پسارے پا کر پہلے تو ذرا حساب کتاب کیا کہ میں ہوں کہاں.. کونسا دیار ہے.. کیا مقام ہے.. یہ کیسی رہائش ہے.. اور پھر معلوم ہوا کہ میں وائلڈ ویسٹ کے ایک ویران قصبے میں کسی کھنڈر ہوتے ہوٹل کے ایک کمرے میں ہوں اور سٹیج کوچ کا منتظر ہوں..

ٹائلٹ میں.. اس مٹھی بھر اندھیرے پھسلن والے ٹائلٹ میں ایک روشن دان

کی صورت چھوٹے دیوسائی کا ایک چوکھٹا جڑا تھا جس میں سے ہریاول بھرے پہاڑ اور اُمڈتے ہوئے بادل اور سردی دکھائی دیتی تھی..

اس سویر ہم سب... بہت بنے سنورے.. سجے سجائے.. متھے تلک لگا کے کنیں مُندراں پا کے.. شیو کر کے.. آفٹر شیو لوشن لگا کے.. جاگرز چڑھا کے.. کنگھی پٹی کر کے.. یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہماری جیپ اب ایک کھنڈر ہے جس میں اب کوئی نہیں کوئی نہیں جائے گا.. لیکن یہ جانتے ہوئے بھی ہم پورا ہار سنگھار کر کے.. اپنا سامان پیک کر کے جیپ کے گرد جمع ہو گئے.. اس عقیدے کہ پجاری.. کہ یہ چلے گی..

تارڑ برادری کے بارے میں ان کے مخالفین اور حاسدوں نے ایک روایت گھڑ رکھی ہے کہ یہ حضرات.. اتنے نظر باز ہوتے ہیں کہ اگر کسی جھاڑی پر ایک شوخ رنگ دوپٹہ سوکھتا ہوا دیکھ لیں تو وہ جھاڑی سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک عمر بتا دیتے ہیں کہ.. یہ کبھی تو بولے گی... اگرچہ میں اپنا شمار نہایت شریف النفس تارڑوں میں کرتا ہوں لیکن آج سویرے میں بھی جیپ کے برابر میں بیٹھ گیا تھا کہ.. کبھی تو یہ چلے گی..

تو صرف میں نہیں.. ہم سب بنے سنورے.. سجے سجائے.. کنگھی پٹی کر کے اِس خلاص ہو چکی جیپ کے قریب دیر تک کھڑے.. اُس کے اردگرد ٹہلتے رہے کہ.. یہ چلے گی..

وہ نہ چلنی تھی نہ چلی..

ہم بہت شکستہ دل ہوئے.. رنج میں ڈوب گئے.. اور یہ وہی لمحہ تھا جب خالد ندیم نے چوکی کے پچھواڑے میں مچھلی کے کانٹے دریافت کر لیے تھے اور اب ہم اپنی دل شکستگی اور رنج کو فراموش کر کے ندی کے کناروں پر شاہ عالم کی چال کے ساتھ ساتھ چلتے تھے.. اور شاہ عالم پتھروں کے پانی میں ڈوبے ہوئے پرائیوٹ پارٹس کو مسلسل ٹٹولتا تھا کہ شائد کوئی مچھلی ان کی پناہ میں ہو..

ہم نے مرتضےٰ چوکی کے باہر البتہ ایک سنتری پوسٹ کر دیا تھا کہ اگر گلتری کی

جانب سے کوئی جیپ نمودار ہو تو وہ "جیپ او ہائے" کا نعرہ لگا کر ہمیں خبر کر دے.. کچھ نمودار ہوتا تو وہ نعرہ لگاتا..

درّہ برزل کی جانب جو ڈھلوانیں ندی تک آتی تھیں وہ خزاں رسیدہ تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے ان پر تانبے رنگ کے پتّے ڈھیر ہوں یا پگھلا ہوا تانبا چوٹیوں پر اُنڈیلا گیا اور وہ ندی کی قربت میں آ کر پھیل گیا اور ٹھنڈا ہو گیا.. نہایت بجھے ہوئے اور اداس بھی.. اور نہایت دل کو مسرت دینے والے اور شاندار بھی.. ایسے رنگ تھے..

ہم شاہ عالم کی پانیوں میں سیر اور پتھروں کو ٹٹولنے کی ورزش سے بور ہو چکے تھے.. لیکن مرتضےٰ چوکی میں اس کے علاوہ اور کیا تفریح ہو سکتی تھی اس لیے ہم اسے دیکھتے رہے..

شاہ عالم ایک اور پتھر.. شائد اس کا ایک سو ساٹھواں پتھر.. اس پتھر پر جھکا دونوں بازو پانی کے اندر ڈبو کر کچھ ٹٹولا، سیدھا ہوا.. اور ایک اُڑتے لمحے میں اس کے ہاتھ میں ایک چاندی رنگ پھڑکتی ہوئی شے نظر آئی جسے اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ کنارے کی جانب اچھال دیا..

اور وہ شے پھڑکتی اور دھوپ میں ایک اُڑن طشتری کی طرح چمکتی پرواز کرتی عین ہمارے قدموں میں آ گری.. وہ بہت ہی خوبصورت تھی اور بہت زندہ تھی..

اُس کے بدن میں نوعمری کی لہک اور لچک تھی اور وہ بل کھاتی، دوہری ہوتی اپنی گول آنکھوں سے ہمیں شکایت آمیز نظروں سے تکتی تھی... ہم جو اس کے فرشتۂ اجل تھے، جنہوں نے اسے چھوٹے دیوسائی کے سرد پانیوں کی دنیا سے جھٹک کر باہر پھینک دیا تھا.. صرف زبان کے ایک لمحے کے ذائقے کے لیے اس کی پوری زندگی تلف کر دی تھی..

میں اسے واپس اس کی آبِ حیات کی روانی میں پھینک دینا چاہتا تھا.. لیکن وہ دیوسائی کی ہواؤں میں فوراً سرد ہونے لگی..

ہمارے چٹورے پن نے ایک رُو پہلی شاہکار کو فنا کی تاریکی میں دھکیل دیا تھا..

جیسے کوئی غیبی قوت ہمارے کسی عزیز کو.. جو زندگی سے بھرپور ہو.. کھلنڈرا اور پھڑکتا ہو.. ہر سو تیرتا پھرتا ہو.. اسے موت لے جائے.. بے وجہ..

شاہ عالم پانی سے باہر آگیا.. دیوسائی کے پانیوں کا وہ بھلے عادی ہو گا لیکن اس کا سفید بدن نیلا ہو رہا تھا "صاحب.. مچھلیں یا تو ادھر صبح سویرے آتیں ہیں.. یا شام کے وقت.. دھوپ میں نہیں آتیں.. صرف آپ کو خوش کرنے کے لیے پانیں میں اترا تھا"

ہم مرتضے چوکی کی ڈھلوان پر چڑھنے لگے.. "شاہ عالم.. اس مچھلی کا کیا کرے گا؟"

"کیا کریں گا صاحب.. صرف ایک ہے بہت چھوٹا ہے.. کیا کریں گا.."

اور ہم نے اس روپہلی خوبصورتی کو سرد گھاس میں ہی ٹھنڈا ہو جانے دیا..

اس کا شاندار چاندی بدن اور گلپھڑوں کی خوبصورت بناوٹ اور کھلی آنکھیں.. سب کچھ رایگاں گیا تھا..

ہماری ادا ٹھہری تھی اور وہ جان سے گئی تھی.. بڑے پانی کی مچھلیاں کم از کم ایک الاؤ والی شب میں تو کام آتی تھیں.. اور یہ ایک مچھلی.. بے سود بے وجہ موت...

دوپہر ہو چکی تھی..

مرتضے چوکی کے بھوت قصبے کے سامنے سے گزرنے والی کچی سڑک ویران پڑی تھی..

عبدالصمد خان کی شوخی کافور ہو چکی تھی.... میرے ساتھ اس کا عشق ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور وہ ہم سے آنکھ نہیں ملاتا تھا.. جیسے یہ اس کا قصور ہو کہ جیپ کے گیئر برباد ہوئے اور ہم اس ویرانے میں قید ہوئے..

وہ چوکی سے دور.. ایک چشمے کے پانیوں سے بار بار اپنے چہرے کو تر کرتا تھا اور پھر خلال کرنے لگتا تھا حالانکہ اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا..

ہمارے رُک سیک اور دیگر سامان کمروں کے باہر ایک کچے تھڑے پر ڈھیر

تھا.. ہم نے اپنے تئیں روانگی کے لیے پیکنگ مکمل کر لی تھی.. کیا پتہ غیب سے کوئی سواری آجائے.. لیکن ہم اپنے سامان کو اس خوف سے دیکھتے تھے کہ کہیں اسے دوبارہ کھولنا نہ پڑے.. اگر کوئی سٹیج کوچ گلتری روڈ پر نمودار نہیں ہوتی.. اگر ہوتی ہے تو اس میں گنجائش نہیں ہوتی تو ہمیں آج کی رات بھی یہیں بسر کرنی ہو گی..

ہم دو نمبر کاؤبوائیز کی طرح اِدھر اُدھر گھومنے لگے..

"سر جی.." خالد ندیم جو فرائی مچھلی اور اس پر چھڑکے گئے لیموں کے خواب کی ناکامی کے بعد نہایت بے چارہ ہو گیا تھا میرے پاس آیا "اگر میں ترسوں اپنے بینک میں واؤچر اور چیک سائن کرنے کے لیے حاضر نہ ہوا.. تو مجھے ملازمت سے جواب مل جائے گا.. خدا کے لیے کچھ کریں.."

"جناب عالی.." میاں صاحب نے اپنے بالوں کی کمی کو ہاتھوں سے پوشیدہ کرتے ہوئے مجھ پر فرد جرم عائد کر دی "آپ ادھر نامہ نیم جگہ پر لائے ہو تو اب کچھ کرو.. میری تو پیشیاں ہیں ہائی کورٹ میں"

سلمان اور انصاری کے امتحان تھے کیمیکل انجینئرنگ کے..

اور سب سے زیادہ حسن صاحب پریشان تھے "میں نے تو اپنی بیاہتا زندگی میں آج تک تین روز کا ناغہ نہیں کیا بیگم کو فون کرنے کا.. کچھ تو کریں"

"کیا کروں؟" میں بھی طیش میں آگیا.. یوں لگتا تھا جیسے صرف میں ہوں جسے دنیا کا کوئی کام نہیں.. ہمیشہ سے فارغ اور نکما ہوں "یہاں چھوٹے دیوسائی میں بھی بدقسمتی سے کوئی درخت نہیں ورنہ میں آپ صاحبان سے گزارش کرتا کہ اس درخت پر چڑھ کر اس کی چوٹی پر پہنچ کر اپنے بینک منیجر.. اپنے ہائی کورٹ کے جج.. اپنے ممتحن یا بیگم کو آوازیں دیں کہ ہم ابھی نہیں آسکتے.. یا تو کوئی جیپ بھیج دیں یا پھر صبر کریں.. میں کیا کروں؟"

"میں بتاؤں سر جی.. کہ کیا کریں؟" خالد نے جھک کر کہا

"جی فرمایئے"

"سر جی.. ہمارے پاس چنے کی دال بھی ہے اور آلو بھی ہیں.. اگر آپ اجازت دیں تو انہیں ابال کر.. ذرا گرم مصالحہ ڈال کر دیسی گھی کے پراٹھے تیار کرلوں.. ذرا سا لیموں بھی نچوڑ لیں گے.. سواد آجائے گا.."

میں پہلی بار مرتضٰے چوکی کے کچن کے اندر تک گیا..

یہ ایک جادوئی اندھیرے والا کچا اور دھویں سے سیاہ کمرہ تھا.. اس کی چھت میں ایک سوراخ سا تھا جس میں سے آنے والی روشنی اس کے اندھیرے اور سیاہی کا کچھ نہیں بگاڑتی تھی.. ایک چولہا تھا.. ایک آئل سٹوو تھا جس کی بھرائی ہوئی آواز اس کوٹھڑی میں مسلسل گونجتی تھی.... یہاں محمد حسین تھا اور خالد ندیم تھا جو توے پر دیسی گھی گرم کر کے اس پر دال اور آلو کے پراٹھے کو احتیاط سے ڈالتا تھا اور پھر اسے گھماتا تھا اور وہ دیوانگی کی خوشبو دیتے تھے اور جل اُٹھتا تھا یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے تھے اور درّہ برزل اور دیوسائی کی خزاں رسیدہ گھاس کی طرح تانبے رنگ کے ہوتے تھے..

ان پراٹھوں کو اچار اور پالک گوشت کے ساتھ نوش کرنے کے بعد ہم ہوش میں نہ رہے..

ایک پراٹھا خمار میں چلے گئے..

اور ہم سب نے اس حالت خمار میں گلتری کی جانب سے آنے والی کسی بھی ایسی جیپ پر لعنت بھیجی جو ہمیں یہاں سے نکال کر چلم چوکی لے جاسکتی تھی..

ہم تو وہ افیمی تھے جو پراٹھا نشے میں دُھت ایک کنویں میں پڑے تھے.. اور چاہتے تھے کہ ہمیں اب کوئی یہاں سے نہ نکالے.. بس.. میاں جہاں رہو خوش رہو.. کی صدا دے کر چلا جائے..

ہم مرتضٰے چوکی کے کنویں میں خوش تھے..

بے شک جیپ ساری عمر نہ آئے.. ہم خوش تھے..

ہم اونگھتے رہے..

دوپہر کے چار بج گئے.. ایک اور دن اختتام کو پہنچ رہا تھا.. ہم نے اپنے خمار کو کم کرنے کے لیے چائے کی ایک ایک پیالی پی..

ہم اونگھتے تھے تو اپنے کمرے میں اونگھتے تھے.. باہر.. کچی سڑک ویران پڑی تھی.. خاموش اور سنسان..

ہم ذہنی طور پر ایک اور شب کے لیے.. جانے کتنی شبوں کے لیے.. تیار بیٹھے تھے.. بلکہ تیار اونگھتے تھے کہ یہی مرتضٰے چوکی ہوگی اور ہم ہوں گے..

رات کے کھانے کا مینیو بھی تیار کر لیا گیا.. مزید پراٹھے اور مزید اچار اور پالک گوشت..

دھوپ ڈھل رہی تھی.... ساڑھے چار بجنے والے تھے.. اور تب محمد حسین نے ہمارے کمرے کے دروازے پر ایک ٹھڈا رسید کر کے اُسے چوپٹ کیا اور کہنے لگا "صاحب اُدھر گلتری سے دو جیپ آتا دکھائی دیا ہے.."

سب کا نشہ ہرن ہوگیا... افیمی لوگ اپنی پینک سے باہر آگئے.... نہ صرف باہر آئے بلکہ بستروں سے کالے ہرنوں کی طرح چوکڑیاں بھرتے کان کھڑے کئے کمرے سے باہر آگئے... باہر مرتضٰے چوکی میں ویرانی راج کرتی تھی.... کچی سڑک پر کانٹے دار جھاڑیاں اُچھلتی تو نہ تھیں مگر ہوا تیز تھی... عبدالصمد خان نیلی جیپ کے قریب اس کے سوگ میں بیٹھا تھا کیونکہ آج اس کے قُل تھے..

اور گلتری کی جانب سے دو جیپیں اس ویرانی کو منتشر کرتی مرتضٰے چوکی کی طرف ہماری طرف اُتر رہی تھیں..

اور وہ خالی تھیں..

”درّہ بُرزل کا خزاں رسیدہ دیوتا اور ایک مرتا ہوا شخص“

ہم نے ایک عمر مرتضےٰ چوکی میں گزاری تھی..

روز و شب کا کوئی شمار نہ تھا..

ہم یہاں اتنے عرصے سے مقیم تھے.. سٹیج کوچ کا انتظار کرتے تھے کہ اپنے گھروں کے نقشوں اور بچّوں کے چہروں کو بھول چکے تھے..

اور تب جا کر.. صدیوں بعد.. گلتری کی جانب سے اترتی دو جیپیں دکھائی دی تھیں..

اور پھر مرتضےٰ چوکی ہم سے دور ہو رہی تھی.. محمد حسین باہر کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا..

ڈھلتی دوپہر میں ہم اور ہمارا سامان اور گائڈ اور پورٹر ان جیپوں میں لدے ہوئے حرکت میں تھے.. درّہ برزل کو جاتے تھے.. اس کے پار چلم چوکی کو جاتے تھے..

یہ دو جیپیں... دو کشتیاں تھیں جو ایک ویران جزیرے میں گم شدہ مسافروں کو لینے کے لیے افق پر نمودار ہوئی تھیں.. ہم ان پر سوار ہوئے تو مسرت سے دمکتے اور حواس باختہ ہوتے تھے لیکن جب وہ جیپیں مرتضےٰ چوکی سے نکلیں، محمد حسین اور شاہ عالم ہماری نظروں سے اوجھل ہوئے تو یوں لگا جیسے اپنے گھر سے بچھڑ گئے ہوں... ہمیں

بہت رنج ہوا... ہمارا بس چلتا تو ہم واپس چلے جاتے.. وہاں ہمیں ایک عام فوجی نے عزت دی تھی.. خوراک اور چھت دی تھی.. اور ایک افسر اپنے خالی ٹرکوں کے قافلے سمیت ہمیں ایک طوفانی شب میں چھوڑ کر چلا گیا تھا..

اور مجھے ایک اور رنج بھی تھا.. بہت گہرا اور نشان چھوڑ جانے والا.. میں چھوٹے دیوسائی کی ندی کے کنارے نم گھاس میں ایک مچھلی چھوڑ آیا تھا.... اس کی فنا کا میں ذمہ دار تھا.. بے کار اور بے سُود موت.. وہ ندی کے سردیلے پانیوں میں ایک چاندی کی جھانجھر کی طرح تیرتی... نوخیزی کی مستی میں اچھلتی.. زندگی کے میلے میں... اونچے اور لمبے شیشم کے درخت تلے ایک آبی پینگ میں جھولتی تھی.. اور میں نے اس کے جُھولے کو توڑ دیا تھا.. مجھے بہت قلق ہوا..

دونوں جیپیں تادیر اس ہموار وادی میں سفر کرتی رہیں..

مرتضےٰ چوکی ہمیشہ کے لیے ماضی کی بوسیدگی میں گم ہو گئی..

میں بہت دیر اس بوسیدگی میں گم رہا.. اور پھر آس پاس نگاہ کی..

وہ ندی.. جس میں شاہ عالم اپنے جامنی رنگ کے جانگیے میں اترا تھا.. سڑک سے ذرا نشیب میں ایک ہموار میدان کی ہریاول اور خزاں میں بہتی جا رہی تھی..

اور اس ندی کے کناروں پر جو ڈھلوانیں اترتی تھیں.. بجھتی دھوپ میں... اور ان ڈھلوانوں پر دھوپ چھاؤں کے عجیب رنگ تھے.. نہ یہ رنگ امیر خسرو کے کسی رنگریز کے پاس ہوں گے... کسی چُنریا کے رنگ یہ کبھی نہ ہوں گے.. اور نہ شاہ حسین جولاہے کے عشق کی کھڈّیوں پر ایسے رنگ بُنے گئے ہوں گے.. اس لیے کہ وہ دونوں یہاں.. درّہ برزل کے دامن میں نہیں آئے تھے.. اور ہم آئے تھے..

ایسے رنگ تھے جن میں شک ہی شک تھا.. کہ یہ ممکن نہیں ہو سکتے...

یہ ایک ایسے کارواں سرائے تھے جس کے بلند دروازوں تک کوئی نہیں آیا

تھا.. کسی نے صدا نہیں دی تھی.... کہ اے در وا ہو جا..

اور یہ در.. ہمارے لیے وا ہو رہے تھے..

ڈھلوانوں پر خزاں کے آخری شائبے اور شک تھے... زرد.. نیم سنہری.. تانبے رنگ کے.. آتشِ چنار کے پتے.. اور اُن میں مرید کے کے کسی تالاب.. کسی جوہڑ پر جمی کائی کی سبز اور گھنی خوش نمائی تیرتی تھی..

اور یہ عجیب وادی رُنگ و بُو تھی جس میں ہم سفر کرتے تھے..

کچی سڑک کے برابر میں.. ہماری جیپوں کی روانی سے لاعلم... نیچے میدان میں بہتے پانیوں کے کناروں پر کہیں کہیں جو پھول دکھائی دیتے تھے.. تو زرد اور کملائے ہوئے تھے اور کہتے تھے کہ اگرچہ ہم مرجھاہٹ کے انجام کو آتے ہیں.... کملاہٹ کی زرد منزلوں میں اترتے ہیں لیکن اس کے باوجود... ہم جیسے کوئی رنگ ہیں.. کوئی خزاں میں مرجھاتا نکھار ہمارے سامنے آسکتا ہے..

گھاس.. ڈھلوانوں کی گھاس.. خشک ہو کر زردی میں بدلتی تھی.. ہریاول اور زردی کو پگھلاتی ہوئی وہ ندی وادی میں بہتی چلی جاتی تھی.. مرتضےٰ چوکی کی جانب..

جیپ کے پچھلے حصے میں جو میرے ساتھی تھے وہ تو باقاعدہ ماتم کر رہے تھے..

"تارڑ صاحب یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں.. کیسی وادی ہے اور یہ کیا رنگ ہیں.. ناقابلِ یقین ہیں سر جی.."

"جناب عالی.." بالآخر میاں صاحب بولے "بھاٹی دروازے کے اندر جو جھروکے ہیں اور جن میں شہر لاہور کی لاہورنیں آنکھوں میں سرمہ لگائے نیچے بازار میں جھانکتی ہیں تو جناب عالی.. یہ رنگ رُوپ تو وہاں بھی نہیں ہے.. سبحان اللہ.."

اگرچہ ہم نے دیوسائی کو دیوتا مان لیا تھا..

اس کے بلند اور وسیع مندر میں پہنچ کر اس کی توصیف کرنے کے لیے بر جی لاء.. شتونگ بڑاپانی اور پھر چھوٹے دیوسائی کے گھڑیال بجائے تھے.. لیکن ہمارے سامنے

ایک اور مندر تھا.. ایک اور بُت کدہ تھا... ایسا کہ اپنے سحر انگیز رنگوں سے ہمارے ایمان کو ڈگمگاتا تھا..

ایک اور معبد تھا.. جس کا دیوتا کوئی اور تھا..

یہ برزل کا دیوتا تھا..

جیپوں نے اپنا رُخ بدلا اور درّے کی چڑھائی شروع ہو گئی..

ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مرتضےٰ چوکی کی وادی پر دُھند اتر رہی تھی.. اس کی وہ ندی جس میں شاہ عالم جامنی جانگیے میں مچھلیاں تلاش کرتا تھا دُھند میں دُھندلا رہی تھی..

ایک مقام پر برزل ٹاپ پر جانے والی روڈ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی.. ایک پرانا راستہ اور دوسری نئی روڈ جو ابھی زیرِ تعمیر تھی.. دوسری جیپ نے نئی روڈ کا رخ کیا اور ہمارے ڈرائیور کے خیال کے مطابق پرانا راستہ بہتر تھا چنانچہ راستے الگ الگ ہو گئے لیکن دونوں نے بالآخر پہنچنا برزل ٹاپ پر ہی تھا.. جیسے عقائد مختلف راستوں سے ایک ہی سچائی پر پہنچتے ہیں..

دونوں جیپیں متوازی جا رہی تھیں.. درمیان میں کبھی گہرائی آجاتی اور کبھی ٹیلے..

پھر دونوں جیپیں ایک دوسرے کے قریب آتی گئیں اور ایک مختصر سا روکھا سوکھا علاقہ آیا.. وہاں کچھ خیمے تھے، کچھ دلدل تھی اور کچھ برف تھی.. اور یہی بُرزل ٹاپ تھا... اور نہایت مایوس کن تھا.. اس میں نہ کوئی خوبصورتی کی ہیبت تھی اور نہ آس پاس دل نشینی کا کوئی وسیع منظر.. بادلوں کے نیچے چند خیمے، تھوڑی سی دلدل اور برف.. درّہ لواری کی ٹاپ نے بھی مجھے اسی طرح مایوس کیا تھا... انسان کسی درّے کی ٹاپ پر پہنچے تو اسے ایک احساس ہو کہ میں ایک بلند مقام پر پہنچا ہوں.. درّہ خنجراب کی طرح یا درہ بیسپر کی مانند..

برزل ٹاپ پر ہماری جیپیں صرف اس لیے رُکیں کہ ہمارے ساتھ دو فوجی جوان بھی سوار تھے اور انہیں یہاں اُترنا تھا اور منی مرگ جانا تھا..

ہم جو منی مرگ جانے کے لیے آئے تھے.. چپکے سے اپنی نشستوں پر بیٹھے رہے.. ہمارے پاس اب وقت نہ تھا اور مرتضٰے چوکی میں جیپ خرابی کے باعث اب ہم تھوڑے سے ڈرے ہوئے بھی تھے اور ان علاقوں سے نکلنا چاہتے تھے..

"کیا آپ کو منی مرگ کے لیے یہاں سے جیپ مل جائے گی؟" میں نے ایک فوجی سے سوال کیا..

"نہیں جناب.. ادھر عام طور پر سواری کی جیپ نہیں جاتی.. ہم پیدل جائیں گے اور رات کے کھانے تک انشاءاللہ پہنچ جائیں گے.."

دفاع کے حوالے سے برزل نہایت اہم درّہ ہے.. کیونکہ چکمہ بارڈر تک.. کشمیر کی کنٹرول لائن تک جو کانوائے اور فوجی ساز و سامان جاتا ہے وہ یہیں سے گزر کر جاتا ہے.. اور ان میں سنوو ہیکلز بھی شامل ہوتی ہیں.. اس برفانی موٹر سائیکل کو ہم پہلی بار دیکھ رہے تھے.. ٹرکوں میں لدے یہ سنوو ہیکلز بارڈر کی جانب لے جائے جا رہے تھے تاکہ موسم سرما میں انہیں نقل و حرکت کے لیے استعمال کیا جا سکے..

ہم برزل ٹاپ کی ہوا میں چند گہرے سانس لینے کے بعد دوسری جانب نیچے اترنے لگے..

یہاں بھی ڈھلوانوں پر گھاس، پھولوں اور پتّوں کے جو سُلگ کر ٹھنڈے ہو چکے اور بجھتے ہوئے رنگ تھے انہوں نے ہمیں پریشان کر دیا.. یہ عجیب رنگ تھے جن میں اداسی بھی تھی اور حیرت بھی.. یہ مرجھاتے ہوئے رنگ تھے جو گہرے ہوتے تھے- قدرت کے سائے تھے.. ان رنگوں میں وہ عارضی جوبن تھا جو فنا سے پیشتر ہر شے میں آتا ہے.. بجھنے سے پیشتر شمع کی لَو یکدم تیز ہو جاتی ہے.. دمِ آخر سے ذرا پہلے مریض کا حال اچھا ہو جاتا ہے.. ڈھلوانیں اور پہاڑ اِن قربت مرگ کے رنگوں میں تھے.. یہ بھی

ایک چھوٹی سی موت یا منی مرگ تھے اور ان کی دل کشی اسیر کرتی تھی..

جس روڈ سے ہم نیچے جا رہے تھے اس کے دائیں جانب گہرائی میں بہتی ایک ندی کے پار وہ برزل روڈ تھی جو اب متروک ہو چکی تھی..

ہماری جیپ اب ایک چوڑے اور نسبتاً کم پُرخطر راستے پر.. بادلوں کے جھکاؤ میں تھی..

شام کی قربت میں تھی.. بارش برستی نہ تھی.. ایک ایک بوند گرتی تھی اور جیپ کی ونڈ شیلڈ پر حرکت کرتے وائپرز اسے سمیٹ کر منظر چند لمحوں کے لیے صاف کر دیتے تھے اور بوندیں پھر ٹپ ٹپ گرتی تھیں... ایک نیم اندھیارے میں.. بادلوں کی سیاہی کے نیچے.. خاموشی سے ایک مرگ کیفیت میں جیپ آہستہ آہستہ نیچے جاتی تھی..

ہم سب چپ بیٹھے تھے.. اور ہمارے خاموشی کی وجہ کچھ تو وہ عجب رنگ تھے جنہوں نے ہمارا دل موہ لیا تھا ہمیں پریشان کر دیا تھا اور کچھ ان پہاڑوں اور اس درّے کی مکمل اجنبیت تھی.. عام لوگوں کے لیے تو سکردو اور دیوسائی اجنبی تھے.. لیکن وہ ہمارے لیے ہمارے اپنے تھے اور یہ.. درّہ برزل اور چلم چوکی پرائے تھے..

بارش ذرا زور کی ہونے لگی.. سردی پہلے سے ہی زور میں تھی.. اب پانیوں کے برسنے سے زور آور ہو گئی اور جیپ کے بند شیشوں میں سے در آنے لگی.. ہمارے سانس شیشوں کو دھندلانے لگے.. اور ہم کپکپانے لگے..

جیپ آہستہ آہستہ درّہ برزل سے نیچے اتر رہی تھی..

بارش میں اور آج رات برفباری کے خدشے میں.. ایک بادلوں میں ڈوبے نیم اندھیرے میں ہماری جیپ درّہ برزل سے نیچے اترتی تھی جب میں نے ونڈ شیلڈ میں روڈ پر کھڑے چند لوگوں کو ہاتھ ہلاتے دیکھا.. وہ ہمیں رُکنے کو کہہ رہے تھے.. کمبلوں میں لپٹے، سردی میں ٹھٹھرتے اور بارش میں بھیگتے ہاتھ ہلاتے کچھ لوگ..

جیپ رک گئی.. سامنے جو کچھ تھا وہ ونڈ شیلڈ پر مسلسل گرنے والی بارش نظر سے اوجھل کرتی تھی.. میں نے کھڑکی میں سے سر نکال کر باہر جھانکا.. کچھ دور اسی روڈ پر ایک جیپ اوندھی پڑی تھی.. کیچڑ اور بارش میں اور بہت سارے لوگ اس پر ہاتھ رکھے زور لگاتے، دوہرے ہوتے اسے سیدھا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے اور بھیگتے تھے اور سرد ہوتے تھے..

ان لوگوں نے جب ہماری جیپ کو رکتے دیکھا تو اُمڈ کر ایک ٹڈی دل کی طرح اُمڈ کر جیپ کی جانب چلے آئے اور بند شیشوں پر پاگلوں کی طرح دستکیں دینے لگے.. اور فریادیں کرنے لگے "جناب ہمارا جیپ الٹ گیا ہے.. بارش کی وجہ سے.. ہمارے ساتھ بچہ ہے.. عورت ہے.. کچھ زخمی ہے.. آپ ہمارا زخمی کو اپنا جیپ میں ڈال کر چلم لے جاؤ ورنہ ادھر مر جائے گا.. مہربانی کرو"

یہ وہی زرد جیپ تھی جس میں سوار ہونے کی ہم نے خواہش کی تھی لیکن اس میں گنجائش نہ تھی..

درّہ برزل سے اتر کر جب ہماری جیپ بادلوں اور برفوں سے نیچے آئی.. تو آگے کچھ ندیاں تھیں.. جن میں سے ہم گزرنے لگے لیکن بے حد احتیاط کے ساتھ کہ دھچکا نہ لگے، جیپ کا ٹائر کسی پتھر پر نہ آئے کیونکہ پچھلے حصے میں ایک زخمی بلتی کراہتا تھا، دوہائی دیتا تھا.. شائد وہ مرنے والا تھا.. کیونکہ اس کی حالت کا کچھ پتہ نہ تھا.. جیپ کو ہلکا سا دھچکا لگتا تو وہ بلند اور دردانگیز فریادیں کرتا.. آہ وزاری کرتا.. اپنی زبان میں جانے کیا کیا کہتا.. کہ شدید اذیت میں اور شدید خوشی میں انسان صرف اپنی مادری زبان میں ہی بولتا ہے.. اور ہم اس کی زبان سے ناواقف تھے.. لیکن اس کی آہ وزاری اور کراہنے کی آوازیں ہمارے دل کو دہلاتی تھیں.. اور جیپ کے پچھلے حصے میں براجمان میرے ساتھی ایک ترپال کے نیچے دبکے بیٹھے تھے اور اس پر بارش برس رہی تھی اور وہ سب کے سب خوف زدہ تھے کہ ایک شخص، ایک انسان جسے وہ جانتے نہیں تھے.. کراہتا تھا اور

شائد مرنے والا تھا اور وہ اس کی دل جوئی بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس کی زبان الگ تھی..

"یا علی مدد.." وہ یکدم چیخا..

اور ہم نے اس کے عقیدے کی آواز سے اس کے درد کو پہلی بار محسوس کیا..

برزل کے بجھے ہوئے خزاں رسیدہ رنگوں کے سندیسے... اس زخمی کی آواز میں گھلے.. اور میں ان بادلوں کو دیکھنے لگا جن میں سے بارش اترتی تھی اور نیم تاریکی اترتی تھی اور سردی اترتی تھی.. پہلو میں.. ایک سفید پرشور دریا بہتا تھا..

پھر یکدم سکون سا ہو گیا..

جیپ نسبتاً ہموار سطح پر چلنے لگی..

بادل بھی کم ہوئے اور ان میں سے ہلکی سی روشنی نکھر کر روڈ پر پھیل گئی..

بارش تھم گئی.. دھند اب کہیں تھی، کہیں نہیں تھی..

وہ جاں بلب شخص بھی کراہتے کراہتے خاموش ہو گیا..

اور پھر روڈ کے اردگرد.. جھاڑیوں اور گھاس کی بجائے چیڑ کے درخت دکھائی دینے لگے ان میں جو ہوا چلتی تھی اس کی سرسراہٹ جیپ کے اندر آنے لگی.. چیڑ کی گھاس کی نم مہک ہواؤں میں گھلی ہوئی مجھ تک آتی تھی.. جیسے ہم نتھیا گلی میں آنکلے ہوں.. مری کی قربت میں ہوں.. اور ہم اپنے گھروں کے لیے رنجیدہ ہو گئے کہ مری نتھیا گلی سے ہمارے گھر اس بُرزل کی نسبت کتنے قریب تھے..

چیڑ کا ایک گھنا جنگل تھا.. سرسبز اور بارش کی گیلاہٹ میں مہکتا ہوا..

دائیں جانب.. روڈ کے کنارے پر پہاڑ کے اوپر چڑھتا ہوا ایک گاؤں...

پتھریلے اور ڈربہ نما گھروں کا ایک گاؤں ہم نے دیکھا..

"صاحب.. یہ پرانا چلم چوکی ہے.. پرانا گاؤں یہی ہے" ڈرائیور بتانے لگا "ادھر کچھ نہیں.. صرف غربت ہے.. اصل چلم چوکی آگے ہے جدھر سے کشمیر بارڈر

کو سارا اسپلائی جاتا ہے..“

اور ابھی کچھ روشنی تھی.. جب ہم نے ایک بڑے نالے پر معلق مضبوط پل کو پار کیا اور چلم چوکی میں داخل ہو گئے...... سب سے پہلے زخمی شخص کو اتار کر اسے مقامی ہسپتال پہنچایا گیا...

ابھی کچھ روشنی تھی..

”چلم چوکی.. کبھی نہ جائیو اور ”پاکورے“..

چلم چوکی... وہ ٹمبکٹو... وہ دور افتادہ بستی تھی جہاں میں آبلہ پا ایک صحرائے اعظم عبور کر کے پہنچا تھا..

یہ دیوسائی مندر کا وہ بھاری دروازہ تھا جس تک پہنچنے کے لیے میں نے بہت سارے جیون گنوائے تھے.. بہت جتن کئے تھے.. کبھی ترشنگ سے واپسی پر سمیر اور راہی کے ہمراہ اس کے دامن میں جیپ روک کر اس نیلگوں نالے کو حسرت سے دیکھا تھا جو چلم چوکی اور دیوسائی سے اترتا تھا.. شائد یہی نالہ جسے ہم ابھی عبور کر کے آئے تھے..

دیوسائی کے دو ہی در تھے..

ایک سکردو کی جانب سے صدپارہ اور دوسرا استور کی جانب سے چلم چوکی...

مرتضےٰ چوکی سے چلتے ہوئے میں نے ہر دو جیپ ڈرائیورز کو بول دیا تھا کہ ہمارا تمہارا ساتھ صرف چلم چوکی تک ہے.. ہم اس کے دیدار کو ترسے ہوئے ہیں.. ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہاں زیادہ تر آرمی کے لوگ ہیں.. بازار ہیں.. ہرے بھرے گلزار ہیں جن میں پارہ صفت ندیاں بہاؤ کرتی ہیں اور ان کے کنارے دور دور تک گھاس بھرے ہیں.. ہم اس گھاس پر آج کی شب خیمے نصب کریں گے.. ندیوں میں نہائیں گے اور مرتضےٰ چوکی کے ویرانے سے فرار ہونے کی خوشی میں جشن کریں گے... رات کریں گے..

میں نے چلم چوکی کی جو چند ایک تصویریں دیکھی تھیں ان میں ایک کچی سڑک تھی.. چند گھر تھے اور آس پاس پھول اور ہری گھاس کے میدان تھے..

تو چلم چوکی.. وہ ٹمبکٹو... وہ دور افتادہ بستی تھی جس میں ہم آبلہ پا داخل ہوئے.. ایک پل کے پار ہوئے اور اس بستی میں داخل ہوئے تو.. ہمارے دل بجھ گئے.. بیٹھ گئے.. نہ یقین آیا نہ یہ گمان میں تھا کہ.. چلم چوکی دراصل یہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں.. اور کیا دیکھتے ہیں..

اور یہ دیکھتے ہیں.. ایک تنگ سی آبادی.. چند کچی پکی دوکانیں.. آرمی کی بیرکیں جن کے باہر کچھ ٹرک کھڑے تھے.. کچھ سنوو ہیکلز تھیں.. پٹرول کے کنستر تھے اور ہلکی بارش میں بھیگتا ایک بازار تھا اور کیچڑ تھا.. نہ اس کے پس منظر میں کوئی خوش نمائی تھی نہ اس کی شکل میں کوئی رعنائی تھی.. رُوکھے سے پہاڑوں میں ایک عارضی سا پڑاؤ تھا.. میرا خیال تھا کہ برزل کے آس پاس جن عجب رنگوں سے تھوپی ہوئی ڈھلوانیں اور دھند بھری ندیاں تھیں یقیناً چلم چوکی میں یہ سب کچھ ہو گا اور اس کے سوا بھی اور بہت کچھ ہو گا..

اور کچھ بھی نہ تھا... عجیب بدشکل اور اداس، دل کو گھبراہٹ دینے والی بستی تھی... میں اس نیم اجاڑ اور اداس بستی میں شب بسر کرنے کے خیال سے ہی خوفزدہ ہو گیا..

کِن مِن.. کِن مِن.. بارش کی بوندیں گرتی تھیں اور چلم چوکی کی ٹھنڈی بدشکلی میں اضافہ کرتی تھیں..

مرتضےٰ چوکی اس کے مقابلے میں ایک لیلےٰ تھی.. اور چلم چوکی سگِ لیلےٰ بھی نہ تھی۔

اگرچہ یہ طے تھا کہ ہم یہاں رات گزاریں گے اور کل صبح دیوسائی کو ایک روز روشن میں عبور کریں گے... شیوسر جھیل پر ایک مختصر پڑاؤ کریں گے اور اس پر حسنِ بے جا کے جو الزام ہیں ان کی تصدیق یا تردید کریں گے.. پھر بڑے پانی پر ایک

مختصر قیام کریں گے اور دیوسائی کے گھاس پیالوں کو جائیں گے وہ ریچھ دیکھنے جو کل سویر ہمارے پہنچنے تک خفتہ ہو چکے تھے.. اور ان کے دیدار کے بعد شتونگ اور ٹاپ کے راستے وادیٔ صدپارہ میں اتر کر سکردو پہنچ جائیں گے.. اگرچہ یہ طے تھا..

لیکن چلم چوکی کی بے رُوح بستی میں رات گزارنا ہمارے بس میں نہ تھا.. یہ وہ خاتون تھی جو ٹیلی فون پر تو کوئل کی طرح کُوکتی اور دل کی دھڑکن کو بے ربط کرتی تھی اور جب آپ منت سماجت کر کے اسے ملنے پر رضامند کرتے تھے اور پھر نہر کنارے اس کی پہلی جھلک دیکھتے تھے، اس کی شکل دیکھتے تھے تو فوراً اباؤٹ ٹرن کر کے غائب ہو جاتے تھے..

چنانچہ ہم نے چلم چوکی کو دیکھا.. ایک دوسرے کو دیکھا اور بنا مشورہ کئے یہاں سے فوری روانگی کے لیے رضامند ہو گئے..

ڈرائیور حضرات نے ہمارے فیصلے کو صدقِ دل سے قبول کیا کہ وہ سکردو کے باسی تھے اور جلد از جلد اپنے گھروں کو پہنچنا چاہتے تھے..

ہم یونہی تبدیلیٔ آب و ہوا کی خاطر چلم چوکی میں گھومنے لگے..

ایک ٹھیکیدار فدا حسینؔ سے ملاقات ہو گئی.. انہوں نے یاد دلایا کہ دیوسائی ٹاپ پر بھی ملاقات ہوئی تھی.. مجھے یاد تو نہ آیا لیکن میں نے نہایت چوڑی مسکراہٹ کے ساتھ اقرار کیا کہ ہاں ہاں یاد ہے ملاقات ہوئی تھی.. وہ اپنے وسیع تن و توش کے ساتھ چلم چوکی کی اداسی میں ایک صحت مند آہو کی طرح بھٹکتے تھے اور اپنے تئیں تفریح کرتے تھے.. وہ ہمیں مانسہرہ ہوٹل میں لے گئے جو چلم چوکی کا فائیو سٹار ہوٹل تھا..

اگرچہ ایک دھواں بھری کوٹھڑی تھی اور ایک چولہا اور چند چارپائیاں اور کچا فرش تھا.. انہوں نے ہمیں چائے پلوائی اور نہایت تکلف کیا اور پکوڑے کھلائے جنہیں وہ "پاکورے" کہتے تھے.. ان پاکوروں میں نیم پختگی کے علاوہ ایسی کرچیں تھیں جو آپ کے دانتوں

تلے آتی تھیں تو کرچ کرچ جل ترنگ بجاتی تھیں..

لیکن مانسہرہ ہوٹل کا نہایت انکسار پسند مالک ہم پر نچھاور ہوا جاتا تھا.. وہ مانسہرہ سے ادھر آتا تھا.. موسم گرما میں آتا تھا اور یہ ہوٹل کھول کر اپنی روزی کماتا تھا..

"صاحب آپ تو اُدھر کا ہے.. آپ جانتے ہیں کہ اُدھر ہمارے مانسہرہ میں چائے کیسا عالیشان بنتا ہے.. تو ادھر بھی ہم وہی چائے بناتا ہے.. ان مقامی لوگوں کو بالکل پتہ نہیں کہ چائے کیسے بناتے ہیں.. دودھ پہلے ڈالتے ہیں کہ چائے کی پتی.. تو ہمارا ہوٹل چلتا ہے.. فوجی جوان آتا ہے تو ہوٹل چلتا ہے.. ابھی اگلے مہینے ادھر برف شروع ہوگا تو ہم بھی مانسہرہ کو لوٹ جائے گا"

چائے اور پاکوروں کے بعد جب فدا صاحب کو ادائیگی کرنے کی کوشش کی تو وہ نیک بخت باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا "جناب شرمندہ نہ کرو.. تارڑ صاحب ہمارا ملک کا ہے.. اتنی دور سے اِدھر آگیا ہے تو ہم ان کو چائے بھی نہ پلائے.. مہمان ہے ہمارا."

اتنی دیر میں مسلح افواج کو بھی خبر ہو گئی.. وہ اپنی بیرکوں میں سے نکل کر آنے لگے.. نہایت وجیہہ اور صحت مند نوجوان.. اپنی شلوار قمیضوں اور تہمد میں.. وہ جانے کتنے عرصے سے یہاں پڑے تھے اس لیے ہمیں دیکھ کر ان کے چہروں پر رونق آگئی..

ان میں ایک صوبیدار صاحب بھی تھے جن کا تعلق گجرات سے تھا.. وہ اپنی بیرک میں سوئے ہوئے تھے جب انہیں اطلاع ہوئی کہ ایک گجراتی ٹاؤن میں ہے.... وہ آنکھیں ملتے، تہمد باندھتے آئے "بھائی جی آج رات آپ ہمارے پاس ٹھہرو.. ہر شے موجود ہے.. بستر کمبل ہے.. چارپائی ہے... ٹین بند فوڈ ہے.. کل سویرے آپ کو سنو وہیکل.. یعنی برفانی سکوٹر پر سیر کرائیں گے.."

"سنو تو ہے نہیں.. سیر کیسے کرائیں گے؟"

"چلائیں گے ناں اسے آپ کے لیے... سنو وہیکل کو کیا پتہ کہ اس کے زنجیروں سے بندھے ٹائروں کے نیچے سنو ہے کہ نہیں.. کیچڑ پر بھی چلے گا.. آپ

رات ٹھہر جائیں"

لیکن ہم تہیہ کر چکے تھے..

ہم نے پچھلے سات روز میں ایسا اداس اور گھبراہٹ طاری کرنے والا مقام نہ دیکھا تھا.. یہ پہاڑوں میں بند ایک قید خانہ لگتا تھا، ایک کالا پانی لگتا تھا اور ہم یہاں سے فرار ہو جانا چاہتے تھے..

عین ممکن ہے کہ چلم چوکی صرف اُس لمحے اور اُس شام ہمیں ایسی لگی ہو.. مرتضٰے چوکی کی دیوسائی خوبصورتی کے بعد ایسی لگی ہو اور کسی اور وقت میں ہم وہاں پھر جائیں تو وہ ہمیں بہتر لگے.. لیکن پھر بھی زیادہ بہتر نہیں لگے گی..

صرف ایک خدشہ تھا.. ہمارے سفری منصوبے میں دیوسائی کی سب سے بڑی اور پُرکشش جھیل شیوسر کے کنارے ایک رات بسر کرنا شامل تھا.. جو اب ممکن نہ تھا لیکن ہم چند لمحوں کے لیے اسے دیکھنا ضرور چاہتے تھے..

"اگر ہم فی الفور روانہ ہو جائیں تو شیوسر جھیل پر رات ہونے سے پیشتر پہنچ جائیں گے؟" میں نے ڈرائیور حسن سے پوچھا..

"کیوں نہیں پہنچیں گے.. ابھی ادھر سے نکلتے ہیں تو ایک دو گاؤں راستے میں آئیں گے.. پھر چھچھور پاس کی چڑھائی شروع ہو جائے گی اور ٹاپ پر جھیل آجائے گی.. اور پھر دیوسائی شروع ہو جائے گا"

ایک جیپ تو مکمل تھی.. لیکن دوسری جیپ کا پچھلا حصہ ڈھکا ہوا نہیں تھا..

"سر جی.. رات کے وقت کھلی جیپ میں دیوسائی پر سفر کریں گے تو قلفی ہو جائیں گے.." خالد نے فریاد کی "ہم نے اپنے سامان میں کوئی سویٹر، کوئی جراب یا جیکٹ نہیں چھوڑی جو زیب تن نہ کر لی ہو اور اس کے باوجود ابھی سے سردی ہڈیوں میں رچ رہی ہے.. اوپر جا کر اور رات کے وقت کیا حال ہو گا.. آپ تو مزے سے اگلی نشست پر براجمان ہو جائیں گے اپنی لیڈری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے.."

"تو پھر یہی ہو سکتا ہے کہ رات ادھر ٹھہر جائیں اور کل صبح سفر کے لیے نکلیں"

"نہیں نہیں جناب.. نہ جی نہ.." ہر طرف کہرام مچ گیا "ابھی نکلنا ہے.. بے شک دیوسائی کی رات میں ہم برف ہو جائیں، پرواہ نہیں، سکردو پہنچ کر پگھل جائیں گے.. اور وہاں کے تو موٹل ہو گا.. ائیرپورٹ ہو گا جہاں سے ایک جہاز شُوں کر کے ہمیں اسلام آباد لے جائے گا اور پھر ہمارے بینک.. ہماری یونیورسٹی.. ہماری بیگم.." یہ ایک مشترکہ اعلامیہ تھا..

خالد ندیم نے ایک شیخ ہونے کے ناطے اس پرابلم پر ذرا غور کیا اور پھر ایک دکان سے چند میٹر پالی تھین خرید لایا.. اسے نہایت چابکدستی سے جیپ کے پچھلے حصے پر باندھ کر تان دیا گیا اور ایک عارضی بندوبست ہو گیا، بارش اور سردی سے بچنے کے لیے.. بلکہ یہ ایک باقاعدہ چھت کی نسبت زیادہ سردی پروف تھا..

ہماری جیپیں چلم چوکی کی یاسیت بھری آب و ہوا میں سے نکل کر بلند ہوئیں تو کسی کو بھی قلق نہ ہوا.. اس بستی کو چھوڑتے ہوئے کوئی بھی آزردہ نہ ہوا..

"جھیل شیوسر.. وہاں تھی یا نہیں تھی"

چلم چوکی کی آخری چھت گزری تو ایک قبرستان دکھائی دیا.. چند پتھر.. دو تین کتبے اور ایک سہمی ہوئی سوگوار ویرانی... اگرچہ ہمیشہ کے لیے سرد ہو جانے والے اور کیڑوں کی خوراک بننے والے بدن کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ایک تاج محل کے نیچے دفن ہے یا چلم چوکی کے قبرستان میں ہے صرف جو پیچھے رہ جاتے ہیں انہیں فرق پڑتا ہے..

اگر کوئی دریائے شین میں.. یا ورگوتھ گلیشیر کی ندیوں میں گر کر اس کائناتِ آب کا ایک ذرّہ بن جاتا ہے اور بہہ جاتا ہے تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اس کے پیاروں کو فرق پڑ جاتا ہے کہ وہ بہتے ہوئے پانیوں پر اس کے لیے دیئے کیسے جلائیں..

جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے قبرستان اتنے آرگنائزڈ اور صاف ستھرے ہیں کہ لوگ شام کی سیر کے لیے ان کے باغیچوں میں آ نکلتے ہیں.. لیکن ان کی فوجی تنظیم ایسی ہے کہ شک ہوتا ہے کہ ہر صبح مُردہ اٹھ کر سیلوٹ مارتا ہے اور کہتا ہے "حاضر جناب.." اور پھر غڑاپ سے اپنی قبر میں چلا جاتا ہے.. اور اس دوران وہ پھول اور تحفے بھی دیکھ لیتا ہے جو پچھلی شام اس کے دوست اور رشتے دار قبر پر رکھ کر گئے ہیں..

ویسے غرقِ دریا ہونے والے بھی عجب لوگ ہوتے ہیں، نہ کہیں جنازہ اٹھتا

ہے اور نہ کہیں مزار ہوتا ہے.. کوہ نورد ہی ہوتے ہوں گے..

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے.. اگرچہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی... کہ وہ دفن ہو تو اپنی مرضی کی جگہ پر دفن ہو..

لوگ حج کے دوران فوت ہو جاتے ہیں تو بھی ان کی آخری خواہش یہی ہوتی ہے کہ ہمیں اپنے کلر زدہ گاؤں کے کنارے پر جو بے آباد بیریوں اور کانٹے دار جھاڑیوں سے اٹا قبرستان ہے اور جس میں چھپکلیاں اور کرلے رینگتے ہیں، وہاں دفن کیا جائے..

میرے اباجی کے ایک دوست فیروز تارڑ جو کبھی کچھ ہو جاتے تھے اور کبھی کچھ... کبھی عیسائی ہو جاتے تھے اور کبھی مسلمان اور کبھی درمیان میں قیام کر لیتے تھے جب اپنی اولاد کے بے حد اصرار پر امریکہ گئے اور اولاد کا اصرار صرف مالی نکتۂ نگاہ کی وجہ سے تھا کہ اگر ہر برس بوڑھے باپ کو دیکھنے کے لیے امریکہ سے لاہور آنا پڑتا ہے اور سب کو آنا پڑتا ہے تو اگر باپ کو ادھر درآمد کر لیا جائے تو بہتر سودہ ہے.. تو وہ اس شرط پر گئے تھے کہ بیٹا جان اگر میں امریکہ میں مر جاؤں تو تم نے مجھے وہاں سے واپس لا کر میرے آبائی گاؤں مانو چک میں دفن کرنا ہے.. اولاد کا خیال تھا کہ ابھی بابا قائم ہے بہت جیئے گا اس لیے وعدہ کر لیا.. لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اُدھر فیروز تارڑ امریکہ گئے اور چند دنوں میں ٹھنڈے ہو کر مالک حقیقی سے جا ملے.. کم از کم قیاس یہی ہے کہ مالک حقیقی سے جا ملے ورنہ جیسی ان کی طبیعت تھی پتہ نہیں کسی کو ملے بھی یا نہیں ملے.. تو بیٹوں نے مجبوراً ایک زرکثیر صرف کیا اور ان کے جاٹ اور تارڑ ہونے کے تفاخر سے اکڑی ہوئی سفید مونچھوں سمیت ان کی لاش مانو چک لے کر آ گئے.. یہاں پر مولوی صاحبان نے بہت دنگا کیا کہ ہم ایک ایسے شخص کو اپنے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہیں دیں گے جس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ وہ کیا تھا.. اس پر ان کی برادری والوں نے مولوی حضرات کی خدمت میں گزارش کی کہ یہ شخص ہم میں سے تھا.. جو بھی تھا یہیں

دفن ہو گا اگر آپ نے مداخلت کی تو ہم روزانہ کی گُلّی اور جمعرات کا حلوہ کینسل کر دیں گے.. یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور فیروز تارڑ کو اپنے کوئے یار میں دو گز زمین مل گئی..

اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ بعد از مرگ کہاں خاک اندر ہونا پسند فرمائیں گے.. تو اِس پسند میں چلم چوکی تو ہرگز شامل نہیں ہو گی..

جیپیں چوکی سے نکل کر کسی روڈ پر رواں تھیں.. اور یہ صرف نام کی روڈ تھی..

اور روشنی گھٹتی جاتی تھی اور سردی بڑھتی جاتی تھی..

دائیں ہاتھ پر... ایک بلند چٹانی آماجگاہ میں پناہ لیے ہوئے شرکل نام کا گاؤں دکھائی دیا.. اور یہ بھی ویران لگ رہا تھا..

جیپ کے ٹائروں تلے صرف بڑے بڑے پتھر تھے اور ان پر وہ ایک شوخ مینڈکی کی طرح اچھلتی جا رہی تھی.. اور اس کے اچھلنے سے کلیجہ حلق میں آتا تھا اور جوڑ جوڑ الگ ہوتا تھا اور دُکھتا تھا اور سر چھت سے ٹکراتا تھا.. یہ کیفیت مسلسل تھی اور ہم دیوسائی کے ہموار میدانوں کے عادی عجیب اذیت بھری صورت حال میں گرفتار ہی گرفتار تھے.. لیکن اس آفت کے باوجود حیرت ہے کہ جیپ کے پچھلے حصے سے گانوں کی اور بلند قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں.. یوں لگتا تھا کہ وہاں ایک بہت وحشی قسم کی پارٹی ہو رہی ہے.. لوگ رقص کر رہے ہیں.. شور مچا رہے ہیں اور شائد کچھ خواتین بھی ہیں جو چیخیں مار رہی ہیں اور خوب ہلّا گلّا ہو رہا ہے..

میرے برابر میں اگلی نشست پر گلتری کا ایک ریڈیو مکینک مصطفےٰ سکردو سے چند ریڈیو اور پُرزے وغیرہ خریدنے جا رہا تھا اور بھلا آدمی تھا..

جیپ کے پچھلے حصے میں پارٹی جاری تھی اور رقص و نغمہ کی صدائیں مزید بلند ہو رہی تھیں..

ایک موڑ پر جیپ رکی تو میں اتر کر پیچھے چلا گیا "اے نانہجار ساتھیو.. تمہارا

لیڈر.. تنہا اور بے سروساماں اور ہچکولے کھاتا ہوا فرنٹ سیٹ پر سفر کرتا ہے اور تم یہاں عیاشیاں کر رہے ہو"

"آ جاؤ جی.." کسی نے کہا اور مجھے اوپر کھینچ لیا.. اور میں رُک سیکوں اور نیلے ڈرموں پر منہ کے بل جا گرا.. جیپ پھر حرکت میں آ گئی.. اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا تو ایک جنت میں بیٹھا تھا.. یہاں تو حالات نہایت دگرگوں تھے.. اگرچہ یہاں موسیقی کا دور دورہ تھا.. ٹیپ ریکارڈر سے "میں جاناں جوگی دے نال" اور "ساہنوں نہر والے پُل تے بلا کے" وغیرہ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں لیکن جیپ جونہی حرکت میں آئی ہے تو اس کے جھٹکے اور ہچکولے مجھے یوں جھٹکنے لگے کہ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز... رُک سیک، ڈرم اور میرے ساتھیوں کی ٹانگیں اور میں سبھی ایک ہوئے، راڈ کو تھامے ہوئے میں ان پر اچھلتا جاتا تھا ایک شوخ مینڈک کی طرح نہیں بلکہ ایک بجھے دل والے موٹے مینڈک کی طرح.. اور راڈ بھی بار بار دامانِ یار کی طرح ہاتھ سے چھوٹا جاتا تھا.. میں بمشکل اپنے چہرے کو پچکنے سے بچا رہا تھا.. حالت غیر ہو گئی تھی.. یہ میں تھا اور میرے ساتھی.. آباد اور شاد تھے، قہقہے لگا رہے تھے اور مزے کر رہے تھے کیونکہ وہ سامان میں سیٹل ہو چکے تھے اور ان کے بدن ان جھٹکوں کو سہار سکتے تھے.. اور جب میری حالت حالتِ زار بلکہ زار زار ہو گئی تو میں نے دوہائی دے کر جیپ رُکوائی اور واپس اگلی نشست پر جا کر بیٹھ گیا... اس غلام کی طرح جو پانی میں چند ڈبکیاں کھانے کے بعد کشتی میں بیٹھے رہنے کی عافیت سے آگاہ ہو گیا تھا اور اب بندہ بن کر چپ بیٹھا تھا..

میری اس بے آبرو رخصتی پر میرے ساتھیوں کے قہقہے اور موسیقی مزید بلند ہو گئے.. اب وہاں سے "دیکھ لیا میں نے الفت کا تماشہ دیکھ لیا.." کی صدا آ رہی تھی..

تاریکی بڑھ رہی تھی...

"شیوسر جھیل کتنی دور ہے؟" میں نے حسن سے پوچھا..

"یہ چھچھور ٹاپ کی چڑھائی ہے.. یہ ختم ہو گی تو ہم دیوسائی میں داخل ہوں گے.. اور جھیل نظر آ جائے گی.."

"رات ہو رہی ہے.. تو کیسے نظر آئے گی؟"

"ہاں.. شائد نظر نہیں آئے گی.."

میں خاموش ہو گیا.. اور کیا کر سکتا تھا.. میں دیوسائی کی سب سے بڑی کشش کو نہیں دیکھ پاؤں گا..

شیوسر کا خواب بھی تاریکی میں اتر رہا تھا.. لیکن میں کیا کر سکتا تھا..

شیوسر تو نہ آئی البتہ یکدم تاریکی اتنی گھنی اتری کہ حسن نے جیپ کی ہیڈ لائٹس آن کر دیں..

ہمارے پیچھے آنے والی جیپ لڑھکتی ہوئی، پتھروں سے ٹکراتی.. چلی آتی تھی.. اس کی لائٹس بھی روشن ہو گئیں اور اب جیپ غائب ہو گئی اور اندھیرے میں اچھلتی دو روشنیاں ہمارے پیچھے پیچھے چلی آتی تھیں..

سفر کا اختتام ہی نہ ہوتا تھا..

دھچکوں اور ہڈی ہڈی الگ کرنے کا جو اعلیٰ انتظام تھا اس کا خاتمہ ہی نہ ہوتا تھا.. پھر کوئی ایک وقت آیا، کوئی ایک لمحہ کہیں آسمانوں سے اُترا اور جیپ کے ٹائر جیسے سکون میں چلے گئے، خاموشی سے ایک ہموار سطح پر چلنے لگے..

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آس پاس کی تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم کہاں ہیں..

جیپ تھم گئی..

"صاحب جھیل آ گیا ہے"

"کہاں ہے؟"

"اِدھر دائیں جانب پھیلا ہوا ہے لیکن.. نظر نہیں آتا.."

"نہیں.." اُدھر دائیں جانب جو اندھیرے کی ایک وسعت تھی اس میں میری آنکھوں نے بہت سفر کیا لیکن کچھ سجھائی نہ دیا.. آنکھیں جھپکنے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کھلی ہیں... شائبہ ہوتا تھا کہ وہ بند ہیں تبھی کچھ دکھائی نہیں دیتا.. گھٹاٹوپ اندھیرا تھا.. جھیل پر اگر صدپارہ کا کوئی ایک جگنو آ نکلتا تو بھی اس کی روشنی میں کچھ تو نظر آجاتا.. تاریکی میں گم آنکھیں دیکھتے دیکھتے تھک گئیں..

جیپ کا انجن چل رہا تھا اور ہیڈ لائٹس کچے راستے پر دور تک جاتی تھیں اور روشنی میں ایک لرزش تھی جو انجن کی گھرر گھرر سے ہم آہنگ تھی..

میں نے ایک مرتبہ پھر دیکھنے کی کوشش کی.. شائد وہاں کچھ بھی نہ تھا.. اگر ہوتا تو کچھ تو دکھائی دیتا..

"ہیڈ لائٹس آف کر دو" میں نے حسن سے کہا..

اس نے سوئچ آف کیا تو تاریکی گویا ایک انبار کی صورت ہم پر گری اور ہمیں دفن کر دیا..

"انجن بھی بند کر دو"

اس نے سوئچ گھما کر جیپ کو خاموش کر دیا.. تو خاموشی بھی اتنی وسیع ہوئی کہ ہمیں اپنی چپ میں لپیٹ لیا..

میں نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور ٹٹولتا ہوا جیپ سے اتر گیا..

"صاحب احتیاط کرو.. کنارے تک نہ جانا.. بہت خطرناک اور گہرا پانی ہے.. ادھر تو جہاز ڈوبتا ہے"

باہر سردی ٹھہری ہوئی تھی... ایک چپ تھی اور تاریکی تھی.. میں نے پھر آنکھیں جھپکیں..

پھر جیسے راکھ جلنے سے پہلے آتش دان کے کوئلوں میں ایک بے نام سی لَو ہوتی ہے.. جیسے ایک محبوب چہرہ تاریک کمرے میں بھی اپنے خدوخال کے شائبے دکھلاتا

ہے.. ایسے دیوسائی کا آسمان نیچے آتا گیا اور اس پر جو ستارے ابھی ابھی ظاہر ہوئے تھے ان کی بے نام لَو میں مجھے جھیل شیوسر کے شائبے سے نظر آئے.. وہ میرے تخیل میں تھے یا دکھائی دیتے تھے اس کا پتہ نہیں چلتا تھا..

وہ وہاں تھے.. یا نہیں.. میں نہیں جانتا..

میں اپنی چشم تصور میں ان تمام تصویروں کو لایا جو میں نے آج تک اس جھیل کی دیکھی تھیں.. چنگیز سلطان کی اس تصویر کو تخیل میں لایا جو اس نے گلگت پرواز کے دوران شیوسر کی کھینچی تھی اور اس میں اس جھیل کے پانیوں میں جہاں جہاں گہرائی تھی وہاں سیاہی تھی اور جہاں پانی کم تھے وہاں نسبتاً سفیدی تھی اور اس سیاہی اور سفیدی کا کوئی ایسا امتزاج تھا کہ جھیل پر "اللہ" کا حرف ابھرتا دکھائی دیتا تھا.. لیکن اسے دیکھنے کے لیے عقیدہ درکار تھا.. کیا پتہ اُسی تصویر میں ایک یہودی کو موسٰے کے احکام نظر آئیں.. ایک عیسائی ایک صلیب دیکھے.. ایک ہندو کو اوم لکھا نظر آئے اور ایک بدھ کو ایک کنول کھلتا نظر آئے.. اور پھر شیوسر کی ایک اور تصویر بھی تھی.. یہ ایک شخص کے ذہن میں تھی اور فنا ہو چکی تھی لیکن وہ مجھ تک منتقل ہو چکی تھی.. گلگت سے اسلام آباد جانے والے فوکر طیارے کے لاپتہ ہو جانے سے پیشتر...

کیپٹن زبیر جو اس طیارے کو چلا رہے تھے اور اسی کے ساتھ آج تک گم ہیں انہوں نے ایک مرتبہ دیوسائی پر پرواز کرتے ہوئے جھیل شیوسر کو کسی ایسے زاویے سے دیکھا تھا کہ سورج کی روشنی کی وجہ سے یوں لگتا تھا.. کرنیں کسی ایسے زاویے سے اس پر اترتی تھیں کہ.. اس کے پانی دکھائی نہ دیتے تھے.. صرف ایک بڑا خالی پیالہ دکھائی دیتا تھا.. جیسے آتش فشاں پہاڑ کا گڑھا ہوتا ہے.. یہ منظر ایک لمحے کے لیے تھا اور پھر جھیل کے خالی پیالے میں پانی بھر گئے تھے.. لیکن مجھے تو شائبوں کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا..

جیپ کا انجن خاموش تھا.. لائٹس آف تھیں اور میں ذرا دو چار قدم آگے ہو کر کھڑا تھا اور پھر بھی مجھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا.. سوائے ایک ہلکے سے شائبے کے..

ستاروں کی لَو میں.. شائد پانی تھے.. فریب تھے.. کوئی سیاہ سیّال تھا.. کوئی آہستہ آہستہ حرکت کرتا واہمہ تھا.. کچھ تھا.. شائد موت کے بعد کا منظر تھا جب کچھ دکھائی نہیں دیتا.. یاد دیتا ہے.. لیکن.. اس کے باوجود.. وہ وہاں تھی.. میں نے اس کی موجودگی محسوس کر لی تھی... جیسے ایک بدن ہو جو اندھیرے میں میری چاہت میں گیلا اور مہک آور ہوتا ہو اور میں اسے دیکھ نہ سکنے کے باوجود اس کی موجودگی کو محسوس کرتا ہوں اسے سونگھ سکتا ہوں.. وہ وہاں تھی..

جیپوں کے ڈرائیور بے چین ہو رہے تھے کہ یہ شخص اندھیرے میں کھڑا کیا دیکھتا ہے.. کچھ نظر نہیں آ رہا تو کیا دیکھتا ہے..

اور میں اپنی حیاتی کے آئندہ دنوں کو دیکھتا تھا.. ان راتوں کو دیکھتا تھا جب میں اپنی سٹڈی میں قید اس لمحے کو واپس لانے کی سعی کروں گا جب میں دیوسائی کی رات میں جھیل شیوسر کے کنارے کچھ نہ دیکھتا تھا...

ویسے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ایک جھیل کو صرف دن کی روشنی میں... ننگی آنکھوں سے ہی دیکھا جائے..

یہ ہرگز ضروری نہیں..

جھیلیں اور عورتیں ہوتی ہی اس لیے ہیں کہ ان کے تاریک فریب میں مبتلا ہو کر انہیں دیکھا نہ جائے.. صرف محسوس کیا جائے..

میں بھی جھیل شیوسر کے تاریک دھوکے میں جکڑا ہوا وہاں کھڑا تھا.. اسے دیکھتا نہ تھا.. صرف محسوس کرتا تھا کہ.. وہ وہاں ہے..

میں نے اپنی حیاتی میں جن جھیلوں تک رسائی حاصل کی تھی.. ان سب کو میں نے دن کی روشنی میں یا دھند آلود دوپہروں اور شاموں میں دیکھا تھا.. اور کبھی ان کے پانیوں میں اترا تھا..

لیکن.. شیوسر واحد جھیل تھی.. جسے دیوسائی کی شب میں.. نہ دیکھتا تھا.. اور

پھر بھی محسوس کرتا تھا.. گویا دیکھتا ہی تھا..

ایک شبِ دیجور میں.. شدید سردی کی جماؤ میں.. شیوسر جھیل کے تاریک کناروں پر رکی ہوئی.. دو جیپیں..

کون جانتا ہے کہ اس شبِ دیجور... جن کناروں پر ہماری جیپیں ساکت ہوئی تھیں اور ان کی ہیڈ لائٹس گل ہوئی تھیں وہ کنارے شیوسر کے تھے..

یہ عین ممکن تھا کہ ہم کہیں بھی رک گئے ہوں... تاریکی میں کیا پتہ چلتا ہے کہ کہاں رکے ہیں.. اور حسن نے صرف میری تسلی کے لیے کہہ دیا ہو کہ... صاحب شیوسر جھیل!

اس لیے کہ نہ ہم دیکھ سکتے تھے کہ ہم کہاں ہیں.. نہ ہمیں شائبوں کے سوا کچھ دکھائی دیتا تھا..

صرف ہماری خواہش تھی اور تصور تھا... کہ ہم جھیل شیوسر پر ہوں..

میں اندھیرے میں کھڑا.. حسن کی وارننگ کو ملحوظ خاطر رکھتا ہوا کنارے کے قریب نہ گیا.. ایک ہی مقام پر کھڑا.... شیوسر کو "دیکھتا" رہا..

"دیوسائی کی دیومالائی رات میں سفر..ایک ریچھ کے لیے..ایک بادل..ایک پُھول کے لیے"

ایک ناگوار سا شور ہوا..

جیپ کا ہارن.. ہر شے کو.. تاریکی کو.. خاموشی کو.. اور میرے تصور کو مجروح کرتا ہوا اس تنہائی اور رات میں گونجا..

"صاحب.. اب چلے گا.. نہیں تو صبح تک سکردو نہیں پہنچے گا" حسن کی آواز آئی..

میرے ساتھی چند لمحوں کے لیے جیپوں سے باہر آئے تھے اور پھر مایوس ہو کر واپس جا چکے تھے..

"ادھر خیمہ لگائے گا.." میں نے ہنس کر کہا..

"ہاں پھر کبھی لگائے گا.." حسن نے مجھے پکارا "لیکن ابھی دیوسائی کراس کرے گا"

میں احتیاط سے قدم اٹھاتا واپس آیا اور جیپ میں بیٹھ گیا... گلتری کا ریڈیو مکینک اونگھ رہا تھا.. میں اس کے کنارے سے.. اور جس کے کنارے مجھے دکھائی نہ دیتے تھے.. اور جس کے بارے میں یہ بھی طے نہ تھا کہ وہ وہاں ہے بھی یا نہیں ہے.. میں

واپس آیا اور جیپ میں سوار ہو گیا.. جیپ کی ہیڈلائٹس روشن ہوئیں اور وہ ایک دھچکے سے حرکت میں آ گئی..

میں اب بھی اس کی جانب دیکھتا جاتا تھا.. بند آنکھوں کے سامنے جو تاریکی ہوتی ہے اس تاریکی کو دیکھتا جاتا تھا.. اور روانگی کے اس ایک دھچکے کے ساتھ جیسے تاریکی کے ٹانکے کھل گئے اور وہاں روشنی ہو گئی.. شیوسر جھیل کی جتنی تصویریں میں نے دیکھی تھیں وہ عیاں ہو گئیں.. تاریکی کے پردے چاک ہو گئے اور دن کی روشنی ہو گئی اور وہ جھیل پیالہ میرے سامنے ظاہر ہو گیا.. ایک عشق پیالہ میرے سامنے ظاہر ہوا اور میں نے اسے جی بھر کے پیا.. جی بھر کے پینے کے باوجود میری پیاس بجھتی نہ تھی.. میں اُسے لبوں سے ہٹاتا تھا تو پھر پیاسا ہو جاتا تھا....

جیپ... دیوسائی کے میدانوں کی سیاہ رات میں اندر تک گئی.. اس کی ہیڈلائٹس ایک کچے راستے کی اونچ نیچ کو کبھی دکھاتی تھیں اور کبھی چھپاتی تھیں..

سردی کی شدت بیان میں نہ آ سکتی تھی..

یہ دیوسائی کی رات تھی..

جیپ کے آہنی وجود میں بھی جیسے سردی کا کرنٹ آ چکا تھا..

اور اس کے باوجود جیپ کے پچھلے حصے میں پارٹی جاری تھی اور ہلّا گلّا ہو رہا تھا..

تھکاوٹ نے مجھے نڈھال کر دیا..

ہم ایک عرصے سے سفر میں تھے..

رات گہری ہوتی گئی...

اور ہم دیوسائی کے اندر سفر کرتے گئے.. آگے پیچھے اس کی ویران رات میں سفر کرتے گئے.. ٹھٹھرتے ہوئے.. بھوکے بدنوں کے ساتھ.. صرف ایک پیالی چائے اور چند "پاکوروں" کے ساتھ!

ہمیں مرتضٰے چوکی بہت یاد آئی.. جہاں اگرچہ ایک گمشدہ احساس تھا.. ایک گھوسٹ ٹاؤن میں شائد کبھی نہ آنے والی سٹیج کوچ کا انتظار تھا.. لیکن وہاں چھوٹے دیوسائی کے کناروں پر ایک چھت تھی.. ایک تاریک باورچی خانہ تھا جس میں سٹوو کی بھرائی ہوئی آواز اور توے پر کڑکتے آلو اور دال کے پراٹھے تھے.. اور محمد حسین کی انسانیت تھی..

اور وہ ایک مچھلی بھی تھی... جو ہماری ادا کا شکار ہو کر جان سے گئی تھی..

وقت کا احساس معدوم ہو گیا..

دیوسائی کے میدانوں میں.. سوئے ہوئے ریچھوں اور سنہری عقابوں کے آسمانوں میں.. اس رات میں ہم مسلسل سفر کرتے تھے اور سرد منجمد کر دینے والی.. لیکن ٹھہری ہوئی ہوائیں ہماری جیپ سے ٹکرا کر واپس جاتی تھیں.. شُوکتی ہوئی.. اور دیوسائی پر پھیل کر تاریکی کا ایک حصہ بن جاتی تھیں..

میں نے محسوس کیا کہ جیپ نیچے اتر رہی ہے..

آس پاس اندھیرے کے جہان کے سوا اور کچھ نہ تھا اور صرف ہیڈ لائٹس تھیں جو دیوسائی روڈ کو نیم روشن کرتی تھیں.. اور جب ان کی روشنی گرتی تھی تو پتہ چلتا تھا کہ جیپ نیچے اتر رہی ہے..

اور پھر ہیڈ لائٹس کچے راستے کی بجائے پانیوں کے بہاؤ پر تیرنے لگیں..

یہ کالے پانی تھے..

ہم وہ ذیلی سڑک پیچھے چھوڑ آئے تھے.. تاریکی میں دیوسائی روڈ میں الگ ہو کر گلتری اور مرتضٰے چوکی جانے والی سڑک کو دیکھ نہیں سکے تھے.. اور کالا پانی آ گئے تھے..

اس الگ راستے پر.. ہم نے بگ بوائے آف کالا پانی کو بہت تلاش کیا تھا.. وہ کہیں لڑھکتا ہوا دکھائی دے جاتا تو ہماری قسمت بدل جاتی.. لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت..

جیپ کالا پانی کے نالے میں اتری تو اس کے پائپ سے سفید دھواں اٹھتا تھا.. اور ہیڈ لائٹس میں ایک بہاؤ بہتا تھا اور پانیوں کی تہہ میں جو کنکر اور سنگریزے تھے وہ روشن ہوتے تھے.. اور یہ ٹائروں کو گرفت میں لیتے تھے.. انجن کے پورے زور کے باوجود جیپ کو آگے نہ جانے دیتے تھے..

اور پھر اپنا پورا زور صرف کرتی جیپ اٹک کر رک گئی.. کالے پانی کے عین درمیان میں کھڑی ہو گئی.. اس نے بار بار بہت زور لگایا.. بہت آہ و زاری کی.. اس کے انجن نے اسے اپنی عزت نفس کا مسئلہ بنا لیا لیکن.. ندی کی تہہ میں جو پتھر تھے انہوں نے ٹائروں کو آگے نہ جانے دیا..

"حسن..." کالا پانی کا بہاؤ رات کا تاریکی میں بہت مہیب اور خوفناک لگتا تھا..

"فکر نہیں صاحب.. ہمارے پاس رسّہ ہے.. جیپ کو باہر نکالے گا"

پیچھے آنے والی جیپ کنارے پر رکی ہوئی تھی اور اُس کی لائٹس پانیوں کو روشن کرتی ہماری جیپ کے پچھلے حصے تک آتی تھیں جہاں حسن ہمارے سامان کو اتھل پتھل کر کے رسّہ تلاش کرتا تھا.. اتنی دیر میں پچھلی جیپ پانی میں اتر کر ہمارے برابر میں آ کھڑی ہوئی... حسن نے رسّہ تلاش کر لیا تھا.. اس نے اس کا ایک سرا جیپ کے بمپر سے باندھا اور دوسرا سرا برابر میں کھڑی جیپ کے پچھلے حصے سے گانٹھ دیا... اور یوں دوسری جیپ ہمیں کھینچتی ہوئی باہر نکال کر کنارے تک لے گئی...

سفر پھر شروع ہو گیا..

ایک تاریک اور سرد خلاء میں ہماری جیپیں چلی جاتی تھیں.. ان کی ہیڈ لائٹس ایسے اژدھے تھے جو اس ویرانے میں دھاڑتے پھرتے تھے..

جب ہم کالا پانی سے ادھر گلتری جانے والے سنگم سے گزرے تھے تو گویا ہمارا دیوسائی کا پھیرا مکمل ہو گیا تھا..

صرف دو جیپیں تھیں دنیا کے بلند ترین میدان کے بے انت اور تاریک پھیلاؤ میں..

میں اپنے پیچھے آنے والی جیپ کو تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جب کبھی وہ کسی بلندی سے اترتی.. کوئی موڑ مڑتی، چڑھائی پر آسمان کا رخ کرتی تو اس کی لائٹس کی روشنی میرے سامنے دیوسائی کے میدانوں پر کبھی دور تک جاتی، کبھی غائب ہو جاتی اور کبھی پورے دیوسائی پر پھیل جاتی.. اور جب وہ دیوسائی کے کسی ایک حصے کو منور کرتی تو یوں کرتی جیسے سٹیج پر کھڑے ایک اداکار کو سپاٹ لائٹ روشن کرتی ہے..

میں اپنی جیپ کی ونڈ شیلڈ کے پار دیکھتا چلا جاتا تھا.. گلتری کا ریڈیو مکینک نیند میں تھا۔ حسن نہایت اطمینان سے جیپ چلا رہا تھا اور پچھلے حصے میں جو پارٹی جاری تھی وہ اختتام کو پہنچ چکی تھی.. وہاں خاموشی تھی.. جیسے رات کی تاریکی میں فراٹے بھرتی ٹرین کے سب مسافر سو چکے ہوں اور صرف ایک شخص کھڑکی سے باہر دیکھتا چلا جا رہا ہو.. ایسے میں تھا..

ہماری جیپ کی ہیڈ لائٹس زیادہ تر کچے راستے کے خدوخال واضع کرتی تھیں اور بہت کم بھٹک کر کہیں اور جاتی تھیں، لیکن پچھلی جیپ کی ہیڈ لائٹس تو گویا ایک کھیل کھیل رہی تھیں.. دیوسائی کی رات میں کہیں کوئی ندی.. ایک تاریک اڑتا ہوا پرندہ.. خزاں کی موت میں گمشدہ پھول.. کوئی پتہ.. سنہری گھاس کے تنکے.. پل بھر کے لیے روشنی میں آکر فلیش سے کھینچی ہوئی ایک تصویر کی طرح واضح اور روشن ہو جاتے اور پھر دوسرے پل میں تاریکی میں مٹ جاتے..

دیوسائی کی اس سٹیج پر میں.. اور میرے ساتھی.. چند روز پیشتر نمودار ہوئے تھے..

اس سٹیج پر آنے سے پیشتر ٹاپ پر پہنچنے سے پہلے ہم نے بھورے رنگ کے عقابوں کا ایک جوڑا دیکھا تھا..

عجب رنگوں والا ایک بھنورا آزمنڈ کے بازو پر براجمان دیکھا تھا..

ہم نے برجی لاء کے دامن میں برفباری کی سفید تاریکی میں اوجھل ہوتی جھیل کے کنارے ایک رات منفی سترہ ڈگری سینٹی گریڈ کی سردی میں گزاری تھی اور ہم سانس لینے کے لیے ہانپتے تھے.. اور اگلی سویر ہم نے برجی لاء کی ٹاپ سے دنیا کا سب سے شاندار پہاڑی منظر دیکھا تھا.. شاہ گوری اور لیلےٰ او لیلےٰ کا دیدار کیا تھا..

اور وہ شب کہاں تھی جب ہم دیوسائی کی رات میں کھو گئے تھے.. سیاہ شاہیے ہمارا پیچھا کرتے تھے اور پھر عباس ایک لالٹین کی روشنی میں ہمارے لیے چائے اور بسکٹ لا رہا تھا..

شتونگ کی ندیاں.. بڑے پانی کی زرد گھاس.. رات کے بارہ بجے.. الاؤ اور کون ہے جو ہولے ہولے دستک دیتا ہے.. گھاس بھرے تین پیالے جن میں کہیں ریچھ خوابیدہ تھے..

چھوٹے دیوسائی کا سبحان اللہ منظر... مرتضےٰ چوکی.. ایک سنہری مچھلی کی موت.. برزل کے رنگ اور ایک مرتے ہوئے شخص کی فریادیں... یہ سب کچھ کب ہوا تھا.. شائد یہ میرا تخیل تھا..

دیوسائی کے میدانوں پر... رات کے سنّاٹے گھپ اندھیروں کی سرد جماؤ والی رات کے سنّاٹے میں.. پچھلی جیپ کی ہیڈ لائٹس.. ایک سرچ لائٹ کی طرح... جیسے جنگی قیدیوں کے ایک کیمپ کی رکھوالی کرنے والی سرچ لائٹ ہو.. بیرکوں اور خاردار تاروں پر ٹھہرتی انہیں برہنہ کرتی پھر آگے بڑھ جانے والی سرچ لائٹ ہو... ایسے پچھلی جیپ کی ہیڈ لائٹس تھیں جو دیوسائی پر کہیں ٹھہرتی تھیں اُسے برہنہ کرتی تھیں اور آگے بڑھ جاتی تھیں..

اس سفر کے دوران ایک ستارے نے مجھے بہت تنگ کیا..

جیپ کی بے آرام مسافت میں... تھکاوٹ میں.. جب کہ میرا بدن ٹوٹتا تھا

اور سر جھولتا تھا مسلسل ونڈ شیلڈ میں سے گھنی دیوسائی تاریکی میں مجھے ایک روشن ستارہ مسلسل دکھائی دیتا تھا..

اور اس کا مسلسل... ایک سیاہ آسمان میں مسلسل دکھائی دیتے جانا مجھے کیوں پریشان کرتا تھا. صرف اس لیے کہ وہاں اور بھی ستارے تھے، گنبد افلاک ان سے بھرا پڑا تھا.. اٹا پڑا تھا.. اتنا کہ ان میں سے کچھ گرتے تھے صرف اس لیے کہ وہ بھرا پڑا تھا اور وہاں ان کے لیے جگہ نہ تھی.. اتنا گھنا جمگھٹا تھا..

لیکن وہ ایک ستارا.. صرف اس لیے میری نگاہوں میں کھٹکتا تھا کہ وہ... گنبد افلاک پر نہ تھا... آسمان پر وہ نہ تھا.. نہ زمین پر تھا.. بلکہ ان دونوں کے بیچ، میری جیپ کے بہت نیچے کہیں گہرائیوں میں لَو دیتا تھا.. تنہا تھا..

کوئی ایک ستارا آسمان کے سوا آپ کی نظروں کے نیچے ایک گہرائی میں کیسے وجود میں آسکتا ہے.. کہاں سے آسکتا ہے.. لیکن وہ وہاں تھا.. ایک تاریک اور گہری وسعت میں اکیلا... ٹمٹماتا ہوا.. دیوسائی کے شہر بے چراغ میں ٹمٹماتا ہوا.. وہ میری نظروں کی سطح سے کہیں نیچے.. دمکتا تھا..

اس کا جواز یہی ہو سکتا تھا کہ ہم دیوسائی کے میدانوں میں تھے.. دنیا کے بلند ترین میدانوں کی ایک رات میں سفر کرتے تھے اور یہاں جو آسمان جھکتا تھا وہ ہماری جیپ روڈ سے کہیں نیچے تک جاتا تھا.. دیوسائی کی گھاٹیوں کے قدموں تلے جاتا تھا اور وہیں وہ ایک ستارا تھا..

ہزاروں راستے ہیں، منزلیں ہیں...
سمندر اور صحرا بھی ہیں حائل...
مگر ہر ستارے کی شعائیں..
ہیں ہر رہرو کے سینے کی متاعیں...

ہر ایک کشتی سمجھتی ہے کہ تارا...
رواں ہے ساتھ اس کے بن کے رہبر...

تو میری کشتی... یہ جیپ تھی.. جو دیوسائی کے سمندر... صحرا... میں رواں تھی.. اور یہ ستارا... میرے سنگ سفر کرتا تھا..

مگر دونوں کا رہبر ہے وہ تارا... جو اک دن میرے حرفِ آرزو پر
تمہاری انگھڑیوں سے گر پڑا تھا... جبین وقت پر تاباں ہوا تھا..

اور میرے حرفِ آرزو کون سے ہیں.. چند تصویر بُتاں.... وادی رُوپل کے کھیت.. رتّی گلی کی جھیلیں.. ورڈز ورتھ کی قبر.. فلارنس اور مائیکل انجلو کی آرام گاہ... ثوریا کی ایک شام.. دم دمشق اندر.. ارض روم.. یا.. دریائے سین.... بلیک فارسٹ یا ماسکو کا سرخ چوک... روم سویٹ روم یا غرناطہ کے برج مینار...

صرف آرزو کا تو کوئی شمار نہیں..
آرزو کے نیلگوں نشان شاہ گوری کی برفوں پر..
جھیل کرومبر کے پانیوں میں.. گھنی اور گرم مہک والے پانیوں میں..
سنولیک پر..
اسی لیے صرف آرزو کا تو کوئی شمار نہ تھا..

ہمارے راستے کتنے الگ ہوں.... ہماری منزلیں کتنی جدا ہوں
مگر رہبر ستارا تو وہی ہے... امیدوں کا کنارا تو وہی ہے..

جیپ کی ہیڈ لائٹس آنکھیں جھکا کر نیچے دیکھنے لگیں.. جیپ نیچے اترتی جا رہی تھی.. شمش کٹ سے نیچے ان کی روشنیاں بڑے پانی کے پُل کو جگمگانے لگیں.. ایک دھچکا لگا اور وہ پانیوں پر پھیل گئیں.. ان میں مچھلیاں اچھلنے لگیں... دوسرے کنارے پر روشنی ہوئی اور زرد گھاس دمکنے لگی اور اس پر ہمارے خیموں کے سفید اور دبے ہوئے نشان تھے.. پرے ایک الاؤ کی راکھ تھی.. ہماری جیپ شمش کٹ سے نیچے اتر کر بڑے پانی کے پل پر آ گئی..

جیپ کے ٹائروں تلے نیم شکستہ تختے دبتے اور فریاد کرتے تھے.. اس کا بوجھ سہار نہ سکتے تھے لیکن سہارتے تھے.. ہم رات کی تاریکی میں ایک چور کی پوشیدگی کی طرح روپوش ہوتے... منہ چھپائے بڑے پانی سے گزرتے تھے.. کیونکہ نیم شکستہ تختوں کی فریاد بڑے پانیوں پر تیرتی جنگلی حیات کے کیمپ تک بھی جاتی تھی... جہاں چند سفید خیمے تھے جن میں رات کے اس پہر رفیق راج بھوت اور حلیم ہینڈسم خوابیدہ تھے.. اور ہم نے ان سے وعدہ کر رکھا تھا کہ منی مرگ سے واپسی پر ہم ادھر ٹھہریں گے اور دیوسائی کے پیالہ میدانوں میں بھورے ہمالیائی ریچھ کو لڑھکتے دیکھیں گے... اور آئندہ برسوں میں ان میں سے کوئی ایک ریچھ... سلجوق بیئر.. یا تارڑ ریچھ نام کا بھی ہو سکتا ہے... اور ہم یہ وعدہ پورا نہیں کر سکے تھے.. اور اسی لیے چپکے سے چوروں کی طرح.. منہ چھپائے ادھر سے گزرتے تھے....

جیپ اُس شب کی سیاہی میں بڑے پانی کے پل کے پار اُتری..

آگے چڑھائی تھی... اور اُس کے پار شتونگ کی ندیاں تھیں..

میں نے جیپ کی کھڑکی میں سے سر نکال کر پیچھے دیکھا.. بڑے پانی کو دیکھا..

اور وہاں.. تاریکی نہ تھی.. ایک انہونی جگمگاہٹ تھی..

بڑے پانی اور کناروں کی زرد گھاس دھوپ میں تھی..

وہاں روشنی تھی..

جیپوں کی ہیڈ لائٹس کا رخ شتونگ کی ندیوں کی جانب تھا اور ہمارے پیچھے صرف اندھیرا ہو سکتا تھا.. اور وہ نہ تھا.. بڑے پانی روشن تھے اور ان میں سے مچھلیاں اُچھلتی تھیں اور تہہ کے پتھر دکھائی دیتے تھے اور کوئی ایک سفید پرندہ تھا جو بہت دیر تک ندی کے اوپر معلق رہتا تھا اور پھر ایک پتھر کی طرح پانیوں میں گرتا تھا اور جب باہر آتا تھا تو اس کی چونچ میں ایک سنو کارپ مچھلی ہوتی تھی.. دیوسائی کی رات میں یہ کیسا سفر تھا کہ وہ کچھ دکھائی دیتا تھا جو وہاں نہ تھا.. اور دکھائی دیتا تھا..

میں ایک پُھول کے لیے یہاں آیا تھا..

ایک بادل کے لیے آیا تھا..

اور ایک ریچھ دیکھنے کے لیے یہاں تک پہنچا تھا..

اس لیے کہ کہیں سے یہ صدا آئی تھی کہ...

میں دیوسائی کا ایک ریچھ ہوں..

میں دیوسائی کا ایک پُھول ہوں..

میں دیوسائی کا ایک بادل ہوں..

میں دیوسائی کا بھورا ہمالیائی ریچھ ہوں اور میرا نام بگ بوائے ہے..

میں دیوسائی کا ایک پُھول ہوں اور جیسے میرے رنگ ان دیکھے ہیں ایسے میرے نام ان گنت ہیں..

میں دیوسائی کا وہ بادل ہوں جس کی شباہتیں عجیب طلسم ہیں... جھکتی ہیں تو اس میدان پر بچھ جاتی ہیں...

اور میں.. خود دیوسائی ہوں.. دنیا کا بلند ترین اور وسیع ترین خواب ہوں...

کیا ایک ریچھ کے لیے... ایک پھول کے لیے... صرف ایک بادل کے لیے..

گھر سے نکل کر دربدر ہونا جائز ہے؟...

ہاں... میں گواہی دیتا ہوں کہ.. جائز ہے.. نہ صرف جائز ہے بلکہ فرض ہے..

موت برحق ہے..

دیوسائی نہ دیکھنے والے بھی مرتے ہیں.. اور جو دیکھتے ہیں وہ بھی مرتے ہیں.. لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ان کے دمِ آخر میں سنہری عقاب اڑتے ہیں.. برجی لاء کی برفباری ہوتی ہے... شتونگ کی ندیوں کے مدھر گیت گونجتے ہیں.. بڑے پانی میں مچھلیاں اُچھلتی ہیں اور جھیل شیوسر کے واہمے ہوتے ہیں..

ایک پُھول.. ایک بادل.. اور ایک ریچھ..

بڑے پانی کے پُل کے پار اُتر کر جب ہم اونچائی پر ہوئے اور دیوسائی کی تاریک وسعت پھیلنے لگی تو پھر... گہرائی میں وہی ستارا نظر آیا..

دمکتا ہوا.. سیاہ آسمان کے نشیب میں.. میری نگاہ میں کہیں نیچے ایک گہرائی میں.. تنہا وہی ستارا نظر آیا..

مگر رہبر ستارا تو وہی ہے..
اُمیدوں کا کنارا تو وہی ہے..

دیوسائی.. اے دیوسائی..